بسم اللہ الرحمن الرحیم

سفیرِ انقلاب

تالیف

تسلیم رضا خان

العارف پبلی کیشنز

۵۔ مسلم ٹاؤن، لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ملنے کا پتہ:

۱) مکتبہ العارف ۵۔ مسلم ٹاؤن وحدت روڈ لاہور

۲) مکتبہ الرضا۔ ۸۔ بیسمنٹ میاں مارکیٹ اردو لاہور

۳) نشر ولایت ثقافتی مرکز، 2-A/1 مسلم ٹاؤن موڑ، وحدت روڈ لاہور

ناشر : العارف پبلی کیشنز لاہور

مطبع : عدن پرنٹرز، لاہور

تکنیکی معاون : البصیرہ ٹرسٹ۔ اسلام آباد
ہاؤس ۲۹۹، گلی ۷۶، جی نائن تھری اسلام آباد

سرورق : حیدر نقوی

اشاعت دوّم : فروری ۲۰۱۰

تعداد : ایک ہزار

قیمت : ایک سو پچاس (250) روپے

معاون : محمد علی ویلفیئر ایسوسی ایشن
www.drmanaqvi.com

انتساب

پاک وفاؤں کے نام

جن کا سفر حضرت اُبوطالبؑ

سے تقی حیدر تک جاری ہے

فہرست

عنوان	صفحہ
عرض ناشر	۷
پیش لفظ (دل یہ کہتا ہے تھا کہ فریاد لبوں تک پہنچے)	۹
سفیر انقلاب کا خاندانی پس منظر	۲۱
آغوش مادر سے آغوش مکتب تک	۲۶
آئی۔ایس۔او کا قیام اور سفیر انقلاب	۲۹
آئی۔ایس۔او کا رخت سفر اور سفیر انقلاب	۳۹
سفیر انقلاب کی مرکزی صدارت	۵۱
انقلاب اسلامی ایران اور سفیر انقلاب	۶۶
تحریک نفاذ فقہ جعفریہ اور سفیر انقلاب	۸۷
نشر و اشاعت	۱۰۱
آئی۔او سے اختلاف	۱۰۴
سانحہ کوئٹہ اور سفیر انقلاب	۱۱۰
قرآن وسنت کانفرنس اور سفیر انقلاب	۱۱۷
تحریک کا سیاسی سفر اور سفیر انقلاب	۱۳۰
فلاحی امور اور سفیر انقلاب	۱۳۹

سفیر انقلاب اور افراد سازی	۱۵۷
سفیر انقلاب اور سامراج	۱۸۸
سفیر انقلاب کی ذاتی زندگی	۲۱۵
سفیر انقلاب کے آخری ایام زندگی	۲۳۷
زندگی کا آخری سفر	۲۴۹
یہ کس کا لہو ہے کون مرا؟	۲۵۲
گزر تو جائے گی تیرے بغیر بھی لیکن۔۔۔!(سلمان نقوی کا پُر درد خطاب)	۲۶۰
سلام تجھ پر! کہ تو نے وفا کی لاج رکھی۔(شہید وفا کے بارے میں)	۲۶۶
شہادت کیا ہے اور شہید کا رتبہ کیا ہے؟	۲۷۱
وصیت نامہ	۲۸۱
ابدی حیات کی خوشبو	۲۸۲
ایک گذارش۔ایک اپیل	۲۸۵

☆☆☆☆☆

عرض ناشر

ہمیں یہ عرض کرتے ہوئے مسرت نصیب ہورہی ہے کہ ہم قائد ملت اسلامیہ شہید مظلوم حضرت علامہ سید عارف حسین الحسینی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ کی ذات اقدس، حیات طیبہ اوران کے مقدمہ قتل پر مبنی کتاب ''سفیر نور'' پیش کرنے کے بعد مجاہد اسلام، شہید وطن اور محسن ملت ڈاکٹر محمد علی نقوی کی مجاہدانہ جدوجہد پر مشتمل کتاب ''سفیر انقلاب'' آپ کی خدمت میں پیش کررہے ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ ''سفیر نور'' جتنے افراد نے پڑھی ہے اتنے افراد نے خریدی نہیں ہے۔ اگر ہر پڑھنے والا ذاتی کتاب خرید کر اس کا مطالعہ کرتا تو نہ صرف اس کے گھر میں یہ اثاثہ بطور ملکیت رہتا بلکہ ہمارا ادارہ اس کے دس ایڈیشنز شائع کر کے خسارہ پورا کر چکا ہوتا اور مزید کتب پیش کرنے میں تاخیر نہ کرتا۔

آپ کے علم میں ہونا چاہیے کہ ہم نے ''سفیر نور'' آدھی قیمت پر آپ کی خدمت میں پیش کی تھی تاکہ پیغام کی راہ میں کسی ہم خیال رفیق کے مالی مسائل رکاوٹ نہ بنیں اور یہی صورت حال ''سفیر انقلاب'' کی ہے۔

قارئین محترم! یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ ہم آپ سے کاغذ اور طباعت کی پوری قیمت بھی وصول نہیں کرتے ''العارف پبلیکیشنز لاہور'' خالصتاً ایک نظریاتی اور فکری ادارہ ہے جو آپ کی دہلیز تک ایسی ہی کتب اور لٹریچر پہنچانے کا عزم رکھتا ہے۔ ہمارا منافع آپ سے رابطہ، نئی نسل کے شعور کی بیداری اور آپ کی دعائیں ہیں۔

آپ سے استدعا کی جاتی ہے کہ آپ دوسروں سے کتب لیکر پڑھنے کی بجائے ذاتی طور پر یہ کتب خریدیں۔ اپنی لائبریری میں رکھیں، اپنی نسلوں کے لئے بطور تحفہ چھوڑ جائیں اور ادارہ کے ہاتھ مضبوط کریں تاکہ ہمارے اور آپ کے درمیان مالی مسائل دیوار نہ بنیں اور ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہے۔ اگر آپ نے تعاون فرمایا تو ان شاء اللہ ہم اگلے مرحلے میں بہت جلد ''برصغیر میں شیعیت کا کردار'' کے عنوان سے ایک تاریخی دستاویز پیش کرنے کی سعادت حاصل کریں گے۔ مگر اس میں آپ کی دعائیں اور تعاون شرط ہے۔ خدا آپ کی توفیقات میں اضافہ فرمائے۔

آمین

العارف پبلیکیشنز
۵۔ مسلم ٹاؤن وحدت روڈ، لاہور
فون: 042-35834689
بتعاون: محمد علی ویلفیئر ایسوسی ایشن
(MAWA)

دل یہ کہتا تھا کہ فریادلبوں تک پہنچے

دستورزمانہ ہے کہ مصنف یا مولف اپنی کتابوں کے ''پیش لفظ یا دیباچے'' بڑی بڑی نامور شخصیات سے لکھوا کر کتاب کے چہرے کا بناؤ سنگھار کرتے ہیں مگر میں اس سے اختلاف کرتا ہوں۔ میرا عقیدہ ہے کہ اپنے دل کا ''درد'' کوئی اور بیان نہیں کرسکتا اگر بیان کر بھی دے تو مصنوعی یا خیراتی لفظوں میں اثر نہیں ہوتا اور جس میں اثر نہیں ہوتا وہ بات کبھی دل میں نہیں اترتی۔ چنانچہ میرا ''پیش لفظ'' ایک ''فریاد'' ہے اسے ''فریاد'' کے لہجہ میں سنا جائے۔

۷ مارچ ۹۵ء بمطابق ۵ شوال ۱۴۱۵ کو صبح تقریباً ۹ بجے کا وقت تھا دفتر کے فون کی گھنٹی بجی میں نے ریسیور اٹھایا۔۔۔علیک سلیک کے بعد برادر سید ابوالحسن نقوی کی آواز بھرا گئی اورانھوں نے بڑی دقت سے کہا ''ڈاکٹر صاحب شہید کر دیے گئے''۔۔۔ وہ کیسے۔۔۔۔؟ میں نے بے ساختہ پوچھا۔۔۔انھوں نے رک رک کے اپنے جملے مکمل کیے کہ صبح پونے آٹھ بجے ''چوک یتیم خانہ'' پر چند دہشت گردوں نے آپ کو محافظ سمیت اس وقت شہید کر دیا جب آپ ہسپتال جارہے تھے۔''

مختصر سی بات ختم ہوئی تو طویل صدمہ شروع ہوگیا۔ بات کانوں سے داخل ہوکر دل میں نشتر کی طرح اتری اور ۱۵ اگست ۱۹۸۸ کے گہرے زخم کو ہرا کر گئی۔۔۔ وقفہ وقفہ سے کئی فون اور دوست ملنے آئے، جو مجھ سے چھوٹے تھے انھیں میں، اور جن سے میں چھوٹا تھا مجھے وہ، دلاسے دیتے رہے۔ تاہم ہر دلاسہ نے زخموں کی جراحت کی اور ہر تعزیت نے درد میں اضافہ کیا۔

آنکھ کے پردہ پر ڈاکٹر صاحب کی تصویر تیرنے لگی اور ذہن میں ان کی یادوں کی فلم دوڑ گئی۔ اگرچہ میں نے زندگی کے گذشتہ چھ سال آپ کی قربت اور شفقت میں گزارے تھے اور طویل ملاقاتوں کا شرف بھی مجھے حاصل تھا مگر آج سابقہ ملاقاتوں کا ہر لمحہ تشنہ اور ہر داستان ادھوری لگتی تھی۔

میں اشکوں کا سیلاب پس چشم روکنے کے لئے آنکھیں بند کرتا تو کانوں سے آپ کی صدا ٹکراتی ''عزیز دوستو! وقت بڑی تیزی سے گزر رہا ہے، دشمنان اسلام دین محمدی کو زک پہنچانے کی مذموم سازشوں میں مصروف ہیں، زمانہ پھر ایک کربلا کا تقاضا کرتا ہے۔۔۔اٹھو یزیدیت کے عزائم خاک میں ملادو۔۔۔مگر یاد رکھنا کربلا لہو مانگتی ہے۔''

میں آنکھیں کھولتا تو آپ کی تصویر کہتی سنائی دیتی ''بے مقصد زندگی موت کے مترادف ہے۔۔۔''

میں ایسے میں کیا کرتا۔۔۔؟ حقیقتاً کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا! نہ یہ بات غیر متوقع تھی البتہ آپ کی جدائی کا ماتم کرنے کو جی چاہتا تھا مگر ماحول نے میرے ہاتھ باندھے ہوئے تھے۔ البتہ میری سوچیں آزاد تھیں جو مجھ سے دو قسم کے سوالات پوچھ رہی تھیں۔۔۔ایک قسم کے سوالوں کا تعلق ڈاکٹر صاحب کی ذات سے تھا جبکہ دوسری قسم کے سوالوں کا واسطہ میری اپنی ذات سے۔۔۔

پہلی قسم کے سوالات کچھ یوں تھے کہ ڈاکٹر صاحب کو کس نے قتل کیا۔۔۔ وہ کیوں قتل ہوئے۔ آخر ان کا جرم کیا تھا۔۔۔؟ ان تمام سوالوں کے جوابات میرے پاس موجود تھے چنانچہ میں نے اپنی سوچ کو مطمئن کیا مگر دوسری قسم کے سوالات کہ ان کے بعد ہمارا کیا بنے گا۔۔۔ملت کو سہارا کون دے گا۔۔۔ ہماری نظریاتی تربیت کون کرے گا۔۔۔ہمیں زندگی کے مقصد سے آگاہی کون دے گا۔۔۔ حالات کی کڑکتی دھوپ میں شفقتوں کا سایہ کون فراہم کرے گا۔۔۔ پردیسی پنچھیوں کا گھونسلہ کون بنے گا۔۔۔؟ کے جوابات مجھے مطلوب تھے مگر اس وقت ان سوالات کے جوابات دینے کے لئے کوئی میسر نہ تھا۔۔۔ جہاں تک میری بساط تھی میں نے خود کو جوابات دینے کی کوشش کی اور جہاں تک میرے ادراک کی قوت بصارت ساتھ دیتی تھی وہاں

تک اس نے بھی نعم البدل تلاش کرنے کے جتن کیے مگر خدا گواہ ہے کہ اردگرد بظاہر بہت کچھ ہونے کے باوجود میں اپنی سوچوں کو طویل صحراؤں میں بھٹکتا، لڑکھڑاتا اور تڑپتا محسوس کرتا رہا۔ وہ فاصلے جو منزل تک پہنچنے کے لئے مختصر رہ گئے تھے آج نہ صرف طویل لگتے تھے بلکہ مسافتوں سے بھی خوف آتا تھا۔

اگرچہ میں مذکورہ سوالات کے جوابات سے قاصر تھا تاہم ماضی کے کچھ الجھے ہوئے سوالات کے مفاہیم مجھ پر نہایت واضح ہو رہے تھے آج مجھے پہلی بار اس حقیقت کا اندازہ ہو رہا تھا کہ ''گھونسلہ گر جانے کے بعد پرندوں کے بے پر بچے، طوفانوں، آندھیوں، بارشوں اور دشمن کے حملوں کے خوف سے کیوں چیختے ہیں۔۔۔؟

فطری عمل ہے کہ انسان اس قسم کے حادثات کے بعد دو زاویوں پر عموماً سنجیدگی سے غور کرتا ہے ایک اپنے محسن کے مشن کا تحفظ اور اس کے نظریات کا پرچار۔۔۔ دوم قاتل سے انتقام کی راہ کی تلاش۔۔۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسے مواقع پر مقتول کے پسماندگان کی نگہداشت اور ان کے دنیاوی مال ومتاع کا تحفظ ایک ضروری عمل ہوتا ہے مگر حقیقتاً اس سے بڑھ کر قیمتی سرمایہ ''شہید'' کا نظریہ ہوتا ہے جس کے لئے وہ اپنی جان تک قربان کر دیتا ہے۔ پس اس کے نظریہ کو زندہ اور اس کی جدوجہد کو جاری رکھنا ہی اس کے حق کی ادائیگی شمار ہوتا ہے۔

جہاں تک فطری طور پر قاتل سے انتقام کا تعلق ہے تو اس میں جذبات کی بجائے شعور کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک ''نظریاتی شہید'' کے اجرتی قاتل کو قتل کرنے سے غصہ تو ماند پڑ سکتا ہے مگر مقاصد کبھی حل نہیں ہو سکتے۔ امام سجاد علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ ''اگر ہم یزید کی ساری فوج بھی قتل کر دیں تو اس کی قیمت کربلا میں مارے جانے والے ہمارے ایک گھوڑے سے بھی کم ہے۔''

میں سمجھتا ہوں کہ مذکورہ بالا دونوں کام مورخ یا لکھاری سے بڑھ کر کوئی اور شخص انجام نہیں دے سکتا۔ میں وثوق سے کہتا ہوں کہ اگر کوئی مورخ دیانتداری سے ''مظلوم شہید'' کی داستاں تاریخ کے ماتھے پر رقم کر دے تو جغرافیے بدل جاتے ہیں کیونکہ اس سے بیک وقت راہ حق کے

شہید کا تعارف، مشن اور نظریہ زندہ رہتا ہے اور دشمن سے انتقام کی صورت بھی نکل آتی ہے۔

اس کتاب سے پہلے خدا نے مجھے توفیق دی کہ میں نے ملت اسلامیہ کے عظیم قائد شہید مظلوم علامہ سید عارف حسین الحسینی کے کردار اور مقدمہ قتل پر ''سفیر نور'' کتاب لکھی جس نے بین الاقوامی سطح پر شہید کو متعارف کرایا اور اجرتی قاتلوں سے لے کر وائٹ ہاؤس کے مکینوں تک کے کردار کو بے نقاب کیا۔

سفیر نور کی بے پناہ حوصلہ افزائی نے مجھے اس حقیقت سے آشکار کیا کہ شہید کا خون ایک امانت ہوتا ہے جس کی خوشبو کو نسلوں تک منتقل کرنا لکھاری کے دوش پر قرض تصور کیا جاتا ہے۔

شومئی قسمت کہ قائد کی جدائی کا زخم ہرا ہی تھا اور ابھی ہم ان کے پیغام کو گھر گھر پہنچا ہی رہے تھے کہ ظالموں نے ہمارے قبیلہ کے ایک اور مجاہد کو قتل کر دیا۔ ایسے میں ایک چیخ درد بن کر اٹھی اور فریاد کا روپ دھار گئی۔ فطرت ''درد'' کو دل کے سپرد کرنا چاہتی تھی مگر

(دل یہ کہتا تھا کہ فریادلبوں تک پہنچے۔)

جب میں ڈاکٹر صاحب کی صف ماتم پر بیٹھا تو پرسہ دینے والے تمام برادران نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ سفیر نور کی طرح ڈاکٹر صاحب کی زندگی اور کردار پر بھی ایک جامع کتاب کا ہونا اشد ضروری ہے۔ اور ایسے میں ؎

کہا مجھ سے دماغ و دل نے مل کر
طبیعت یوں نہ اپنی مضمحل کر
قلم کو درد دل سے متصل کر
قلم میں درد دل کو منتقل کر

چنانچہ جب میں ''سفیر انقلاب'' کی تیاری کے لئے گھر سے نکلا تو تنقید کے کچھ پتھر میرے سر پر بھی پھینکے گئے کہ ''اب اس کا کام ''شہداء'' پر کتابیں لکھنا رہ گیا ہے۔'' میں نے اپنے ان مہربانوں سے عرض کی اگر میں نے کسی کی ذات کا قصیدہ لکھنا ہوتا تو اس کی زندگی میں لکھتا اور کوئی دنیاوی فائدہ بھی حاصل کرتا، رنگین کفن اوڑھ کر مٹی کے نیچے سونے والوں سے میں نے کون سی

لالچ وابستہ رکھنی ہے۔ میں کسی کی ذات کی نہیں بلکہ کردار کی گواہی لکھ رہا ہوں جو مقتول کے ورثاء کے لئے ایک شہادت اور قاتلوں کے خلاف استغاثہ ہے۔ یہ تاریخ اپنوں کے لئے اثاثہ اور دشمن کے لئے انتقال ہے کہ اس نے جس شخص کو قتل کر کے یہ سوچا تھا کہ اس کا مدمقابل ختم ہو گیا ہے اب اس پر ثابت ہوگا کہ وہ مرا نہیں بلکہ پہلے سے زیادہ طاقتور بن کر سامنے آیا ہے۔

مجھے یہ لکھنے میں کوئی باک نہیں کہ اگر میں ملت جعفریہ پر ڈاکٹر صاحب کے احسانات کی بجائے اپنی ذات پر ان کے احسانات رقم کرتا تو پھر بھی ایک کتاب بن سکتی تھی کیونکہ مجھے یاد ہے کہ جب مئی ۱۹۸۹ء میں میرا لاہور آنا ہوا تو تنظیمی سطح پر دو افراد شہید ڈاکٹر محمد علی نقوی اور برادر سید راشد عباس نقوی (جو اس وقت آئی۔ایس۔او پاکستان کے مرکزی صدر تھے) نے مجھے اس انداز میں بانہوں میں لیا کہ میرا احساس غریب الوطنی جاتا رہا۔ اس وقت میری حیثیت ایک آخری درجہ کے کارکن کی تھی جو دفتر میں جھاڑو اور میزوں کی صفائی کے علاوہ کچھ نہ کر سکتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میرے دامن میں لفظ بھی نہیں ہوتے تھے۔ میں اتنا غریب تھا کہ مسکراہٹ کے علاوہ کسی کو کچھ نہ دے سکتا تھا۔ بھلا ایسے میں کسی کا مجھے پیار دینا خلوص نہیں تو اور کیا تھا۔۔۔؟

لاہور میں بڑے بھائی صاحب کا ذاتی گھر تھا مگر مجھے اس گھر کی بجائے دیوسماج (سابقہ مرکزی دفتر آئی۔ایس۔او) کے گھونسلہ میں زیادہ سکون محسوس ہوتا تھا کیونکہ یہاں مذکورہ برادران میری اس طرح پرورش کرتے تھے۔ جیسے کوئی پرندہ اپنے بے بال و پر بچے کو گھونسلہ میں چوگا دیتا ہے اور اسے پرواز کے مراحل میں داخل کر کے اپنی ذمہ داری مکمل کرتا ہے۔

آخر ایک وقت آیا کہ ممتاز قلمکار اور معروف مصنف بڑے بھائی جان عابد عسکری نے میرے پر سنوارے، راشد نقوی نے مجھے اڑان دی اور ڈاکٹر نقوی نے میری اڑان میں درد بھرا۔ میرے اردگرد کے ہمسفر لوگوں نے وقت کے ساتھ ساتھ خوشیاں خریدیں مگر میں نے درد کو اپنی میراث اور سرمایہ سمجھا۔ پرواز کرنے والے کئی احباب نے اپنے رشتے مال ومتاع سے قائم کیے مگر میں نے ہر چند کربلا سے ناطہ جوڑنے کی کوشش کی۔

مجھے ستمبر ۱۹۹۵ء تک کربلا سے مانوسیت کی گہرائی کا علم نہ تھا مگر ایک شب جب میں اپنے

آبائی گاؤں ''ننکانی ضلع ڈیرہ غازی خان'' میں ''سفیر انقلاب'' لکھ رہا تھا تو مجھے میری والدہ محترمہ نے بتایا کہ ''بیٹا اگرچہ میں تمھاری کتابیں اور تحریریں نہیں پڑھ سکتی لیکن جو کچھ میں لوگوں سے سنتی ہوں اس کی روشنی میں کہہ رہی ہوں کہ تم نے میرے دودھ اور میری محنتوں کا حق ادا کیا ہے'' میں نے برجستہ پوچھا ''کونسا حق۔۔۔؟'' فرمانے لگیں کہ میں نے ہر چند کوشش کی تھی کہ تمھیں باوضو ہو کر دودھ پلاؤں اور میں نے تمھیں زندگی کے ابتدائی سالوں میں جتنے لباس بھی پہنائے تھے وہ پنگھوڑا حضرت علی اصغر یا روضیہ حضرت امام حسین علیہ السلام سے مس شدہ ہوتے تھے'' میں نے موقع پاتے ہی عرض کی کہ ''امی جان اس کا مطلب ہوا کہ میں آپ کا مقروض ہوں اور یہ قرض اس صورت میں ادا ہو سکتا ہے کہ میں آپ کے سفید بالوں کو سرخ کرنے کے لئے اپنا لہو بطور مہندی پیش کروں تاکہ قرض بھی ادا ہو جائے اور حضرت علی اکبر کی والدہ معظّمہ کی سنت بھی۔۔۔؟ میری یہ بات سن کر ان کی ضعیف آنکھوں میں جوان آنسو اترے اور انھوں نے فرمایا'' میرے لئے اس سے بڑا اعزاز اور کیا ہو سکتا ہے۔۔۔''؟ بقول شاعر

ہر لمحہ اشکبار رہی ہے ہماری آنکھ
معمول پر کبھی یہ سمندر نہ آسکا

یہ ساری بات سن کر میں نے خدا کی عطا کردہ نعمت کا شکر ادا کیا کہ

پرائے پن کی وسیع وعریض دنیا میں
یہ اک خوشی ہی بہت ہے کہ درد اپنا ہے

میں ہمیشہ اقرار کرتا ہوں کہ مجھے ماں نے انسان جنا۔۔۔ تنظیم نے انسان بنایا اور ڈاکٹر نقوی جیسے برادران نے انسانیت کا نصاب پڑھایا۔ انھوں نے مجھے زخمی ہاتھوں سے بہت اونچا تعمیر کیا۔۔۔ انھوں نے مجھے مقصد حیات بتایا۔۔۔ انھوں نے مجھے عارضی زندگی میں دائمی کام کرنے کا حوصلہ اور سمت دی۔۔۔ انھوں نے مجھے تاریخ کا حصہ بننے کے گر سکھائے۔۔۔ انھوں نے مجھے خدا پر بھروسہ اور اپنے گناہوں سے ڈرنے کا درس دیا۔۔۔ انھوں نے مجھے اسلام کی عظمت اور وطن عزیز کی ناموس کے تحفظ کا سبق پڑھایا۔۔۔ انھوں نے مجھے فلک سے اترنے

والا رزق کھانے کی تلقین کی اور انھوں نے مجھے کسی کے آگے دامن اور ہاتھوں کا رخ نہ بدلنے کی تاکید فرمائی۔۔۔''

میں بند پھول تھا اس نے بہار دی مجھ کو
میں اس کے دم سے کھلا اعتراف کرتا ہوں

قارئین! اب آپ یہ خود اندازہ لگائیں کہ میں ان کا کتنا مقروض ہوں صرف میں ہی نہیں بلکہ ملت جعفریہ کے ہزاروں جوان میری طرح ڈاکٹر صاحب کی شفقتوں کے مقروض ہیں۔

لہٰذا اس کتاب کے دامن میں، میں نے جو کچھ سمویا ہے وہ ان کا کردار ہے۔ جہاں تک ان کے ذاتی احسانات کی ادائیگی کا تعلق ہے وہ مجھ جیسے غریب انسان کے لئے ممکن نہیں کیونکہ

میرے دامن میں تو لفظوں کے سوا کچھ بھی نہیں

مگر خدا کا شکر ہے کہ اس کے عطا کردہ ''درد'' نے مجھے اتنا اعتماد بخشا ہے کہ آج میں ظالموں کے کردار کو صحافت کے کفن میں لپیٹ کر دفن کرتا ہوں اور قرطاس کے صحرا میں لفظوں کے سیاہ فام قبیلوں کو مظلوموں کا سفیر بنا کر آباد کرتا ہوں جو راہ حیات کے ہر راہی کو حقیقتوں کا پتہ دیتے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ خلوص سے لکھی جانے والی تاریخ جب نسلوں کو حق کا تعارف کراتی ہے تو قاتل رسوا اور مقتول سرخرو ہو جاتا ہے جب لفظوں کے دوش پر سوار ہو کر لہو بولتا ہے تو قاتل کا دم گھٹنے لگتا ہے کہ

''ہم نے جس خون کو مقتل میں چھپانا چاہا
آج وہ کوچہ و بازار میں آنکلا ہے''

ایک جرم پر پردہ ڈالنے اور ندامت سے بچنے کے لئے تاریخ کا مجرم معافی نہیں مانگتا، توبہ نہیں کرتا، بلکہ کبھی لہو کے چراغ جلانے والوں کو قتل کر کے اور کبھی مورخ کے ہاتھ قلم کر کے اپنے جرائم میں اضافہ کرتا ہے اور وہ اس طرح نسل در نسل مجرم بن جاتا ہے۔۔۔ پھر اس کی نسلیں نسب سے بھی شرمندہ رہتی ہیں اور تاریخ سے بھی مجھے فخر ہے کہ میرا تعلق کربلا کے سفیر مورخین کے قبیلہ سے ہے۔۔۔ ہمارا معیار مخالفت اور دوستی بھی دوسروں سے مختلف ہے ہم ذاتیات کی بجائے

کردار کو چھیڑتے ہیں ہم ''یزید مردہ باد کم'' جبکہ ''یزیدیت مردہ باد'' زیادہ کہتے ہیں نہ جانے ہمارے مخالف کو یہ بات بری کیوں لگتی ہے۔۔۔؟

پیارے پڑھنے والو! آپ کے ہاتھوں میں موجود ''سفیر انقلاب'' ایک کتابی شکل میں قصیدہ ہے اس عظیم انسان کا جو دلوں کی سلطنت کا بے تاج بادشاہ رہا۔۔۔ نوحہ ہے۔۔۔ اس مظلوم کا جو مظلوموں کے حقوق کے تحفظ کی جنگ لڑتا ہوا بے دردی سے شہید ہوا۔۔۔ فریاد ہے۔۔۔ ان فراق زدگان کی جو اپنے محبوب کے ہجر میں ماہی بے آب کی طرح تڑپتے ہیں۔۔۔ تاریخ ہے۔۔۔ اس تاریخ ساز شخصیت کی جس کی جدوجہد کا سلسلہ اس کے سلسلہ نسب کی طرح کربلا سے ملتا ہے۔

''سفیر انقلاب'' صرف دلچسپ اور دلگداز واقعات کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ حقیقت میں پیغام ہے اس خون کا جو شہید کے چہرے پر فاتحانہ تبسم اور قاتل کے چہرے پر موت کی زردی کا باعث بنا، پیغام ایک امانت ہوتا ہے جس سے کوتاہ نظری خیانت تصور کی جاتی ہے اور خائن کو تو کوئی نسل معاف نہیں کرتی۔

میں نے کردار کو پیغام کا روپ دینے کی کوشش کی اور یہ سب کچھ خدا کی عطا کردہ توفیقات کی بدولت ہوا اگر میں یہ حق ادا نہ کرتا تو خدا مجھ سے توفیق سلب کر لیتا اور شہید کے خون کا بھی مجرم ٹھہرتا۔۔۔ تاریخ مجھے خائن لکھتی اور نسلیں مجھے مجرموں کے کٹہرے میں لے آتیں۔

میرا خدا شاہد ہے کہ میں نے یہ کتاب آزاد اور مطمئن ضمیر کیساتھ لکھی ہے، نہ میں نے کسی کی دی ہوئی لکیروں میں رنگ بھرا ہے اور نہ قلم کی عصمت کا کسی موڑ پر سودا کیا ہے۔

میں اپنی سوچ کی انگلی پکڑ کے چلتا ہوں
میرے خیال کا رشتہ میرے ضمیر سے ہے

کتابیں شوقیہ یا شغل کے طور پر نہیں لکھی جاتیں بلکہ ان کے پس منظر میں ایک ''فکر'' کار فرما ہوتی ہے۔ جس کی اساس ''درد'' ہوتا ہے۔ اگر کوئی قاری استطاعت کے باوجود بھی اس درد کی تہہ تک نہیں پہنچتا تو پھر وہ تاریخ اور اپنی توفیقات کیساتھ ظلم کرتا ہے۔ اس کے برعکس اگر کسی شخص

پر درد کی حقیقت منکشف ہوجاتی ہے اور وہ اسے اپنی قوم کے ساتھ شیئر (Share) کرتا ہے تو وہ نہ صرف اپنے ساتھ انصاف کرتا ہے بلکہ کتاب کے عنوان کی قربانی اور خون کے تقاضوں کا بھی حق ادا کرتا ہے۔

ڈاکٹر محمد علی نقوی کیا تھے۔؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب جاننے کے لئے ایک عمر چاہیے۔ میں واضح کرتا چلوں کہ آئی۔ایس۔او پاکستان کی قدآور شخصیات جنھیں تنظیمی دریاؤں سے تشبیہ دی جاتی ہے یہ تمام کے تمام دریا ایک سمندر میں اترتے تھے اور وہ سمندر ''سفیر انقلاب'' تھے۔

اب آپ خود اندازہ لگائیں کہ ساحل پہ کھڑا ہوا ہم جیسا کوئی عام انسان اس سمندر کی گہرائی کا کتنا ادراک کرسکتا ہے۔۔۔؟

میں برملا اعتراف کرتا ہوں کہ جو کچھ اس کتاب کے دامن میں سمویا گیا ہے وہ ڈاکٹر صاحب کی جدوجہد کا عشر عشیر بھی نہیں ہے کیونکہ جس انسان نے شعوری زندگی کے پچیس سال گھڑی کی سوئیوں کی طرح مسلسل حرکت میں گزارے ہوں اس کی خدمات کا تعارف تین سو صفحات میں سمونا ناممکن ہے۔ البتہ اس بات پر مطمئن ہوں کہ کچھ نہ کرنے سے کچھ کرگزرنے کا عمل بہتر ہوتا ہے۔ اس حقیقت میں کوئی شک ہی نہیں کہ لفظوں کی زبان خدمات کا حق ادا نہیں کرسکتی پس

میرے خیال نے جتنے بھی لفظ سوچے ہیں
ترے مقام، تری عظمتوں سے چھوٹے ہیں

میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ ڈاکٹر صاحب کی ذات اور کردار پر لکھی جانے والی یہ آخری کتاب ہوگی کیونکہ ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے بیسیوں زاویے تھے اور ہر زاویہ پر کم از کم ایک کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ تاہم مجھے امید ہے کہ میری یہ حقیر کاوش بہتر لکھنے والوں کو ایک بنیاد ضرور فراہم کرے گی۔

میں نے یہ کوشش میدان صحافت کے قدآور صحافیوں میں شامل ہونے کے لئے نہیں کی اور نہ ہی میری تحریر کا کسی لکھاری کے ساتھ تقابل کیا جائے۔ میرے ان کج مج لفظوں کو ایک وظیفہ

سمجھا جائے جس کی ادائیگی کا حوصلہ مجھے شہد کی اس مکھی سے ملا ہے جو اپنے منہ میں پانی کا ایک قطرہ لے کر حضرت ابراہیم علیہ کو آتش نمرود سے بچانے کے لئے میدان میں آئی تھی۔ روایت میں ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ کے درمیان رکھا گیا تو فرشتوں سمیت بہت سی مخلوقات بھی پیغمبر خدا کو بچانے کے لئے فلک بوس شعلوں کے گرد اکٹھی ہوئی تھیں۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے شہد کی مکھی کو دیکھ کر پوچھا تھا کہ ان شعلوں کی حرارت ہی اس قدر شدید ہے کہ تم آگ کے قریب پہنچ ہی نہ پاؤ گی دوم اگر تم پہنچ بھی جاؤ تو تمھارے منہ میں موجود پانی کا ایک قطرہ کیا کمال دکھائے گا۔۔۔؟ یہ سن کر مکھی نے جواب دیا تھا۔۔۔ آپ کی دونوں باتیں درست ہیں مگر میں تو اپنا وظیفہ ادا کرنے آئی ہوں تا کہ خدا کے حضور سرخرو ہوسکوں کہ ''اے رب العزت میری جتنی طاقت یا حیثیت تھی میں اس کے ساتھ تیرے محبوب کو بچانے کے لئے سر میدان اتری تھی۔''

پس پیارے قارئین! میری جتنی بھی حیثیت تھی میں نے خدا کے ایک محبوب کے لئے پیش کی یہی وجہ ہے کہ میں یہ فریضہ انجام دینے کے لئے گردوپیش سے بے نیاز رہا ہوں۔ کسی پہ انحصار کر کے نہ اپنے آپ کو جمود کا شکار کیا ہے اور نہ کسی انسان پر بھروسہ کی نیت یا نوازشات کی امید لئے یہ کام سرانجام دیا ہے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کا فرمان ہے کہ ''جو کام خدا کی رضا کے لئے کیا جائے اس کا اجر خدا ہی دیتا ہے۔''

میرے لئے یہ عزت کافی ہے کہ میں نے ایک عظیم شہید کے خون کو مقتل تک محدود نہیں ہونے دیا اور نہ دشمن کی یہ خواہش پوری ہونے دی ہے بلکہ اس کے پیغام کو آفاقی بنا دیا ہے۔ اس سے قبل جو لوگ ڈاکٹر صاحب کے نام سے واقف تھے انشاءاللہ اب وہ ان کے کام اور پیغام سے بھی واقفیت حاصل کرلیں گے اور پھر

ان کے عاشق جب پھریں گے ہجر میں دیوانہ دار
رفتہ رفتہ لوگ بھی درد آشنا ہوجائیں گے

چونکہ یہ کتاب ایک عام انسان اور مکتب صحافت کے کم علم طفل کی لکھی ہوئی ہے اس لئے اس میں تشنگی اور غلطیوں کا امکان خاصا موجود ہے۔ لہٰذا کہیں کوئی غلطی محسوس کریں تو آگاہ فرمائیں

تا کہ دیگر ایڈیشنز میں اس کا اعادہ نہ ہونے پائے۔ اگر کہیں میری کم مائیگی محسوس کریں تو حوصلہ افزائی کے صدقے درگزر کردیں۔ آپ کی اس کرم نوازی کا احسان مند رہوں گا۔

تاریخ کے قاری پر واضح ہونا چاہیے کہ ذمہ داریوں کی مثلث میں اس کا خط بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ شہید نظریہ کے تحفظ کے لئے آگے بڑھ کر جان قربان کرتا ہے اور یہاں اس کی ذمہ داری پوری ہوجاتی ہے۔۔۔ اس کے بعد مورخ اس کے خون کی سرخی سے اس کی قربانی کا مقصد اور منطق لکھتا ہے اور یوں وہ اپنی ذمہ داری کو تکمیل تک پہنچاتا ہے۔۔۔ اس کے بعد ہم خیال قاری کی ذمہ داری شروع ہوتی ہے جو پیغام رساں بن کر کوچہ بہ کوچہ شہید کی فکر کا پرچار کرتا ہے۔ تیسری قسم کی ذمہ داری کتنی اہم اور طاقتور ہے اس کا اندازہ آپ کو چودہ سو سال قبل کے معرکہ کربلا کے پرچار اور پیغام رسانی سے ہوسکتا ہے۔

پس قارئین پر لازم ہے کہ وہ اپنے محسن شہداء کے پیغام کو دیانتداری اور جانفشانی سے معاشرے کے ہر فرد اور آئندہ کی نسلوں تک پہنچانے میں اپنا اہم فریضہ سرانجام دیں اور خون کی حرارت کو زندہ رکھیں بصورت دیگر شہید کی قربانی بے مقصد چلی جائے گی اور قاتل اپنے مقصد میں کامیاب ہوجائے گا کیونکہ قاتل کی خواہش ہوتی ہے کہ مقتول کا نوحہ و ماتم نہ ہوتا کہ مظلوم اور ظالم کے درمیان تمیز نہ ہوسکے جبکہ شہید کے خون کا تقاضا ہوتا ہے کہ آپ کس کے مقصد کو کامیاب کرنا چاہتے ہیں مجھے یقین ہے کہ آپ مظلوم اور اپنے محسن شہید کے خون کے ساتھ مکمل انصاف فرمائیں گے اور شہید کے اس دعویٰ کو زندہ رکھیں گے کہ

ہمارے بعد بھی رونق رہے گی مقتل میں
ہم اہل دل کو بڑے حوصلے میں چھوڑ آئے

میری دعا ہے کہ خداوند متعال میری یہ حقیر کوشش اپنے دربار عالیہ میں منظور فرمائے اور قارئین کو اسے پڑھنے، حقیقی معنوں میں اسے سمجھنے اور پھر اس کے مطابق اپنی راہیں تراشنے کی توفیق دے۔

آخر میں خداوند ذوالجلال کی بارگاہ میں سجدہ شکر ادا کرنے کے ساتھ ساتھ ممنون احسان

ہوں، اپنے والدین، بہن بھائیوں اور احباب کا جنھوں نے اس کتاب کے سلسلہ میں حسب استطاعت میری حوصلہ افزائی اور پذیرائی فرمائی۔ خصوصی طور پر شکر گزار ہوں برادر ارشاد حسین ناصر کمالیہ کا جنھوں نے کتاب کی تیاری کے آغاز سے اختتام تک بہت سے میرے مسائل اپنے سر لے کر مجھے وقت فراہم کیا۔ جس کے باعث میرے کام کی رفتار متاثر نہ ہوئی۔

رب دوجہاں تمام بہن بھائیوں کی توفیقات میں اضافہ فرمائے اور انھیں شیطان کے شر اور چشم بد سے محفوظ رکھے۔ رب کریم سے التجا ہے کہ وہ ذات میرے شکستہ اور بے ربط لفظوں میں شہید کے خون کا صدقہ اثر بھر دے اور میری حقیر کوششوں کو میری نجات کا ذریعہ بنادے۔

عمر اتنی تو عطا کر میرے فن کو خالق
میرا دشمن میرے مرنے کی خبر کو ترسے

☆☆☆☆☆

سفیر انقلاب کا خاندانی پسِ منظر

سفیر انقلاب ''ڈاکٹر محمد علی نقوی شہید'' کے خاندان کا سلسلہ امام حضرت علی نقی علیہ السلام سے ملتا ہے تاہم صوبہ پنجاب کے دارالخلافہ لاہور کے مضافات میں آپ کے خاندان کی آمد تقریباً تین صدیاں پہلے بتائی جاتی ہے۔آغاز میں یہ سادات خاندان لاہور کے مغربی علاقہ ''شرقپور'' میں آباد ہوا جہاں انھوں نے خاندانی زہدوتقویٰ کی بدولت گردونواح کی مسلم وغیر مسلم آبادی کو گرویدہ کیا۔آپ کے آباؤ اجداد نے بہت سے غیر مسلم افراد کو مشرف بہ اسلام کر کے اسلامی طاقت میں اضافہ فرمایا اور عزاداری سید الشہداءکو تقویت بخشی۔

شیعیت کی تاریخ کا مطالعہ فرمائیں تو صدیوں قبل کی یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ہمیشہ سادات قبیلہ نے اپنے گھر بار چھوڑ کر، وسائل اور استطاعت کے مطابق کربلا کا آفاقی پیغام دنیا کے کونہ کونہ میں پہنچایا ہے۔آج بھی اگر ہم برصغیر میں پھیلے ہوئے معروف مزارات یا دور دراز علاقوں میں غیر معروف قبروں کا تاریخی پس منظر دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مرحومین نے تبلیغ اسلام اور ترویج عزاداری کے لئے ہجرت کی تھی۔

یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ جن افراد کی رگوں میں علیؑ وبتول سلام اللہ علیہا کا خون اورخون میں جد کی مظلومیت کی تاثیر شامل ہے وہ لوگ ہر دور میں کوفہ وکربلا کے زخمیوں کی

طرح رہے ہیں اورانھوں نے ہر قسم کے جبروستم جھیل کر رسول اکرمؐ کے عالمگیر پیغام کو انسانیت تک پہنچایا۔

سفیر انقلاب کے پردادا حضرت سید مدد علی شاہ صاحب نے آج سے تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل ''شرقپور'' سے لاہور کے جنوب مشرقی علاقہ ''وطنہ'' میں تبلیغ کے لئے ہجرت کی۔شاہ صاحب کی آمد کی خبر دور دراز تک پھیلی تو وہاں کی آبادی نے تہہ دل سے خوش آمدید کہا۔مختصر سے عرصہ میں آپ کے زہد وتقویٰ کی داستانیں گھر گھر پہنچ گئیں اور ہزاروں لوگ آپ کے مرید بن گئے۔ مسلمان تو آپ سے عقیدت رکھتے ہی تھے تاہم ہندو بھی آپ کی مریدی پر فخر کیا کرتے تھے۔

سید مدد علی شاہ صاحب کو خداوند کریم نے چار فرزند عطا فرمائے جن میں سید غلام عباس شاہ بڑے، سید جعفر علی شاہ، سید رحمت علی شاہ اور سید غلام حیدر شاہ چھوٹے تھے۔

سید غلام عباس شاہ صاحب جب سکول کی تعلیم کے قابل ہوئے۔تو ''وطنہ'' میں سکول نہ ہونے کے باعث سید مدد علی شاہ صاحب نے انھیں قریبی علاقہ علی رضا آباد کے مڈل اسکول میں تعلیم کے لئے داخل کروایا۔آج کا علی رضا آباد معروف قزلباش خاندان کا علاقہ تھا۔مظفر علی خان قزلباش یہاں کے نواب تھے اس لئے یہ خطہ ''علاقہ نواب صاحب'' کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔

قزلباش خاندان قدیمی شیعہ خاندانوں میں سے ایک ہے اور تاریخ میں شیعیت کی ترویج کے لئے اس خاندان کی خدمات نمایاں اور قابل تحسین ہیں۔جب سید مدد علی شاہ صاحب ''وطنہ'' تشریف لائے تھے تو اس نواب خاندان نے ان کی بے پناہ خدمت کی تھی اور انھیں اپنے ہر ممکنہ تعاون کا یقین دلایا تھا۔

سید غلام عباس شاہ صاحب جب ابتدائی تعلیم حاصل کرنے ''علاقہ نواب صاحب'' آئے تو نواب مظفر علی خان قزلباش نے انھیں اپنے بچوں کے ساتھ ٹھہرایا اور بچوں جیسی شفقت دی۔ سید غلام عباس شاہ صاحب نے مڈل کی تعلیم مکمل کی تو نواب صاحب نے ان کی شرافت اور دیانتداری کی بدولت انھیں اپنی زمینوں کا مختار بنا دیا۔خلوص، دینداری اور وفاداری کے

باعث شاہ صاحب، نواب خاندان کے اعتماد کی علامت تصور کیے جاتے تھے یہاں تک کہ ان کے فیصلوں کو نوابزادگان چیلنج نہیں کرتے تھے۔

انہی ایام میں شاہ صاحب نے عاشورہ محرم کا جلوس اپنے گھر سے برآمد کیا جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے اس سے پہلے محرم کے تمام پروگرام نواب صاحب کی حویلی میں منعقد ہوتے تھے۔ جب شاہ صاحب نے اپنے گھر سے ماتمی جلوس نکالنے کا فیصلہ کیا تو نواب صاحب نے کہا ''ہم تو سادات کے غلام ہیں اور غلام کی حیثیت سے صف ماتم بچھاتے ہیں۔ حقیقت میں پرسہ داری تو سادات کے گھر زیب دیتی ہے۔''

سید غلام عباس شاہ کو رب کریم نے چار بیٹے سید ظہیر حسن نقوی، سید نذیر حسین نقوی، سید شبیر حسین نقوی اور سید امیر حسین نقوی عطا فرمائے اور ذات باری نے انھیں پانچ بیٹیوں کی نعمت سے بھی نوازا۔ آپ کی دختران کا شمار انتہائی متقی اور خدا کی برگزیدہ ہستیوں میں سے ہوتا ہے۔ آپ کی دو بیٹیوں نے نجف اشرف میں حرم حضرت علی علیہ السلام پر زندگی گزاری وہیں پہ انتقال فرمایا اور وہیں پہ دفن ہوئیں۔

سید امیر حسین نقوی ۱۴ دسمبر ۱۹۳۲ء کو پیدا ہوئے۔ چونکہ آپ بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے اس لئے بہنوں کا انس اور پیار بھی آپ سے نسبتاً زیادہ تھا۔ متقی بہنوں کی تربیت نے آپ کی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے اور آپ کی طبیعت روحانیت کی طرف مائل ہوگئی۔ آپ نے ابتدائی تعلیم گورنمنٹ مڈل اسکول علی رضا آباد سے مکمل کی۔ جبکہ میٹرک کا امتحان سنٹرل ماڈل ہائی اسکول لاہور سے پاس کیا۔ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور سے ایف۔اے کرنے کے بعد آپ نے ریلوے میں معقول ملازمت اختیار کر لی۔ اسی دوران عربی فاضل اور منشی فاضل کے امتحانات بھی پاس کیے۔

آپ کی شادی سید رفیق حیدر زیدی کی صاحبزادی سیدہ شمیم فاطمہ سے ہوئی جو بھارت کے ضلع بجنور سے ہجرت کر کے علی رضا آباد لاہور آئے ہوئے تھے۔ اس رشتہ سے خدا نے آپ کو صاحبزادے سید محمد علی نقوی و سید عباس علی نقوی اور چھ صاحبزادیاں عطا فرمائیں۔

سید امیر حسین نقوی صاحب نے ملازمت کے دوران بی۔اے کیا تو ریلوے میں اعلیٰ ملازمت کے معیار پر پورے اترے مگر فطرت میں روحانی عنصر کے غلبہ نے آپ کی سمت بدل ڈالی۔

اسی زمانہ میں مقامات مقدسہ کی زیارت کے شوق نے تڑپایا تو آپ نجف اشرف عراق تشریف لے گئے، روحانی ماحول کی حدود میں داخل ہوئے تو وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ عشق کی لذت میں اضافہ ہوا تو ترک وطن کا ارادہ کیا، وطن لوٹے تو ملازمت کو خیر باد کہا اور دینی تعلیم سے سیراب ہونے کے لئے نجف کی راہ کے مسافر بنے۔

آپ ۱۹۵۰ کو پاکستان واپس آئے تو ''جامعہ امامیہ لاہور'' کے پرنسپل ٹھہرے اور ''جامعۃ المنتظر لاہور'' جو وسن پورہ میں ہوتا تھا کے طلباء کو دروس دینے میں مصروف ہوگئے۔ اس دوران میں آپ نے مختلف موضوعات پر علیحدہ علیحدہ کتابچے لکھنا شروع کیے جن میں ''ولایت حضرت علیؑ'' کے کتابچہ نے خوب شہرت پائی۔

آپ کے علم، تدریسی انداز، زہد و تقویٰ اور تبلیغی رجحان کو دیکھتے ہوئے ''کینیا'' کے دارالخلافہ نیروبی میں مقیم پاکستانی مومنین نے آپ کو دعوت دی۔ آپ ان کے ہاں تشریف لے گئے تو انھوں نے آپ سے دینی خدمات کی التماس کی چنانچہ آپ ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے بطور خطیب، پاکستان سے کینیا (نیروبی) چلے گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب براعظم افریقہ دنیا بھر کا اہم تجارتی مرکز سمجھا جاتا تھا اور یہاں انگریزوں، عربوں اور برصغیر کے تاجروں نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ مولانا سید امیر حسین نقوی کو چونکہ تبلیغ اسلام سے عشق تھا اس لئے آپ کو مزاج کے موافق ماحول میسر آیا۔

نیروبی میں آپ کو دیگر مسلم خطباء وائمہ مساجد کی نسبت منفرد مقام حاصل تھا۔ ان ایام میں ''سنی ایسوسی ایشن'' کے زیر اہتمام مرکزی جشن میلاد منعقد ہوا کرتا تھا جس کے شاہ صاحب نہ صرف منتظم ہوا کرتے تھے بلکہ آپ کو ''چیف اسپیکر'' کی حیثیت سے اس پروگرام میں مدعو کیا جاتا تھا۔ سنی شیعہ مسلمانوں کی نگاہ میں آپ کا مقام اس قدر بلند تھا کہ وہاں کی حکومت آپ کی ذات کو مسلمانوں کا واحد نمائندہ تصور کرتی تھی۔ ایک مرتبہ کینیا کی آزادی کی تقریب میں تمام مذاہب

کے نمائندگان کو دعوت دی گئی تو حکومت نے مسلمانوں کی طرف سے آپ کو مدعو کیا اور نمائندگی دی۔

چونکہ آپ کو اردو، انگریزی، فارسی، عربی، افریقی، اور گجراتی زبان پر عبور حاصل تھا اس لئے آپ وہاں کے مختلف علاقوں میں تبلیغ اسلام کے لئے جاتے اور دلائل سے دین محمدیہ کا تعارف کراتے تھے۔

نیروبی میں دو سال قیام کے بعد ۱۹۶۶ء میں آپ تنزانیہ کے شہر ''لنیڈی'' چلے گئے جہاں دو سال تک خدمات سرانجام دیں۔ ۱۹۶۹ء میں آپ ''یوگنڈا'' کے دارالخلافہ ''کمپالہ'' تشریف لے گئے جہاں درس قرآن دینے میں ممتاز مقام حاصل کیا۔ ایک مرتبہ وہاں کے غیر مسلم گروہ کے ساتھ مناظرہ طے پایا تو آپ شب بھر خدا کے حضور دعا کرتے رہے کہ ذات کریم ان کی زبان میں اثر عطا کردے تاکہ وہ خدا کے دین کو متعارف کرا سکیں۔ صبح مناظرہ ہوا تو آپ نے فتح پائی اور لوگوں کو اسلام کی طرف مائل کیا۔

سید امیر حسین نقوی صاحب نے زندگی کے آخری ایام ''برمنگھم'' لندن میں گزارے۔ جہاں آپ کو انتڑیوں کا سرطان ہوا۔ آپ کا مرض لا علاج ہوا تو ڈاکٹر محمد علی نقوی اپنے والد بزرگوار کو لینے لندن پہنچے اور آپ کو اپنے وطن واپس لے آئے۔ آپ نے زندگی کے آخری ایام شیخ زید اسپتال لاہور میں گزارے اور ۲۱ ستمبر ۱۹۸۷ء کو داعی اجل ہو گئے۔

آپ کے جنازہ میں ملک کے معروف علماء، معززین شہر اور قائد ملت جعفریہ علامہ سید عارف حسین الحسینی نے شرکت فرمائی۔ آپ کے جسد خاکی کو علی رضا آباد میں سپرد خاک کیا گیا۔ جہاں آپ کی مرقد پر لکھا ہوا شعر آپ کا یوں تعارف کراتا ہے۔

دوستوں کا دوست تھا اقرباء کی جان تھا
بندہ مولا علی سادات کی پہچان تھا

☆☆☆☆☆

سفیر انقلاب آغوش مادر سے آغوش مکتب تک

سفیر انقلاب ڈاکٹر محمد علی نقوی ۲۸ ستمبر ۱۹۵۲ء کو علی رضا آباد لاہور میں پیدا ہوئے۔ آپ نے جس گود میں آنکھ کھولی وہ علوم آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی درسگاہ تھی اور جس آنگن میں پروان چڑھے وہ ''شہر علم'' کا ایک حصہ تھا۔ آپ کو اپنی پشت میں پہلے عالم زادہ ہونے کا اعزاز تو حاصل تھا ہی مگر ملت جعفریہ کے مسیحا علامہ سید صفدر حسین نجفی مرحوم کی شفقت آپ کو روز اول سے ممتاز کر گئی۔

محسن ملت حضرت علامہ سید صفدر حسین نجفیؒ، مولانا سید امیر حسین نقویؒ کے بہنوئی تھے۔ ایک بلند پایہ فقیہ اور روحانی شخصیت ہونے کے ناطے آپ سے نومولود بچے کا نام تجویز کرنے کی استدعا کی گئی۔ چنانچہ آپ نے بچے کا نام ''محمد علی'' رکھا اور ساتھ یہ بھی فرمایا کہ ''میری زندگی میں اس نام کے ہر شخص نے ستاروں پر کمند ڈالی ہے۔''

سید محمد علی نقوی کی پیدائش کے وقت آپ کے والد مولانا سید امیر حسین نقوی نجف اشرف میں تھے۔ آپ اسی سال پاکستان آئے تو واپسی پر اہل خانہ کو ساتھ لے گئے۔ چنانچہ محمد علی کو نجف و کربلا کی فضائیں جذب کرنے کا موقع نصیب ہوا۔

آپ نے چلنا نجف میں سیکھا اور بولنا کربلا میں۔۔۔ شاید یہی وجہ تھی کہ زندگی بھر آپ

کے قدم علیؑ کی بتائی ہوئی سمت میں اٹھے اور آپ کی زبان حسینؑ کی صدائے ''ھل من ناصر'' کی یاد تازہ کرتی رہی۔۔۔آپ دیکھنے کے قابل ہوئے تو کربلا کا وہ نقشہ دیکھا جس کے بارے میں شاعر نے کہا تھا۔

مقتل کی سرزمین پہ بناتے رہے حسینؑ
اسلام کی حیات کا نقشہ تمام رات

تقریباً چھ سال تک نجف وکربلا کی زمین پر پروان چڑھنے کے بعد انقلاب کا یہ ننھا سفیر اپنے والد کے ساتھ کینیا کے دارالخلافہ ''نیروبی'' آ گیا جہاں دوسال تک ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ کو پدر بزرگوار کے ہمراہ تنزانیہ کے شہر ''لنیڈی'' اور پھر یوگنڈا کے دارالخلافہ ''کمپالہ'' آنا پڑا۔آپ نے ۱۹۶۹ء میں سینئر کیمبرج بھی ''اولڈ کمپالہ'' سے کیا۔

آپ زمانہ طالب علمی میں مثالی اسکاؤٹ تھے۔آپ نے اسکاؤٹ کی تربیت ''نیروبی'' سے حاصل کی اور ''کمپالہ'' میں بہترین مباحث (DEBATER) کی حیثیت سے اپنا نام روشن کیا۔آپ مباحثانہ صلاحیت کی بنا پر وہاں کی ''DEBATING Society'' کے جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے اور ملک بھر کے مقابلوں میں بیسیوں انعامات جیتے۔

۱۹۶۹ء میں آپ پاکستان آئے اور لاہور کی معروف درسگاہ ''گورنمنٹ کالج'' میں ایف۔ایس۔سی پری میڈیکل میں داخلہ لیا۔

کالج کے پہلے سال میں ماحول کی تبدیلی اور لاہور میں رشتہ داروں کی قربت نے آپ کی تعلیمی رفتار کو متاثر کیا۔اسی دوران میں آپ کے اندر کی حس تڑپی تو آپ نے شیعہ نوجوانوں کی تنظیم ''ینگ شیعہ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن'' کی بنیاد رکھی اور اس کے روح رواں بن گئے۔جب آپ کے والد کو آپ کی سرگرمیوں کا علم ہوا تو انھوں نے تعلیم میں عدم دلچسپی کا شکوہ کیا اور ساتھ میڈیکل کالج میں داخلہ لینے کی صورت میں منہ مانگے انعام کی پیشکش بھی کی۔۔۔منہ مانگے انعام کا سن کر ''محمد علی'' نے اپنے والد سے وعدہ لیا کہ اگر انھیں چودہ معصومینؑ کی زیارت گاہوں کی زیارت اور عمرہ کی ادائیگی کے اخراجات دیئے جائیں تو وہ میڈیکل کالج کے میرٹ پر پورا اتریں

گے۔والد صاحب نے حامی بھری تو آپ پختہ عزم کے ساتھ مصروف تعلیم ہو گئے۔دوسرے سال آپ نے بے پناہ محنت کی اور ۷۰ فیصد سے زائد نمبر حاصل کر کے لاہور میں ایشیاء کے معروف میڈیکل کالج ''کنگ ایڈورڈ'' کے معیار پر پورے اترے۔

۱۹۷۲ء میں آپ نے ایم بی۔بی۔ایس میں داخلہ لیا تو وعدہ کے مطابق آپ کے والد نے زیارتوں کے تمام اخراجات آپ کو بطور انعام پیش کر دیئے۔اسی سال گرمیوں کی تعطیلات ہوئیں تو آپ زیارتوں کے لئے اکیلے عازم سفر ہوئے۔تقریباً دو ماہ تک مقامات مقدسہ پر حقیقی عشق کی پیاس بجھائی۔سیراب ہو کر واپس لوٹے تو پاکستان کی تاریخ نے ایک اور محمد علی کی اداؤں کو سمیٹنے کے لئے دامن دراز کر دیئے۔

☆☆☆☆☆

آئی۔ایس۔او کا قیام اور سفیر انقلاب

یوں تو امامیہ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن پاکستان کا قیام ۲۲ مئی ۱۹۷۲ء کو عمل میں آیا مگر جذبات کے ان بھڑکتے شعلوں کا اصل محرک وہ چنگاری تھی جو ۱۹۶۶ء میں ''شیعہ اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن'' کی شکل میں چمکی تھی میں سمجھتا ہوں کہ محرک کی معرفت کیے بغیر کسی چیز کی حقیقت کو گہرائی تک جانچنا مشکل ہوتا ہے لہٰذا مورخ کے حوالہ سے میری یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ حال اور مستقبل کے قارئین پر واضح کروں کہ کسی چیز کی تعمیر کتنی مشکل، محنت طلب، کٹھن اور پر مصائب ہوتی ہے۔۔؟

۱۹۶۶ء کی بات ہے جب کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور کے ڈاکٹر حیدر حسین شمسی نارووال نے کالج کے چند شیعہ احباب کے سامنے شیعہ طلباء کی تعلیمی رہنمائی کے لئے درد دل بیان کیا۔ احباب نے حامی بھری تو برادر موصوف نے ایک شام اپنے کمرہ میں ہوسٹل کے ان تمام شیعہ طلباء کو اکٹھا کیا جن تک ان کی رسائی تھی۔ انھوں نے اس سہانی اور بابرکت شام دوستوں پر دل کی بات واضح کی تو وہ اثر اور خلوص کی بدولت دلوں میں اتر گئی۔

شمسی صاحب کی سوچ اس وقت اپنے ادارے کے شیعہ طلباء کو نوٹس فراہم کرنے اور ان کی تعلیمی رہنمائی تک محدود تھی البتہ انھوں نے جو کچھ سوچا اس پر عمل کر دکھایا۔ تقدیر کے فیصلوں سے کوئی واقف نہیں ہوتا وہ جو کچھ کرنا چاہتی ہے اس کے راستے خود فراہم کرتی ہے۔ یہی کچھ

آئی۔ایس۔او کے ساتھ ہوا کہ شمسی صاحب کے ''درد'' کی چنگاری، احساس کی فضاؤں سے شعلوں میں بھڑکی اور پھر شعلے بھانبھڑ بنتے گئے۔

کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کی سطح پر جب اہداف کی تکمیل میں کامیابی ہوئی اور پرانے ساتھیوں کی رہنمائی کی بدولت نئے امامیہ طلباء کے ہر سطح کے مسائل حل ہوئے اور ان کی تعلیمی صورتحال بہتر ہوئی تو ان برادران نے ذاتی طور پر جان پہچان رکھنے والے دوسرے اداروں کے طلباء کو اپنے پروگرام سے آشنا کر کے فکر دی۔ جب شہر کے مختلف تعلیمی اداروں میں امامیہ طلباء کی رہنمائی کا سلسلہ جاری ہوا اور اس کے خاطر خواہ نتائج سامنے آئے تو اس فکر کے روح رواں اکٹھے مل بیٹھے اور انھوں نے اسے ایک تنظیم کا روپ دینے کی ٹھانی۔ آغاز میں مختلف اداروں میں مختلف ناموں سے یہ کارواں رواں ہوا کسی ادارہ میں یہ کارروان ''شیعہ اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن'' کے حوالہ سے معروف ہوا اور کسی درسگاہ میں اسے ''جمعیت طلبا اثنا عشریہ'' کے نام سے پکارا جانے لگا۔ کسی کالج میں یہ قافلہِ درد ''شیعہ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن'' کے نام سے مشہور ہوا اور کسی ادارہ میں اس کا نام ''جعفریہ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن'' رکھا گیا۔ ایک روز مختلف تعلیمی اداروں کے سرکردہ امامیہ طلباء اکٹھے ہوئے تو انھوں نے اپنے پروگرام کو وسعت دینے کا عزم کیا۔ ان کا خیال تھا کہ ہر تعلیمی ادارہ میں یہ سلسلہ جاری کیا جائے، کارکنان تلاش کر کے انھیں فکر دی جائے اور انھیں ادارہ کے یونٹ سے مربوط کیا جائے۔

آغاز میں یہ طے پایا کہ تمام کلاسوں کے حاضری رجسٹرز کی پڑتال کی جائے اور وہاں سے جن ناموں پر شیعہ ہونے کا گمان ہو نوٹ کر لئے جائیں اور پھر ان سے رابطہ کی زنجیر مستحکم کی جائے۔ تھوڑے عرصے بعد یہ فیصلہ بھی ہوا کہ لاہور کے تعلیمی اداروں کے ہاسٹلز کا گشت کر کے کمروں اور دروازوں پر لکھے گئے معروف شیعہ نام بھی ریکارڈ میں لائے جائیں گے اور ان سے مربوط ہو کر دائرہ کار کو وسعت دی جائے گی۔

قبیلہ سازی کے احساس اور عشق نے مٹھی بھر نوجوانوں کو یوں تڑپایا کہ یہ مختلف اداروں کے ہاسٹلز میں پہنچ جاتے۔۔۔ بھوک نقاہت پیدا کرتی اور نہ پیاس تھکاوٹ۔۔۔ ہاسٹلز کے طلباء پیٹ بھر

کر کمروں میں سو جاتے تو یہ بھوکے پیاسے جنوں فروغ کمروں کے دروازوں پر لکھے ہوئے نام پڑھتے۔

اپنے اہداف سے مخلص یہ قافلہِ درد ہمیشہ موسموں سے بے نیاز رہا البتہ گرمی سے جھلسے ہوئے ان چہروں پر اس وقت پھول سی تازگی آجاتی تھی جب ان کا تیر نشانہ پر ٹھیک بیٹھتا تھا اور سردی سے ٹھٹھرے ہوئے جسموں میں اس وقت حرارت پیدا ہو جاتی تھی جب انھیں کوئی طالب علم ''یا علی مدد'' کا جواب ''پیر مولا علی مدد'' کے جملے میں دیتا تھا۔

عشق کی اس تحریک کے روح رواں حیدر حسین شمسی، محمد علی گیلانی اور ماجد نوروز عابدی تھے جو کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور میں زیر تعلیم تھے جبکہ مبارک علی جھنگ، نسیم الحسنین میانوالی، حمید الحسن رضوی راولپنڈی، شیخ نور محمد لاہور، سید گل محمد نقوی راولپنڈی، سید مطلوب حسین نقوی میانوالی، سید بابر نقوی لاہور، سید اصغر علی شاہ آزاد کشمیر، سید نیاز حسین نقوی بھکر، سید قیصر حسین شیرازی نارروال، فرمان علی بلتستان، ناصر حسین نقوی ڈیرہ اسماعیل خان اور سید امجد علی کاظمی شیخوپورہ جو لاہور کے اداروں میں زیر تعلیم تھے میدان عشق کے عظیم سپوت تصور کیے جاتے تھے۔ عابدی صاحب انتھک، پر درد اور شیریں مقال تھے اور وہ اپنے ساتھیوں سے ہر موڑ پر کہتے ۔۔۔دوستو!

موڑ تو بے شمار آئیں گے
تھک نہ جانا جدا نہ ہوجانا
عشق کی انتہا نہیں ہوتی
عشق کی انتہا نہ ہوجانا
زندگی درد سے عبارت ہے
زندگی سے خفا نہ ہوجانا

ایسے حالات میں جہاں والدین کی توقعات، وسائل کی کمی اور تشخص کے مسائل حائل ہوں کام کرنا کس قدر دشوار تھا۔ یہ ان احباب کو معلوم ہے جن پر داستان عشق بیتی، بعض اوقات

والدین کی جھاڑ پاؤں کی زنجیر بنتی اور بعض دفعہ وسائل کی کمی آڑے آجاتی۔ کبھی کبھار نیا ساتھی تلاش کرنے میں خوشی ہوتی تو بعض دفعہ غلط تعارف سے مایوسی کا سامنا بھی کرنا پڑتا۔ ایک مرتبہ ایک ساتھی نے پنجاب یونیورسٹی کے لاء ہاسٹل کے کمرہ پر ایک نام پڑھا جو شیعوں جیسا تھا چنانچہ برادر موصوف اس کے پیچھے پڑ گئے۔ ایک روز وہ لڑکا ڈائننگ ہال میں کھانا کھا رہا تھا کہ جنوں فروغ برادر پہنچ گئے۔ انھوں نے اس کے قریب ہو کر پوچھا ''آپ شیعہ ہیں'' تو جواب مثبت ملا۔۔۔حقیقتاً وہ لڑکا شیخ تھا شیعہ نہیں تھا۔ مگر حجاب کی گفتگو میں مغالطہ ہو گیا۔ وہ کھانا کھانے کے بعد اپنے کمرہ میں پہنچا تو برادر خوش خوش اس کے ہاں پہنچ گئے۔ رسمی علیک سلیک کے بعد برادر نے اس کے سامنے غدیرِ خم، کربلا، کوفہ و شام اور سقیفہ کا نقشہ پیش کیا۔ یہاں تک کہ بات تولیٰ اور تبریٰ کی حدود کو عبور کرتی ہوئی ''شیعہ اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن (ایس۔ایس۔اے) کے اغراض و مقاصد تک جا پہنچی۔ برادر جذبات میں بہت کچھ کہہ گئے مگر اس کے چہرے کے تیور نہ بھانپ سکے۔ آخر اس نے پوچھا کہ ''یار تم کون ہو، کیسے آئے ہو، تمھیں کس نے بھیجا ہے اور تم چاہتے کیا ہو؟'' ایک بار پھر تعارف ہوا تو پھر دونوں پر شیعہ اور شیخ کا عقدہ کھلا اور یوں دونوں حضرات کو خیال آیا کہ

ایک نقطہ نے انھیں محرم سے مجرم کر دیا

مختصر احباب کی اس مختصر جمیعت نے قلیل عرصہ میں طویل مصائب برداشت کیے۔ وقت، تعلیم، قوت، وسائل اور آرام کی قربانیاں نچھاور کر کے انھوں نے سفر کو جاری رکھا۔

ایس۔ایس۔اے نے پہلے سال لاہور میں جن تعلیمی اداروں میں امامیہ طلباء سے رابطے کیے ان میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج، ڈینٹل کالج، گورنمنٹ کالج، گورنمنٹ اسلامیہ کالج، ایم۔اے۔او کالج، دیال سنگھ کالج، ہیلے کالج آف کامرس، یونیورسٹی لاء کالج، پنجاب یونیورسٹی نیو کیمپس، انجینئرنگ یونیورسٹی، ویٹری کالج اور یونیورسٹی اورینٹیل ہوسٹل نمایاں تھے۔

ان اداروں میں جب امامیہ طلباء کی میٹنگ ہوتی تو عموماً پانچ چھ رہنما طلباء سائیکلوں یا اس

زمانہ کی ڈبل ڈیکر بسوں پر سوار ہوکر متعلقہ ادارے میں جاتے جہاں چار پانچ احباب پہلے سے موجود ہوتے اور یوں آٹھ دس افراد کی میٹنگ ہوتی۔عشق کا یہ عالم تھا کہ بس کی دوسری منزل پر جاتے جاتے میٹنگ شروع ہوجاتی۔منقبت اور اشعار سے جذبوں کو حرارت دی جاتی۔ڈاکٹر ماجد نوروز عابدی صاحب عام طور پر شعر پڑھ کر محفل کو گرماتے آج بھی ان کی ڈائری میں یہ شعر سرفہرست ہے کہ

ہم کل بھی سردار، صداقت کے امیں تھے
ہم آج بھی انکار حقیقت نہ کریں گے

ایک سال کی مسلسل محنت کے بعد ''ایس۔ایس۔اے'' کا پہلا یوم تاسیس کربلا گامے شاہ لاہور میں منعقد ہوا جس میں لاہور کے چودہ تعلیمی اداروں کے طلباء نے شرکت کی۔اس اجتماع سے پروفیسر عنایت حسین بخاری، مولانا سید عابد حسین عابدی اور مولانا سید مرتضیٰ حسین صدر الافاضل نے خطاب فرمایا۔یہ اجتماع دیکھ کر ''ایس۔ایس۔اے'' کے قائدین کو بے حد خوشی ہوئی اور انھوں نے اپنے رب کا شکر ادا کیا۔

۱۹۶۹ء میں ''ایس۔ایس۔اے'' کا دوسرا اجتماع شاہراہ قائداعظم پر واقع ''کانفرنس سنٹر'' نزد انارکلی میں منعقد ہوا جس کی صدارت سید مبارک محمود علی گیلانی نے کی اور اس میں خانہ فرہنگ ایران کی ڈائریکٹر جنرل مادام مریم بہنام مہمان خصوصی تھیں۔ایس۔ایس۔اے کے اس اجلاس کی اخبارات نے خاصی تشہیر کی اور باقاعدہ فوٹو لیے۔جس پر ایس۔ایس۔اے کے قائدین کے حوصلے توانا ہوئے۔اس عظیم اجتماع میں شرکاء کے سامنے ''ایس۔ایس۔اے'' کا جو سہ نکاتی پروگرام پیش کیا گیا وہ کچھ یوں تھا۔

(۱) شیعہ طلباء کو ایک پلیٹ فارم پر متحد کرنا۔
(۲) تعلیمی میدان میں ان سے بھرپور تعاون کرنا۔
(۳) محمدؐ و آل محمد علیہم السلام کی سیرت پر عمل پیرا ہونے کی ترغیب دینا۔

اس پروگرام سے نہ صرف قائدین کے حوصلے بلند ہوئے بلکہ شرکاء کے چہرے بھی فرط

جذبات سے دمک اٹھے۔یہ دوست جب ایک دوسرے سے گلے ملے تو ان کے احساسات دلوں میں منتقل ہوگئے۔قربتوں کے بڑھنے سے محبتوں نے جنم لیا، محبتیں جوان ہوئیں تو انھوں نے آنکھوں میں کرنوں کے جوت بھر دیے۔یہ ساتھی اپنے اپنے اداروں میں لوٹے تو خاصے متحرک ہوگئے۔چنانچہ ''ایس۔ایس۔اے'' کا تیسرا یوم تاسیس دیال سنگھ کالج لاہور میں ہوا تو ایک سو پچیس (۱۲۵) طلباء نے شرکت کی۔اس اجلاس کی صدارت ڈاکٹر سید ماجد نوروز عابدی نے کی اور مولانا مرتضیٰ حسین صدر الافاضل کے علاوہ کئی ایک عمائدین نے خطاب فرمایا۔

۷۰۔۱۹۶۹ میں ایوب خان کے خلاف ملک بھر کی سیاسی جماعتوں نے اتحاد کر کے ''ڈیموکریٹک ایکشن کمیٹی'' تشکیل دی تو ملکی حالات پلٹا کھا گئے۔اجتماعی مظاہروں اور ہڑتالوں سے جہاں دیگر ادارے متاثر ہوئے وہاں تعلیمی اداروں پر بالخصوص گہرے اثرات مرتب ہوئے۔طلباء کی سیاسی سرگرمیوں کی بدولت تعلیمی ادارے وقفہ وقفہ سے بند ہوتے رہے اور یوں طلباء تنظیموں کی فعالیت بھی ماند پڑ گئی۔ہاسٹلز کے طلباء اپنے گھروں کو بیرون لاہور چلے گئے تو رابطے کمزور ہوگئے۔چنانچہ حالات کے پیش نظر ایس۔ایس۔اے کی کارکردگی بھی متاثر ہوئی۔

۱۹۷۱ میں تعلیمی ادارے باقاعدگی سے کھلے تو امتحانات کی وجہ سے طلباء تعلیم میں مصروف ہوگئے اور امتحان دینے کے بعد سینئر ساتھی تعلیمی اداروں سے چلے گئے۔

ایس۔ایس۔اے جمود کا شکار ہوئی تو طلباء کے رابطے بھی کمزور پڑ گئے۔مرکز نہ ہونے کے باعث مرکزی اجتماع تو سرد ہوگئے مگر طلباء کی فکر متحرک رہی جس کے باعث مختلف اداروں میں مختلف ناموں سے طلباء سرگرم عمل رہے۔

۱۹۷۲ء میں شیعہ طلباء کی منتشر طاقت کو ایک پلیٹ فارم پر یکجا کرنے کا فیصلہ انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور کے طلباء کو آیا تو انھوں نے اس مشن میں سرگرم طلباء سے رابطے بڑھانا شروع کیے۔اس سلسلہ میں برادر علی رضا نقوی اور برادر نیاز نقوی انجینئرنگ یونیورسٹی سے ''کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج'' میں زیر تعلیم برادر بابر نقوی اور ایس۔ایس۔اے کے بانی رکن ڈاکٹر سید ماجد

نوروز عابدی انچارج بلڈ بنک سے ملنے گئے۔ سائیکلوں پر سوار یہ برادران جب میڈیکل کالج کے گیٹ پر پہنچے تو ان کی ملاقات کالج کے گیٹ پر فرسٹ ایئر کے ایک باریش نوجوان سے ہوئی جو سفید ڈاکٹری کوٹ پہنے برق رفتاری سے اپنی کلاس کو جارہا تھا۔ برادران نے اس پھرتیلے نوجوان کو صدا دی تو وہ رک گئے۔ علیک سلیک کے بعد برادران نے اس باریش نوجوان سے بابر نقوی اور ڈاکٹر ماجد نوروز عابدی کے بارے میں پوچھا۔ نقوی اور عابدی جیسے الفاظ سنتے ہی اس نوجوان نے فوراً ان سے ملنے کی وجہ دریافت کی تو برادران حقیقت کو گول کر گئے کیونکہ یہ برادران اس باریش نوجوان کو ریش اور خلوص سے ملنے کی بدولت ''اسلامی جمعیت طلبہ'' کا کارکن سمجھ رہے تھے۔ مگر یہ برق رفتار نرم وملائم ریش کا مالک، پیکر خلوص ومحبت اور چمکتی آنکھوں والا نوجوان ''ڈاکٹر محمد علی نقوی'' تھا جو بار بار ان برادران سے دل کی بات پوچھ رہا تھا۔

کچھ وقت تلاش کرنے کے بعد جب مطلوبہ افراد نہ ملے تو برادر رضا نقوی اور برادر نیاز نقوی اپنا نام بتائے بغیر چلے گئے اور دو دن بعد واپس آنے کا پیغام چھوڑ آئے۔ کہتے ہیں کہ

تاڑنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں

یہ دونوں برادران واپس چلے گئے مگر ڈاکٹر محمد علی نقوی نے ڈاکٹر بابر نقوی اور ڈاکٹر ماجد نوروز عابدی سے رابطہ قائم کرلیا۔ ڈاکٹر صاحب کی بے قراری کو اس وقت تک قرار نہ آیا جب تک انھوں نے اپنی دعا کا حاصل نہ پایا۔ چونکہ وہ ''سفیر انقلاب'' تھے اس لئے تنہا رہنا انھیں دشوار لگتا تھا اور وہ اپنے رب سے یہی دعا کرتے تھے۔

جس کی آنکھیں مجھے اندر سے بھی پڑھ سکتی ہوں
کوئی چہرہ تو میرے شہر میں ایسا لا دے

تیسرے روز برادر نیاز نقوی اور برادر رضا نقوی، بابر نقوی سے ملنے آئے تو ڈاکٹر محمد علی نقوی سے دوبارہ ان کی ملاقات ہوگئی مگر اس بار ڈاکٹر صاحب پر معاملہ عیاں ہو چکا تھا۔ آپ نے برادران کا موقف سنا تو فرمایا ''چونکہ آپ کا موقف خاصا وزنی ہے اس لئے میں ہر موقع پر آپ کا ساتھ دوں گا۔'' حالانکہ ڈاکٹر صاحب پہلے کسی طلباء تنظیم سے مربوط نہ تھے مگر ان کے اندر کا انسان

پہلے سے بیدار تھا۔

جب برادران کے رابطے مکمل ہوگئے تو انھوں نے ۲۲ مئی ۱۹۷۲ء کو انجینئرنگ یونیورسٹی میں ایک اہم اجلاس منعقد کیا جس میں تمام تعلیمی اداروں میں مختلف ناموں سے کام کرنے والی شیعہ طلباء تنظیموں کے دو دو نمائندگان نے شرکت کی۔

برادر نیاز نقوی، برادر علی رضا نقوی اور برادر محمد علی نقوی نے دلائل کے ساتھ شرکاء پر مرکزی پلیٹ فارم کی اہمیت اجاگر کی اور ساتھ ہی دو طلباء تنظیموں ''اسلامی جمعیت طلبہ'' اور ''نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن'' (این۔ایس۔ایف) کی مثالیں بھی دیں۔ جو اپنے اپنے مرکزی پلیٹ فارم کی وجہ سے منظم تھیں۔

طویل بحث وتمحیص کے بعد شرکاء، مرکز کی اہمیت پر رضا مند ہوئے تو مسئلہ نام کا پیدا ہوگیا۔ آخر کار اس مرکزی پلیٹ فارم کا نام ''شیعہ اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن'' تجویز کیا گیا جو پہلے سے خاصا معروف تھا۔

طے پایا کہ ''اثنا عشری اسٹوڈنٹس فیڈریشن'' اور دیگر شیعہ طلباء تنظیمیں اس میں ضم ہوجائیں گی اور تنظیم کو دستوری شکل میں متعارف کرایا جائے گا۔ چنانچہ دستور سازی کے لئے کمیٹی اور تاریخ کا اعلان کیا گیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب امامیہ طلباء سے زعماء قوم کے روابط نہ ہونے کے برابر تھے بلکہ معروف علماء کرام جن کی منبر ومجالس میں اہمیت تھی وہ بھی وابستگی سے کتراتے تھے اسی وقت ملت جعفریہ کی تین قومی جماعتیں آل پاکستان شیعہ کانفرنس، ادارہ تحفظ حقوق شیعہ اور شیعہ پولیٹیکل پارٹی منظر عام پر تھیں۔

آل پاکستان شیعہ کانفرنس کے سربراہ نواب مظفر علی خان قزلباش تھے جو مکمل طور پر حکومت وقت کی منشا کو ترجیح دیتے تھے اور ان پر بعض عمائدین جملہ کستے تھے کہ

تو خیال ہے کسی اور کا تجھے سوچتا کوئی اور ہے

نواب صاحب اس زمانہ میں ایوب خان کی کنونشن مسلم لیگ سے وابستہ تھے۔ اور انھوں

نے محترمہ فاطمہ جناح کی بجائے ایوب خان کو سپورٹ کیا تھا۔ اسی طرح ادارہ تحفظ حقوق شیعہ کو ''تحفظ حقوق شکم'' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

ایس۔ایس۔اے کا وجود عمل میں آیا تو روایتی رہنماؤں نے ڈورے ڈالنے کی کوشش کی جب انھیں ان کے مزاج سے آشنائی ہوئی تو انھوں نے قوم میں یہ پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ ''لونڈوں کی ایک تنظیم ہے جس کی عمر شبنم کے قطرہ سے زیادہ نہیں ہوگی۔''

ایس۔ایس۔اے کے رہنما علماء حقہ سے مربوط تھے اور وہ روایتی رہنماؤں سے بہت دور بھاگ رہے تھے۔ ایس۔ایس۔اے کے بانی رکن سے جب میں نے سوال کیا کہ اگر آپ اس وقت گمنام علماء کی بجائے نامور رہنماؤں کے پہلو میں بیٹھ جاتے تو زیادہ مصائب نہ جھیلنے پڑتے اور آپ کا سفر تیزی سے طے ہو جاتا تو انھوں نے جواب دیا کہ

جن کی آنکھیں تھیں انھیں بھی کچھ نظر آتا نہ تھا
ایسے اندھے شہر میں ہم کیا بصارت مانگتے

۲۲ مئی کے اجلاس میں طے شدہ فیصلہ کے مطابق 11 جون ۱۹۷۲ء کو تنظیم کا پہلا باقاعدہ اجلاس ڈاکٹر ماجد نوروز عابدی کی رہائش گاہ پر ہوا۔ جس میں پہلی بار تین علماء کرام مولانا سید صادق علی نجفی، مولانا سید مرتضیٰ حسین صدرالافاضل اور مولانا سید آغا علی موسوی نے شرکت فرمائی۔ اس اہم اجلاس میں تمام تعلیمی اداروں سے شیعہ طلباء تنظیموں نے بھرپور نمائندگی کی جبکہ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج سے برادر مرغوب زیدی، برادر بابر نقوی اور برادر محمد علی نقوی شریک ہوئے۔

تمام شرکاء میں سے برادر علی رضا نقوی انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور اور برادر محمد علی نقوی کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج نے دستور پر خاصی دلچسپ اور پرمعنی بحث کی۔

اس موقع پر دستور ساز کمیٹی نے جب حاضرین کے سامنے دستور پیش کیا تو برادر خیر محمد بدھ اور برادر اعجاز رسول نگری جو لاء کے طالب علم تھے نے قانونی شق پیش کی کہ ''فیڈریشن'' اور ''ایسوسی ایشن'' کبھی ایک دوسرے میں ضم نہیں ہوسکتیں۔ اس نکتہ کے بعد خاصی سراسیمگی پھیلی، آخر سوچ بچار کے بعد مولانا سید علی موسوی سے استخارہ کی استدعا کی گئی۔ مولانا صاحب نے

استخارہ کیا تو آئی۔ایس۔او کے نام کی تائید ہوگئی مولانا مرتضیٰ حسین صاحب نے ''امامیہ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن پاکستان'' کے نام کا اعلان کیا اور فرمایا بہت اچھا نام ہے خدا برکت فرمائے، برادران کو بھی اس کا مخفف (ISO) بہت پسند آیا کیونکہ علم کیمیا میں آئی سو (I-S-O) کا مطلب ''ایک جیسا'' ہونا ہے۔

اس موقع پر امامیہ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کی پہلی عبوری کابینہ کا اعلان ہوا تو برادر سید مرغوب زیدی مرکزی صدر برادر خیر محمد بدھ نائب صدر، برادر شیخ نوازش علی جنرل سیکرٹری برادر علی رضا نقوی جوائنٹ سیکرٹری، برادر فیض بخش لائبریری سیکرٹری محمد کاظم حسنین نقوی پبلسٹی سیکرٹری اور برادر محمد علی نقوی آفس سیکرٹری منتخب ہوئے۔ آئی۔ایس۔او پاکستان کے پلیٹ فارم پر پہلا پروگرام ''یوم حسینؑ'' پنجاب یونیورسٹی کے سیمینار ہال میں منعقد ہوا جس میں حنیف رامے جو اس وقت صوبائی وزیر خزانہ تھے، مولانا مفتی جعفر حسین، مولانا سید مرتضیٰ حسین صدرالافضل اور مولانا سید صادق علی نجفی صاحب نے خطاب فرمایا۔ اس پروگرام سے عوامی سطح پر تنظیم کو پذیرائی ملی اور یوں ملک کے بڑے تعلیمی ادارے میں پہلی بار آئی۔ایس۔او متعارف ہوئی۔

اس کے بعد لاہور اور دیگر شہروں میں تنظیم کے تعارف کے لئے کیلنڈر شائع کرایا گیا جس میں امام حسین علیہ السلام کے روزہ مبارک کی تصویر تھی اور نیچے تنظیم کا نصب العین اور نام تحریر تھا۔

اس کیلنڈر کی اشاعت کے پیچھے ڈاکٹر محمد علی نقوی کا جذبہ کارفرما تھا۔ انھوں نے نثار آرٹ پریس لاہور سے یہ کیلنڈر شائع کروایا تھا اور کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے گیٹ پر کرسی پر چڑھ کر اسے فروخت کیا تھا۔ چونکہ اس وقت ملک میں فرقہ واریت کی زہرناکی پھیلی تھی اس لئے یہ خوبصورت کیلنڈر بہت سے اہل سنت برادران نے بھی خریدا اور پسند کیا۔

جب لاہور میں زیر تعلیم طلباء تعطیلات میں اپنے اپنے شہروں کو گئے تو وہ یہ کیلنڈر بھی ساتھ لے گئے یوں آئی۔ایس۔او کی خوشبو ملک کی فضاؤں میں پھیل گئی اور برادران نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔

خدا کرے تیرے روز روشن کی دلکشی میں نہ فرق آئے

☆☆☆☆☆☆

آئی۔ایس۔او کا رخت سفر اور سفیر انقلاب

شب تاریک رشک روز ہوگی عزم پیہم سے
ہم اپنی جستجو کو ماہ کامل کر کے چھوڑیں گے

اس عزم وفکر کے امین مٹھی بھر نوجوان قومی درد کا زخم سینے پر سجا کر ہواؤں کی مخالف سمت کو چلے اور ''حی علی خیر العمل'' کا نعرہ لگاتے ہوئے منزل کی جانب رواں ہوئے۔اس مختصر قافلہ کی صدا میں اتنا درد تھا کہ خوابیدہ لوگ بیدار ہوئے اور بیدار، متحرک ہو گئے۔

تاریخ گواہی دیتی ہے کہ کربلا کے ان زخمی مسافروں میں نحیف جسم کا مالک ایک ''سفیر انقلاب'' بھی تھا جو قوم کے نوجوانوں کو بار بار یہ صدا دے رہا تھا۔

اب وقت آ گیا ہے کہ ساحل کو چھوڑ کر
گہرے سمندروں میں اتر جانا چاہیے

ابھی یہ خاک نشیں چلے ہی تھے کہ اس وقت کے تخت نشینوں سے سامنا ہو گیا۔ ۱۹۷۲ کا واقعہ ہے کہ ملت جعفریہ جو اس وقت ''شیعہ مطالبات کمیٹی'' کے پلیٹ فارم سے متحرک تھی اور جس کی قیادت سید محمد دہلوی فرما رہے تھے کو حکومت کی بعض پالیسیوں سے اختلاف ہو گیا۔ چنانچہ شیعہ قائدین، وفاقی وزیر تعلیم حفیظ پیرزادہ سے شیعہ طلباء کے لئے علیحدہ اسلامیات، اوقاف اور عزاداری کے مسائل پر مذاکرات کرنے راولپنڈی پہنچے۔اس اہم اور حساس اجلاس کی اطلاع آئی۔ایس۔او کے برادران کو علامہ مرتضیٰ حسین صاحب کے ذریعہ موصول ہوئی تو برادر علی رضا نقوی جوائنٹ سیکرٹری اور برادر شیخ نوازش علی جنرل سیکرٹری پروگرام کے مطابق ڈاکٹر اجمل حسین کی رہائش گاہ پر پہنچ گئے۔ بھاری بھرکم شخصیات کے مالک قائدین نے ان دونو جوانوں کا تعارف چاہا تو برادران نے اپنا تنظیمی تعارف کرایا۔اس موقع پر بعض قائدین نے حوصلہ افزائی کی اور بعض نے اہمیت نہ دی۔

طے شدہ وقت کے مطابق یہ قافلہ وزیر اعظم سیکرٹریٹ پہنچا وعدہ کے باوجود پیرزادہ صاحب وقت پر نہ آئے تو ان کے سیکرٹری نے ان کی نمائندگی کرتے ہوئے شیعہ قائدین سے پیرزادہ کی عدم آمد پر معذرت کی اور عذر پیش کیا کہ وہ قومی اسمبلی کے اہم اجلاس میں مصروف ہیں۔قائدین کو یہ بات ناگوار گزری مگر وہ خاموش رہے۔ایسے میں آئی۔ایس او کے برادران اٹھے اور انھوں نے سیکرٹری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا'' حفیظ پیرزادہ صاحب نے چند قائدین کی بے عزتی نہیں کی بلکہ یہ پوری ملت جعفریہ کی تذلیل ہے اور ہم اس ہزیمت کا بدلہ لیں گے'' سیکرٹری نے نوجوانوں کا تعارف چاہا تو انھوں نے بتایا کہ وہ شیعہ طلباء کی ملک گیر تنظیم آئی۔ایس۔او کی نمائندگی کر رہے ہیں۔لہٰذا وہ تعلیمی اداروں میں وزیر تعلیم کے رویہ کے خلاف احتجاج کریں گے۔

یہ سن کر سیکرٹری واپس گیا اور قومی اسمبلی کے اجلاس سے حفیظ پیرزادہ کو لے آیا۔مذاکرات ہوئے اور مطالبات تسلیم کیے گئے۔

آئی۔ایس۔او کے برادران کی جرأت کو دیکھ کر قائدین خاصے متاثر ہوئے انھوں نے

پذیرائی کی اور اپنے پتہ جات دے کر رابطہ کی خواہش کا اظہار فرمایا۔ مرکزی قائدین کیساتھ آئی۔ایس۔او کے برادران کی پہلی میٹنگ نے اس قدر اچھا تاثر قائم کیا کہ پھر ہر اہم اجلاس میں آئی۔ایس۔او کو نمائندگی دی جانے لگی۔

جب یہ برادران سرخرو ہو کر لوٹے تو احباب کے حوصلوں کو اٹھان ملی جبکہ کچھ ساتھیوں کا خیال تھا کہ انھیں پہلے تعلیمی اداروں میں مستحکم ہونا چاہیے پھر کہیں جا کر مرکزی قومی اجلاس میں شرکت اور دعوے کرنے چاہئیں۔ مگر ڈاکٹر محمد علی نقوی نہ صرف اس قدم پر بے حد خوش ہوئے بلکہ زندگی بھر تنظیم کی پہلی فتح کا فاتحانہ انداز میں ذکر فرماتے رہے۔ بڑے بڑے معرکے سر کرنا ان کا عشق اور بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کرنا ان کی جستجو رہی ہے وہ خود بھی اس نظریہ پر کاربند رہے اور عمر بھر ساتھیوں کو بھی یہ درس دیتے رہے۔ کہ

زندگی کے ابتدائی دور میں بھی کم سے کم
آدمی کو عرش تک پرواز کرنا چاہیے
اور جب جنبش میں آجائیں پرو بال حیات
عرش سے پرواز کا آغاز کرنا چاہیے

آغاز سفر میں جن مشکلات نے اس کارواں کی راہ میں سر اٹھائے اور کسی حد تک حائل ہوئیں وہ تعلیمی اداروں میں شیعہ طلباء کو اپنے اہداف کی طرف مائل کرنا تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب پیپلز پارٹی کا طوطی بول رہا تھا۔ عوام نظریاتی طور پر دو دھڑوں میں تقسیم تھے۔ ایک طرف مذہبی جماعتیں روایتی طور پر سینہ سپر تھیں جبکہ دوسری جانب سوشلزم کا سحر طاری تھا۔ پاکستان کے درماندہ عوام سوشلزم کی طرف مائل تھے جبکہ اہل تشیع ''حب علی کم بغض معاویہ زیادہ'' کی بنا پر ذوالفقار علی بھٹو کے طلسم میں آچکے تھے۔ یہی صورتحال تعلیمی اداروں کی تھی طلباء بھی واضح طور پر دو حصوں میں بٹ چکے تھے ایک طرف ''اسلامی جمعیت طلبہ'' تھی جبکہ دوسرا گروہ کمیونزم اور سوشلزم کا تھا۔ شیعہ طلباء کی اکثریت دوسرے بلاک میں تھی اور جذبات کی رو میں بہے جا رہے تھے۔ لہٰذا ایسے میں انھیں اس بلاک سے جدا کر کے اسلامی اقدار کے دائروں میں لانا

خاصا مشکل کام تھا۔

اس صورتحال میں آئی۔ایس۔او کے بعض بانی برادران کا خیال تھا کہ ابتدائی مرحلہ میں اپنے طلباء کو دیگر طلباء سے جداء کر کے کمزور نہیں کرنا چاہیے بلکہ ان سے اپنی استطاعت کے مطابق کام لیتے رہنا چاہیے۔ مگر ڈاکٹر محمد علی نقوی کا نظریہ روز اول سے بڑا واضح تھا کہ ''ہم تعداد میں چاہے کتنے ہی کم ہوں مگر ہمارا ہر قدم اسلام کی راہ میں اٹھنا چاہیے کمیونزم اور سوشلزم چاہے کسی روپ میں ہوں اسلام سے متصادم ہیں لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے طلباء کو اسلام کے مفاہیم سے آگاہ کریں۔''

سفیر انقلاب ڈاکٹر محمد علی نقوی چونکہ عالم زادہ ہونے کے علاوہ علامہ سید صفدر حسین نجفی کے تربیت یافتہ تھے اس لئے ان کی رگ رگ میں اسلام کی روح سموئی ہوئی تھی۔ وہ آئی۔ایس۔او میں پہلے نوجوان تھے جو آغاز ہی میں نظریہ اسلام سے واقف اور اسلامی احکامات کے سختی سے پابند تھے۔ آئی۔ایس۔او میں پہلے باریش نوجوان ہونے کا اعزاز بھی انھیں حاصل تھا اور عبادات خدا میں گریہ کا شرف بھی انہی کے حصہ میں جاتا تھا۔

آپ کے تقویٰ، اسلام شناسی اور خلوص کی بدولت تعلیمی اداروں میں تعارف تنظیم اور دروس کی ذمہ داری آپ کو تفویض کی گئی۔ آج بھی اگر ۱۹۷۲۔۱۹۷۳ کا تنظیمی ریکارڈ ملاحظہ فرمائیں تو جا بجا ڈاکٹر صاحب کے دروس کے حوالے دکھائی دیتے ہیں۔ آپ نے اس وقت کے طلباء سے جذبات سے نہیں بلکہ دلائل کے ساتھ اپنا نظریہ منوایا کمیونزم سوشلزم کے علمبردار ''لینن اور ماوزے تنگ'' کے مقابلہ میں اسلام کے محسن محمد عربیؐ اور شہید انسانیت حضرت امام حسینؑ کو پیش کیا۔ آپ کے دلائل میں اتنا وزن تھا کہ ہر باشعور طالب علم کو قائل ہونا پڑا اور آپ کے خلوص میں اتنا اثر تھا کہ قوم کا درد رکھنے والے ہر شخص نے شاملِ کارواں ہونے کا عزم کیا دیکھتے ہی دیکھتے احساس کے چشمہ سے پھوٹنے والا پانی دریا کی موجوں کی صورت اختیار کر گیا جن کے ساحل سے ٹکرانے کی صدا پیغام بن کر دور تک سنائی دینے لگی۔

جس میں خلوص فکر نہ ہو وہ سخن فضول
جس میں نہ دل شریک ہو اس لئے میں کچھ نہیں

آئی۔ایس۔او کے چمن میں جب کلیاں کھلنے لگیں اور پھول اپنا روپ دھارنے لگے تو ان کے سینوں سے نکلی ہوئی خوشبو فضاؤں میں پھیلی اور قوم کے روایتی رہنماؤں کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ بہت سے قائدین کی یہ خواہش رہی کہ یہ خوشبو ان کے قیادتانہ لباس پر رہے اور وہ حکومتی ایوانوں

میں اس کا احساس دلوا سکیں۔ مگر ان کی یہ خواہش ان کے ارمان بن کر رہ گئی کیونکہ اس تنظیم کی سرپرستی علماء حقہ کو نصیب تھی جو مفادات کی حدود سے بہت آگے نکل چکے تھے۔

ان حالات میں چند معتبر رہنماؤں نے آئی۔ایس۔او کو خریدنے اور بغل بچہ بنانے کی کوششیں بھی کیں جو یکسر ناکام رہیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ تنظیم کو مالی مشکلات کا سامنا ہوا اور پے در پے دفاتر بھی تبدیل کرنے پڑے۔ برادران نے ہر مشکل برداشت کی، نشیب و فراز کے کئی مراحل عبور کیے مگر ہر موڑ اور ہر قدم پر اپنے حلف پر قائم رہے اور آج بھی اپنے تنظیمی احباب پر وہ واضح کرتے ہیں کہ

قیادتوں کے جنوں میں جن کے قدم لہو سے رنگے ہوئے تھے
ہمارے بس میں نہیں تھا یارو کہ ان کو عزت مآب کہتے

۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۶ء تک تنظیم کا مرکزی دفتر گنپت روڈ اور ریٹی گن روڈ سے ملتان روڈ جعفریہ مسجد لاہور تک لڑکھڑاتا رہا۔ جگہ کی کمی کے باعث احباب نے یہاں خاصے مسائل جھیلے ۱۹۷۶ء میں ڈاکٹر صاحب مرکزی صدر بنے تو مرکزی دفتر کو اپنے گھر سے متصل مکان ۱۴۶۔ بھلہ سٹاپ۔ ملتان روڈ پر لے آئے جہاں بارہ سال تک تنظیم نے قیام کیا، آپ کی شفقت اور نگرانی میں پروان چڑھی اور یہاں سے شباب تک پہنچی۔

توسیع تنظیم:

۱۹۷۴ء تک آئی۔ایس۔او پاکستان لاہور کے تعلیمی اداروں تک محدود رہی تاہم

لاہور میں اس کے یونٹس خاصے نکھر کر سامنے آئے۔ یونٹس اور مرکز کے روابط کا ڈھانچہ مستحکم ہوا تو احباب نے توسیع تنظیم کی ٹھانی۔ دو سالوں میں تنظیم ملک کے اہم شہروں تک متعارف ہو چکی تھی مگر اس کا تعارف اہم افراد تک محدود تھا۔ طے پایا کہ مرکزی برادران پنجاب کے اہم شہروں کا دورہ کریں وہاں کے قائدین اور طلباء سے ملیں اور ان تک اپنا پیغام پہنچائیں۔ چنانچہ اپنا پیغام محبت پہنچانے کے لئے لاہور سے برادر علی رضا نقوی، برادر نیاز حسین نقوی، برادر زاہد حسین بخاری، برادر گل محمد نقوی اور برادر شبر عباس صدیقی عازم سفر ہوئے۔ یہ قافلہِ درد ساہیوال، خانیوال، ملتان، ڈیرہ غازی خان، لیہ اور بھکر کے دور دراز علاقوں تک پہنچا۔ ہر شہر میں پڑھے لکھے اور ملی درد رکھنے والے افراد سے ملا، اپنا پیغام پہنچایا اور پذیرائی حاصل کی۔ جہاں بھی یہ برادران پہنچے۔ ''حی علی خیر العمل'' کی صدا بلند کی۔ لوگ ان کے قریب آئے تو انھوں نے انھیں متوجہ کیا۔

ہماری بات سنو اور ہمارے ساتھ چلو
ہماری بات ہی اک دن بنے گی افسانہ

لوگوں نے اس قافلہ کے پیغام کو بغور سنا، جذبوں کو سراہا، تعاون کا یقین دلایا، ہمت، حوصلے اور دعائیں دیں۔ پنجاب کے شاداب کھیتوں سے روانہ ہونے والا یہ کارواں ڈیرہ غازی خان کے میدانوں سے ہوتا ہوا بھکر کے ریگستانوں تک پہنچا تو ہر مقام پر پذیرائی میں اضافہ ہوا۔ حوصلوں کو تقویت ملی تو یہ برادران اپنا تنظیمی گیت۔

اونچا رہے اپنا علم حی علیٰ خیر العمل
بڑھتے رہیں یونہی قدم حی علیٰ خیرالعمل

گاتے ہوئے راولپنڈی پہنچ گئے۔ وہاں بھی اپنا پیغام پہنچایا، شفقتیں اور عقیدتیں وصول کیں۔ ایک طویل دورہ کرنے کے بعد یہ قافلہ گنگناتا اور چہچہاتا لاہور پہنچا، مرکز کو اپنی رپورٹ پیش کی تو خوشی سے احباب کی پلکیں بھیگ گئیں۔

ڈاکٹر محمد علی نقوی نے داستانِ سفر سننے میں اتنی دلچسپی لی کہ بعض برادران کو اپنے گھر لے

گئے اور ان سے شب بھر مسافتوں کا حال پوچھتے رہے اور بعض برادران کے گھر یا ہاسٹلز کے کمروں میں جا کر ان سے روداد سنی۔ داستان کی لذت سے اس قدر محظوظ ہوئے کہ لائل پور (فیصل آباد) کے دورہ کے لئے کمر باندھ لی۔

لائل پور کے پہلے تنظیمی دورہ میں ڈاکٹر صاحب نے میر کارواں کا کردار ادا کیا اور وہاں کی شخصیات اور طلباء کو مل کر اپنے اہداف سے متعارف کرایا۔ لائل پور میں پہلے سے شیعہ طلباء خاصے متحرک تھے اور انھوں نے ''انجمن محبان اہل بیتؑ'' کے پلیٹ فارم پر کام کا آغاز کیا ہوا تھا۔ لہٰذا انھیں مذہبی میدان میں کام کرنے کے لئے آمادہ کرنے میں دقت پیش نہ آئی البتہ ان کی تنظیم کو آئی۔ایس۔او میں ضم کرنے میں خاصی مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔

آئی۔ایس۔او کے برادران کا موقف تھا کہ لائل پور کے برادران معمول کے مطابق کام کرتے رہیں البتہ ان کا تشخص آئی۔ایس او کے حوالہ سے ہو اور وہ مرکزی تنظیم کی نمائندگی کریں۔ جبکہ ''انجمن محبان اہل بیتؑ'' کے مرکزی قائدین مرکزی پلیٹ فارم کے قائل ہونے کے باوجود بھی اپنی تنظیم کو تحلیل یا ضم کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ ان کا نظریہ تھا کہ لوگ ان کے اس پلیٹ فارم پر زیادہ معاون ہیں اور وہ تیزی سے ترقی کر رہے ہیں۔ طویل بحث کے بعد ''انجمن محبان اہل بیتؑ'' کے چند برادران آئی۔ایس۔او میں ضم ہونے پر متفق ہو گئے جبکہ چند مرکزی برادران نے تعاون کی حامی نہ بھری۔

۱۹۷۴ء میں انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور کے زیر اہتمام فارغ التحصیل طلباء کے اعزاز میں الوداعی پارٹی ہوئی تو ڈاکٹر محمد علی نقوی نے لائل پور کے برادران کو خصوصی دعوت دی۔ اس موقع پر یہ برادران خاصے متاثر ہوئے اور آئی۔ایس۔او میں ضم ہونے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے ایک بار پھر لائل پور (فیصل آباد) کا دورہ کیا اور آئی۔ایس۔او کی بنیاد رکھی۔

۷۵۔۱۹۷۴ کے مرکزی صدر کے لئے انتخابات ہوئے تو برادران آئی۔ایس۔او نے لائل پور زرعی یونیورسٹی کے طالب علم سید ناصر حسین نقوی کو مرکزی صدر منتخب کیا اور یوں لاہور کے بعد تنظیم لائل پور میں خاصی مضبوط ہو گئی۔

برادر سید ناصر حسین نقوی کی کابینہ میں ڈاکٹر محمد علی نقوی بحیثیت مرکزی جنرل سیکرٹری لئے گئے۔ جبکہ اس سے پہلے وہ نشر و اشاعت سیکرٹری، آفس سیکرٹری اور جوائنٹ سیکرٹری کے عہدوں پر کام کرتے رہے۔ احباب کے بقول کہ ڈاکٹر صاحب کو آفس سیکرٹری کی ذمہ داری ہمیشہ اچھی لگتی تھی ان کا خیال تھا کہ جس تنظیم کا مرکزی آفس جس قدر مستحکم اور یونٹس سے مربوط ہوگا وہ تنظیم اسی قدر ترقی کرے گی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ انھوں نے دو سال میں تنظیمی ڈھانچے اور امور کی اس خوش اسلوبی سے انجام تک پہنچایا کہ تنظیم کی جڑیں مضبوطی پکڑ گئیں۔

جب آپ مرکزی جنرل سیکرٹری بنے تو تمام عہدیداران سے زیادہ متحرک اور فعال نظر آئے۔ لاہور کی سطح پر کہیں بھی کوئی تنظیمی اجلاس ہوتا تو ڈاکٹر نقوی اپنی موٹر سائیکل پر سب سے پہلے پہنچے ہوتے۔ بقول برادر سید ناصر حسین نقوی کہ وہ اگرچہ مرکزی صدر تھے مگر انھیں بھی متحرک رکھنے میں ڈاکٹر محمد علی نقوی کا ہاتھ تھا۔ وہی طلباء سے مربوط رہتے، وہی نشر و اشاعت کرتے اور بڑے بڑے پروگرام منعقد کراتے۔ ان کے تحرک کا یہ عالم تھا کہ اس وقت کے احباب انھیں مٹی کا نہیں بلکہ لوہے کا بنا ہوا انسان سمجھتے تھے۔

۱۹۷۵ء میں پہلی بار آئی ایس او کے تنظیمی دامن میں وسعت آئی اور تنظیم لاہور سے نکل کر فیصل آباد پہنچی۔ فیصل آباد کے تعلیمی اداروں میں لاہور کی طرز کا کام کیا گیا اور ایک سال کے اندر اکثر درسگاہوں میں آئی۔ایس۔او کے یونٹس قائم ہوگئے اس کے ساتھ ہی ملتان، راولپنڈی اور پشاور میں مصروف کار ہوگئی۔

تنظیم سازی کے پورے سفر میں ڈاکٹر محمد علی نقوی نمایاں رہے وہ جہاں بھی جاتے گفتگو میں دلائل کے انبار لگا دیتے۔ انھیں خدا نے مسکرا کر دل میں اتر جانے کا انداز عطا فرمایا تھا۔ تنظیمی اہداف میں وہ بڑے واضح تھے۔ اسلامی اقدار پر بحث کا بھی انھیں ملکہ حاصل تھا۔ وہ اتنی پرخلوص اور لطیف گفتگو کرتے کہ سننے والے ان کے عقیدت مند بن جاتے اور عقیدت مندان کے کارواں کی طاقت بنتے۔

انھوں نے اپنا پیغام پہنچانے میں مشکلات کے طویل صحرا عبور کیے اور مصائب کے کوہ سر کئے۔ وہ آئی۔ایس۔او کے پہلے نمائندہ تھے جو پاراچنار (کرم ایجنسی) کے پہاڑوں کے دامن میں پہنچے اور وہاں کے نوجوانوں پر واضح کیا۔ کہ عزیز دوستو۔۔۔

دلوں میں فاصلے اتنے نہیں ہیں
زمانہ درمیاں آیا ہوا ہے

خیبر میں تنظیمی کامیابی کے پرچم گاڑنے کے بعد یہ سفیر انقلاب کراچی پہنچا اور وہاں ''ڈاؤ میڈیکل کالج'' میں ایک دوست کے ذریعہ اپنا پیغام پہنچایا، آپ اپنے اس دوست کو لاہور بھی لائے اور اسے پیغامبر ہونے کے اسلوب سکھائے۔ وہ واپس کراچی گئے تو انھوں نے تنظیم کی توسیع میں مثالی کردار ادا کیا۔

۱۹۷۵۔۷۶ء میں آئی۔ایس۔او ملک بھر میں پھیلی تو اس کا چوتھا سالانہ کنونشن دفتر سے نکل کر پنڈالوں میں آ گیا۔ یہ آئی۔ایس۔او کا پہلا کنونشن تھا جو ''جامعۃ المنتظر لاہور'' میں منعقد ہوا جس کا سلسلہ تا حال جاری ہے۔ جبکہ اس سے قبل تنظیم کے پہلے کنونشن ریٹی گن روڈ پر ہوئے۔ اس کنونشن میں مختلف ڈویژنز سے سینکڑوں طلباء شریک ہوئے تو آئی۔ایس۔او کے بانیان اور مرکزی رہنما بے پناہ خوش ہوئے۔ ڈاکٹر محمد علی نقوی تو اس قدر پرمسرت تھے کہ وہ ہر ساتھی کو خوش آمدید کہنے کے ساتھ ساتھ ان کے سینوں پر آئی۔ایس۔او کے ''بیجز'' لگاتے رہے۔ وہ کنونشن کے سٹیج سیکرٹری بھی تھے اور منتظم بھی۔۔۔ اس موقع پر ان کے جذبات ان کی آنکھوں سے نمایاں تھے اور ان کا جوش و عزم ان کے لہجے سے ٹپک رہا تھا۔ وہ احباب کے سامنے جب بھی سٹیج پر آتے تو جذبات اور عزم میں ڈوب کر کہتے۔

ابر پاروں پہ چلو، چاند ستاروں پہ اڑو
یہی اجداد سے ورثہ میں ملا ہے تم کو

کنونشن کے پروگرام ختم ہوتے تو چاک و چوبند اور کانوں میں لہجے کی مٹھاس کا رس گھولنے

والاسفیرانقلاب برادران کے حلقوں میں آتا۔۔۔ ہرایک کو گلے لگاتا، ان کی تکالیف دریافت کرتا، ان کے تاثرات لکھتا، مشکلات پران سے معذرت چاہتا اوران کی خدمت کے لئے رواں ہوجاتا۔۔۔ دن بھر وہ تنظیمی امور بجالاتا، رات کوخوردونوش کے اہتمام کرتا اوراگراسے وقت مل جاتا تو وہ برتن تک صاف کرتا۔۔۔ جب رات کواحباب سوجاتے توحسینؑ کے اس پیغامبر کی فکر عشق کی مستی میں گنگناتی۔

کربلا سے انس ہے نجف سے لگاؤ ہے
دھڑکنوں میں آج بھی عشق کا الاؤ ہے
رنگ بھر رہا ہوں میں خاکہ حیات میں
آج بھی ہوں منہمک فکر کائنات میں
حرف حق عزیز ہے ظلم ناگوار ہے
عہدنو سے آج بھی عہد،استوار ہے

دل ابھی بجھا نہیں
غم ابھی لٹا نہیں
میں ابھی مرا نہیں

☆☆☆☆☆

سفیرانقلاب کی مرکزی صدارت

۷۷۔۱۹۷۶ کے دورانیہ کے لئے جب مرکزی صدر کے امیدوار کے انتخاب کا مرحلہ آیا تو مجلس عاملہ، مجلس مشاورت اور سینئر برادران کی نظروں میں ڈاکٹر محمد علی نقوی سے زیادہ مناسب امیدوار کوئی نہ جچا۔ جب آپ سے برادران نے اظہار فرمایا کہ وہ اگلے سال کے لئے ان کی ذات کو بطور امیدوار برائے مرکزی صدر لانا چاہتے ہیں تو آپ نے معذرت کی اور فرمایا ''مرکزی صدر بننا میرے مزاج کا حصہ نہیں ہے اور نہ ہی میں خود کو اتنی بڑی مسئولیت کے قابل سمجھتا ہوں۔''

جب آپ نے تمام برادران کو واضح الفاظ میں انکار کیا تو مجلس مشاورت کے معزز رکن سید امجد علی کاظمی ایڈووکیٹ نے آپ سے گلاب دیوی ہسپتال لاہور میں ملاقات کی جہاں آپ اپنی پھوپھی کی تیمارداری میں مصروف تھے۔ کاظمی صاحب کئی گھنٹوں تک آپ پر تنظیمی ضرورت اور حالات کے تقاضوں کو واضح کرتے رہے مگر آپ نہ مانے۔ جب تنظیمی احباب اور مجلس مشاورت کے اراکین کے تقاضے بڑھے تو آپ نے استخارہ کرنے کی استدعا کی۔ استخارہ حق میں

آیا تو آپ بطور امیدوار رضامند ہو گئے۔

اس وقت طریقہ انتخاب آج سے قدرے مختلف ہوتا تھا۔ مجلس مشاورت جو آج مجلس نظارت ہے۔ مرکزی صدارت کے لئے ایک نام، طلباء کے سامنے پیش کرتی اس پر ''Yes'' یا ''No'' لکھنا پڑتا تھا۔ گویا وہ انتخاب ایک ریفرنڈم ہوتا تھا۔ چنانچہ جب طلباء کے سامنے آپ کا نام پیش کیا گیا تو تمام طلباء نے آپ کی حمایت میں ووٹ ڈالے۔

جب بطور مرکزی صدر آپ کو سٹیج پر لایا گیا تو آپ اشکبار تھے۔ سید امجد علی کاظمی رکن مجلس مشاورت نے آپ سے حلف لیا۔ حلف کے دوران جب یہ جملے آئے کہ ''میں خدا رسولؐ اور امام زمانہؑ کے روبرو اقرار کرتا ہوں'' تو آپ کی آواز گلے میں دب گئی اور آپ دیر تک سسکیاں لیتے رہے۔ آپ ایک دفعہ حلف لینے کے بعد تمام عمر اسی حلف پر قائم رہے۔ آپ اکثر فرمایا کرتے تھے ''دوستو! بھائیو! حلف عہدہ کے ایک سال کے لئے نہیں ہوتا بلکہ حلف کا تعلق زندگی سے ہوتا ہے''۔

آپ چونکہ صاحب تقویٰ تھے اس لئے آپ نے اپنے مرکزی صدارت کے عرصہ کو تربیت کا سال قرار دے کر نوجوانوں کی کردار سازی کی۔ علماء کرام سے مضبوط ربط اور نوجوانوں کا نماز تہجد پڑھنا آپ کی محنتوں کا ثمر تھا۔ اس لئے کہ علماء آپ کی مستحکم بنیادوں پر تربیت کرتے رہے۔ انھوں نے علماء کے بڑے بڑے اجتماعات میں آپ کو متعارف کرایا اور بین الاقوامی سطح پر ہونے والے قومی معاملات سے آپ کو مربوط رکھا۔

۱۹۷۶ء میں جب عراق کے علماء پر حکومت کی جانب سے تشدد ہوا تو ڈاکٹر صاحب نے پہلی بار آئی۔ ایس۔ او کے پلیٹ فارم پر کسی بین الاقوامی مسئلہ کی حمایت کی اور عراق کی حکومت کے خلاف احتجاج کیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ایران میں اسلامی تحریک خاصی فعال تھی۔ مستقبل کا ادراک رکھتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کا معمول تھا کہ آپ اپنی موٹر سائیکل LES 2629 پر علماء کرام کو پروگرام میں لاتے اور نوجوانوں میں اسلامی فکر کو بیدار کرتے۔

طلباء کی کردار سازی کے ساتھ آپ نے افراد سازی پر خاصی محنت کی اور ایک سال کے

عرصہ میں تنظیم کے معیار کے مطابق نوجوان پیدا کیے۔ آج یہ بات دعویٰ سے کہی جاسکتی ہے کہ آپ نے اپنی تنظیمی زندگی میں جتنے افراد پیدا کیے وہ قوم کی نظریاتی فوج کے طور پر آج بھی قومی امور میں بدستور متحرک ہیں۔

ایک مرتبہ آپ نے کردارسازی کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے ایک واقعہ نقل فرمایا جسے سن کر نوجوانوں نے اپنی روش بدل ڈالی۔ وہ واقعہ یوں تھا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کا ایک شاگرد کئی سالوں تک آپؑ کی خدمت کرنے کے بعد جب اپنے وطن جانے لگا تو اس نے امامؑ سے اجازت چاہی ''مولا جو کچھ میں نے آپ سے سیکھا ہے کیا مجھے لوگوں میں اس کے پرچار کی اجازت ہے'' امامؑ نے اپنے شاگرد کی یہ بات سن کر زبان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا'' اجازت ہے مگر اس سے نہیں ہماری تعلیمات کو کردار سے واضح کرو۔''

جس سال آپ کو مرکزی صدر کی ذمہ داری سونپی گئی تعلیمی حوالے سے آپ کا آخری سال تھا۔ آپ نے ابتدائی ایام میں بے پناہ دورہ جات کر کے تنظیم کو وسعت دی اور سالانہ پروگرام کی بنیاد رکھی۔ آپ نے اسی سال تنظیم کا مجلہ ''امامیہ نیوز بلٹن'' شائع کرنے کا ارادہ کیا۔ جب ایم۔بی۔بی ایس کے آخری امتحان کا اعلان ہوا تو آپ نے پنجاب یونیورسٹی کے ہاسٹل ۲ میں سکونت اختیار کر لی۔

رشتہ ازدواج:

مارچ ۱۹۷۷ء میں آپ کا نکاح آپ کے تایا سید شبیر حسین نقوی کی صاحبزادی سے ہوا۔ آپ کا سسرال علی رضا آباد لاہور میں مقیم ہیں۔ سید شبیر حسین نقوی صاحب علاقہ کے معروف روحانی پیر سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی پیری مریدی کا سلسلہ بہت دور تک پھیلا ہوا ہے۔ سابق وزیراعلیٰ سندھ اور سابق وزیراعظم غلام مصطفیٰ جتوئی ان کے عقیدتمندوں میں سے ہیں اور ان کے ہاں حاضری دیتے رہتے ہیں۔

ان ایام میں ڈاکٹر صاحب دو حصوں میں تقسیم تھے آپ پڑھائی سے فارغ ہوتے تو تنظیمی

امور بجالانے کے لئے نکل جاتے اور رات گئے تک کام کرتے رہتے۔ جب آپ کا نکاح ہونے لگا تو خاندان کے افراد نے آپ کی عادت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ایک دن پہلے اطلاع دی کہ وہ ہاسٹل میں رہیں تاکہ نکاح کے وقت انھیں لاہور میں تلاش نہ کرنا پڑے۔ نکاح کی شب آپ کے بہنوئی سید اعجاز حسین نقوی اور آپ کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر عباس علی نقوی آپ کو رسم نبھانے کے لئے لینے گئے تو آپ نے خاصا مزاج کیا اور کہنے لگے'' یہ کن چکروں میں ڈال رہے ہو، اچھے خاصے آزاد تھے، اب رات کو گھر ضرور لوٹنا پڑے گا۔''

انہی ایام میں آئی۔ایس۔او کے بانی رکن برادر علی رضا نقوی کی شادی ہوئی تو ڈاکٹر صاحب دوستوں کے ساتھ ان کے ولیمہ میں پہنچے۔ اس موقع پر ان سے تنظیم کے لئے چندہ مانگا تو انھوں نے اپنے نوٹوں والے ہار پیش کر دیئے کئی روز تک ان نوٹوں سے کام چلتا رہا جب نوٹ ختم ہونے لگے تو ڈاکٹر صاحب نے دوستوں سے کہا'' کسی اور ساتھی کی شادی کی دعا کریں۔''

اکتوبر ۱۹۷۷ کو آپ ایم۔بی۔بی۔ایس کا امتحان دے کر فارغ ہوئے تو نومبر ۱۹۷۷ میں ہی آپ کی شادی طے پائی۔ ۸ نومبر شادی کے روز آپ تنظیمی پوسٹر چھپوانے میں مصروف تھے اور بارات کی روانگی سے تھوڑی دیر پہلے آپ کو پریس سے پکڑ کر لایا گیا۔

آپ کی شادی ہوئی تو خاصے خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ ''اب تو ہماری ایک ایک رکعت کنوارے نمازیوں کی ستر رکعتوں سے افضل ہوگئی'' جب بارات آپ کی رہائش گاہ ۱۴۶ بھلہ سٹاپ ملتان روڈ پہنچی تو آپ نے اسی دوران اپنے ایک تنظیمی دوست سے زیر چھپوائی پوسٹر کے رنگ اور پرنٹنگ کے بارے میں پوچھا بالفاظ دیگر شادی کی رسومات کے دوران میں آپ کے ذہن میں تنظیم کا پوسٹر گھومتا رہا۔

اہلیہ سے پہلی ملاقات ہوئی تو آپ نے ان پر واضح کیا کہ ''یہ میری دوسری شادی ہے'' بیگم خاصی پریشان ہوئیں تو آپ نے وضاحت کی کہ ''پہلی شادی تنظیم سے ہو چکی ہے لہٰذا گھر کو زیادہ وقت نہ دینے کا شکوہ نہ کرنا۔''

۹ نومبر کو آپ کا ولیمہ تھا مگر ولیمہ سے پہلے آپ نے پریس کا چکر لگایا اور پوسٹرز اٹھالائے۔

آپ نے اپنی دونوں شادیوں کوخوب نبھایا۔ پہلی شادی کے بتائے ہوئے راستوں پر چلے اور دوسری شادی کو اختیار کردہ راستوں پر چلایا۔ یہ فکر کی ہم آہنگی کا نتیجہ تھا کہ آپ نے ملک بھر میں نوجوانوں کی نظریاتی فوج تیار کی جب کہ آپ کی اہلیہ نے ملک کے دور دراز علاقوں کے دورہ جات کر کے خواتین کی فکر بیدار کی۔

آخر وہ وقت بھی آیا جب ڈاکٹر صاحب سے آپ کی اہلیہ نے آپ کے ساتھ ہر قدم ہونے کا فیصلہ کرتے ہوئے کہا'' آپ سفیر کربلا ہیں اور میں سفیر شام۔۔۔،آپ حسینؑ کی صدا کو ورد بنائیں میں زینبؑ کے خطبوں کو دہراتی ہوں۔۔۔آپ جوانوں کے شعور کو جلا بخشیں میں خواتین عصمت کی پامال ردائوں کے تقدس کی صدا دیتی ہوں۔۔۔،آپ کار حسینیؑ انجام دیں اور میں کار زینبیؑ ،آپ شہید باقر الصدر کی فکر عام کریں اور میں آمنہ بنت الہدیٰ کی سوچیں۔۔۔آپ محمدؐ وعلیؑ کا پیغام لے کر نکلیں اور میں خدیجہؑ و بتولؑ کے اسوہ کی علمبردار بن کر آپ کا ساتھ نبھاتی ہوں تا کہ انقلاب کسی مرحلہ پر رکنے نہ پائے۔آپ بھی خدا، رسولؐ اور آئمہؑ اطہار کے روبرو سرخرو ہوں اور میں بھی۔۔۔

شاہراہ زیست کے دونوں ہمسفر اپنے دروازے سے نکل کر قوم کے دروازوں تک پہنچے۔انھوں نے گھر میں بیٹھی ہوئی خواتین اور درسگاہوں میں زیر تعلیم طالبات کے ذہنوں پر دستک دیتے ہوئے فرمایا ؎

چلو کہ آج سبھی پامال روحوں سے
کہیں کہ اپنے ہرایک زخم کو زبان کرلیں
ہمارا راز، ہمارا نہیں سبھی کا ہے
چلو کہ سارے زمانے کو رازداں کرلیں

یہ آپ کی اہلیہ کے خلوص اور درد کا نتیجہ تھا کہ ملک بھر میں خواتین کے اندر انقلابی روح تڑپی اور انھوں نے آئی۔ایس۔او پاکستان (شعبہ طالبات) کا قیام عمل میں لایا۔جس کا مرکزی دفتر ڈاکٹر صاحب کا گھر بنا۔لہٰذا یہ کہنا ہرگز بے جا نہ ہوگا کہ آئی۔ایس۔او پاکستان (طلباء وطالبات) آپ کے

گھر میں پروان چڑھی۔یہاں سے بال وپر سنوارے گئے اور یہاں سے ہی اسے اڑان ملی۔

پیشہ وارانہ زندگی:

سفیرانقلاب ڈاکٹر محمد علی نقوی نے اپنی پیشہ وارانہ زندگی کا آغاز جنوری ۱۹۷۸ میں میو اسپتال لاہور سے کیا۔آپ نے ذہنی امراض کے ماہر پروفیسر اے۔کے ترین کے ساتھ چھ ماہ تک بطور ہاؤس سرجن اور فزیشن کام کیا اور ایک سال تک علامہ اقبال میڈیکل کالج کے پروفیسر افتخار احمد کی زیر سرپرستی میڈیکل کے میدان میں مہارت حاصل کی۔

پروفیسر اے کے ترین سکاٹری سوسائٹی (PHSYCHIATRY SOCIETY) کے صدر تھے اور وہ لاہور میں انٹرنیشنل سکاٹری کانفرنس منعقد کرا رہے تھے۔کانفرنس کے دن جوں جوں قریب آتے گئے پروفیسر صاحب کی پریشانی میں اضافہ ہوتا گیا۔ایک روز انھوں نے اپنی پریشانی کا ذکر ڈاکٹر محمد علی نقوی کے سامنے کیا تو آپ نے یہ کوئی مسئلہ نہیں کہہ کر ان کی پریشانی کافور کردی۔اپنے تنظیمی تجربات کی بنا پر آپ نے کانفرنس کا اس قدر اہتمام کیا کہ تمام شرکاء کو داد دینی پڑی۔

جولائی ۱۹۷۹ء میں آپ نے پبلک سروس کمیشن کے ذریعہ باقاعدہ گورنمنٹ سروس حاصل کی اور پہلی بار''سروسز اسپتال لاہور'' کے میڈیکل یونٹ میں بطور رجسٹرار تعینات ہوئے۔آپ نے اسی دوران میں M.C.P.S بھی کیا اور دو سال تک شعبہ بے ہوشی (ANAESTHESIA) میں کام کرتے رہے۔آپ نے یہاں سرجری میں خاصی مہارت حاصل کی اور ایک معروف ڈاکٹر کے حوالے سے پہچانے جانے لگے۔

آپ کا معمول تھا کہ آپ اپنی ڈیوٹی عموماً رات کو لیتے اور دن بھر تنظیمی کام کرتے رہتے۔ آپ یہاں چھ سال تک ملازم رہے، دکھی انسانیت کی بے لوث خدمت کی اور اسپتال کے عملہ پر خلوص اور کردار کے انمٹ نقوش چھوڑے۔

یہ انہی ایام کی بات ہے جب ایران کی سرزمین پر اسلامی انقلاب کا سورج طلوع ہو چکا تھا

اور پاکستان میں تحریک نفاذ فقہ جعفریہ وجود میں آ چکی تھی۔ چونکہ آپ کی ذات انقلابی سرگرمیوں کا محور تھی اس لئے آپ تمام حساس اداروں کی نظر میں تھے۔ اسلامی انقلاب ایران کی حمایت میں مظاہرے اور تحریک نفاذ فقہ جعفریہ کے حقوق کے لئے ضیاء الحق حکومت سے آپ کا ٹکراؤ ملک کی ایجنسیوں کی فائلوں میں آیا تو انھوں نے پنجاب کے وزیر صحت اور سیکرٹری کو آپ کے بارے میں اطلاعات فراہم کیں اور آپ کے تبادلہ کی سفارش بھی کی۔

ایجنسیوں نے حکومت پنجاب پر واضح کیا کہ یہ شخص لاہور سے باہر تعینات کیا جائے اور وہاں اس کی حاضری کو ضروری بنایا جائے۔ چنانچہ آپ کو لاہور سے ڈسٹرکٹ اسپتال قصور تبدیل کر دیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد آپ کا دوسرا تبادلہ ''نارنگ منڈی'' ضلع شیخوپورہ ہوا اور پھر تیسرا ٹرانسفر ''للہ ٹاؤن'' جہلم کر دیا گیا۔ آپ جہاں بھی گئے ایجنسیاں آپ کے تعاقب میں رہیں۔ انھوں نے آپ کی جانچ پڑتال کی اور مریضوں کے روپ میں آپ کے تاثرات نوٹ کیے۔ ایک اطلاع کے مطابق ان ایام میں آپ کی ڈاک بھی سنسر ہوتی رہی جن میں اہم خطوط کی فوٹو کاپیاں اور چند قائدین کے ساتھ آپ کی تصاویر پنجاب سیکرٹریٹ کو ارسال کی گئیں۔ جو آج بھی آپ کی ذاتی سروس فائل (Personal File) میں لگی ہوئی ہیں۔ اس فائل میں ان خطوط کی کاپیاں بھی موجود ہیں جو آپ اپنے قریبی احباب کو رازداری کے طور پر لکھا کرتے تھے۔ نہ جانے یہ کاپیاں ایجنسیوں کو کیسے مل جاتی تھیں۔۔۔؟

آپ نے ضلع قصور اور نارنگ منڈی اسپتال میں بادل ناخواستہ ملازمت کی۔ نارنگ منڈی آپ روزانہ آتے جاتے رہے اور دونوں اطراف سے آپ کو عموماً بس کی چھت پر بیٹھنا پڑتا تھا۔ جب آپ کا تبادلہ للہ ٹاؤن ہوا آپ نے حکومت پر واضح کیا کہ وہاں آپ کے تعلیمی معیار کی نوکری نہیں ہے۔ حکومت ایک سپیشلسٹ کو معمولی آسامی پر تعینات کر کے زیادتی کی مرتکب ہو رہی ہے۔

۱۹۸۶ء کی بات ہے جب تحریک نفاذ فقہ جعفریہ پاکستان کے قائد علامہ سید عارف حسین الحسینی نے ۱۶ مئی کو ''یوم مردہ باد امریکہ'' منانے کا اعلان کیا۔ ڈاکٹر صاحب چونکہ علامہ صاحب کے دست راست تھے اس لئے انھوں نے اپنے قائد کے فرمان کا احترام کرتے ہوئے لاہور کے

مظاہرے کی قیادت کی اور شاہراہ قائداعظم (مال روڈ) پر واقع ایک معروف کاروباری مرکزی ''الفلاح بلڈنگ'' کے اوپر چڑھ کر (DOWN WITH U.S.A) (مردہ باد امریکہ) کا طویل و عریض بینر لٹکایا۔

ملکی و غیر ملکی صحافیوں نے بینرز سمیت آپ کی تصاویر بنائیں جو قومی اخبارات میں بھی شائع ہوئیں۔ جس کے بعد حکومت پنجاب کو آپ کے خلاف ایکشن لینا پڑا اور یوں آپ ملازمت

سے برطرف کر دیے گئے۔

جن ایام میں آپ سرکاری ملازمت سے فارغ ہوئے ان دنوں عراق، ایران جنگ عروج پر تھی۔ ایران، عراق پر آخری ضرب لگانے کے لئے اپنے تمام وسائل استعمال کر رہا تھا۔ آخر ایک وقت ایسا آیا کہ امام خمینی رضوان اللہ علیہ نے امام زمانہ کی سرزمین سے ''صدائے ھل من ناصر'' ان الفاظ میں بلند کی ''ہر کس کی می تواند باید جبہ برود'' ''جو شخص جنگ کی طاقت رکھتا ہے وہ محاذ پر جائے۔''

نائب امام اور ولی فقیہ کی یہ صدا دنیا بھر میں گونجی تو پاکستان میں ڈاکٹر محمد علی نقوی نے اسے کربلا کی صدائے استغاثہ سمجھا اور محاذ جنگ پر پہنچ گئے۔ آپ نے زخمی مجاہدین کی خدمت اس انداز میں کی کہ آپ ''ڈاکٹر پریشان'' کے نام سے مشہور ہو گئے۔ ایرانی ڈاکٹر آٹھ گھنٹے جبکہ ڈاکٹر نقوی سولہ گھنٹے زخمیوں کے زخموں اور تکالیف کا علاج کرتے۔ چشم دید گواہان کے بقول کہ ڈاکٹر صاحب اپنی ڈیوٹی کے دوران انتہائی کم سوتے اور کم کھاتے جب آپ سے آرام کرنے کو کہا جاتا تو آپ جواباً کہتے ''میں خدمت کرنے آیا ہوں آرام کرنے نہیں۔''

جنگ کی آگ ٹھنڈی ہوئی تو آپ وطن واپس لوٹے اور ''ریڈ کریسنٹ اسپتال کالا باغ'' میں بطور میڈیکل آفیسر سروس اختیار کی۔ یہاں آپ نے اپنی پیشہ وارانہ مہارت اور دکھی انسانیت سے محبت کے طفیل خاصی شہرت پائی۔ آپ کی تنخواہ نو ہزار روپے تھی جس میں سے آپ چار ہزار گھر والوں کو اور باقی رقم گردونواح کے محروم اور مستضعف طبقہ میں تقسیم کر دیتے تھے۔

آپ نے کالا باغ کے گردونواح کی جن آبادیوں میں خصوصی خدمات سرانجام دیں ان میں ماڑی انڈس، واہنڈا کلڑاں والا، کوٹ بیلیاں اور ڈھیر امید علی شاہ نمایاں ہیں۔ آپ کے کالا

باغ جانے سے قبل وہاں کے دیہاتوں کی حالت ہر لحاظ سے ناگفتہ بہ تھی۔ تعلیمی اور اخلاقی حوالہ سے لوگ انتہائی پستی کا شکار تھے اور ان کے مزاج میں بھی پہاڑوں جیسی سختی موجود تھی۔ آپ نے محسوس فرمایا کہ بڑی عمر کے لوگوں کی اصلاح ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے چنانچہ آپ نے طویل المدت منصوبہ بندی کے تحت وہاں کے سکولوں پر خصوصی توجہ دی۔ آپ نے اساتذہ سے خصوصی مراسم استوار کیے انھوں نے بھی ایک ڈاکٹر کے حوالہ سے آپ کو بے حد عزت دی۔ زمین ہموار

ہوئی تو آپ نے ایرانی انقلاب کی طرز کی فصل کاشت کرنا شروع کردی۔ پہلے مرحلہ میں آپ نے سکولوں کی مالی معاونت کی اور پھر مستحق اور لائق طلباء کے وظائف جاری کردیئے دوسرے مرحلہ پر آپ نے دیہاتوں میں مفت مریض چیک کرنے اور ان کو دوائیاں فراہم کرنے کی ریت ڈالی جو وہاں کے باسیوں کے دلوں میں گھر کرگئی۔ آپ کی محبت کا یہ عالم تھا کہ وہاں کے لوگ اپنے ذاتی معاملات بھی آپ کے سامنے رکھتے اور آپ کے فیصلوں کو ترجیح دیتے۔

جب دیہاتیوں کے مزاج آپ سے ہم آہنگ ہوئے تو آپ نے ماڑی انڈس میں ''المصطفیٰ ماڈل ہائی سکول'' کی بنیاد رکھی اور منفرد و معیاری تعلیم فراہم کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ آپ کے کردار نے دل جیتے تو آپ نے مدرسہ امام خمینیؒ ماڑی انڈس میں دعائے کمیل اور درس کا سلسلہ شروع کردیا۔ آپ کی تبلیغات کا یہ اثر ہوا کہ لوگ دور دراز کی بستیوں سے آپ کے تربیتی پروگرام میں شرکت کرتے اور حقیقت حیات سے آشکار ہوتے۔

کالا باغ اور ملحقہ آبادی کے لوگ آپ کی بے لوث مسیحانہ خدمت کے معترف تھے کیونکہ انھیں ڈاکٹر کے روپ میں پیغمبرانہ صفات کا ایک انسان میسر آیا تھا آپ کی بے لوث خدمت کو دیکھ کر آپ کے ساتھی نے سوال کیا تھا ''ڈاکٹر صاحب آپ آدھی تنخواہ گھر دیتے ہیں اور آدھی غریب و ناچار عوام میں تقسیم کرتے ہیں کیا آپ کی فیملی کا گزارہ چار ہزار میں ہوجاتا ہے۔۔۔؟

آپ نے نہایت اطمینان سے انھیں جواب دیا'' عزیز دوست میں نے شروع ہی سے اپنے گھر کے اخراجات میں اعتدال رکھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ چار ہزار میں ہمارا مہینہ گزر جاتا ہے۔ اگر آج میں نے نو ہزار بھی گھر دیا تو اخراجات خود بخود بڑھ جائیں گے اور گھریلو آسائشات

میں اضافہ ہوجائے گا۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے گھر کے اخراجات اس قدر بڑھ جائیں کہ ناسازگار حالات میں انھیں سمیٹنا مشکل ہوجائے۔''

دوست نے پھر کہا آپ بے شک چار ہزار گھر دیں مگر مشکل وقت کیلئے کچھ رقم تو محفوظ رکھیں؟

آپ مسکرائے اور کہنے لگے'' کتنی بدبختی ہے ان لوگوں کی جن کے اضافی سرمائے بنکوں میں جمع ہیں اور ان کے اڑوس پڑوس میں لوگ فاقہ کشی کرتے ہیں، یتیم بچے جہالت کی زندگی گزارتے ہیں، یتیم جوان بچیاں ہاتھ پیلے کرنے کو ترستی رہتی ہیں اور لوگ پیٹ کا جہنم بھرنے کے لئے جہنم کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ میرے دوست غربت کی لعنت نے ہمارے معاشرے کو پراگندہ کیا ہے جہاں تک ممکن ہو خلق خدا کی سوچو۔۔۔''

آپ کی پر درد گفتگو سن کر دوست خاموش ہوا اور اس نے اپنی جمع شدہ رقم بنک سے نکلوا کر آپ کے مشن پر خرچ کردی اور آپ کا ہم سفر ہوگیا۔

۱۹۸۸ء میں علامہ سید عارف حسین الحسینی کی شہادت کے بعد لاہور میں آپ کی موجودگی ناگزیر ٹھہری تو آپ نے کالا باغ کی نوکری کو خیر باد کہا اور لاہور کے ایک فلاحی ادارہ ''زینبیہ کمپلکس'' میں ملازمت اختیار کرلی۔

آپ نے ریڈ کریسنٹ اسپتال کالا باغ کی انتظامیہ کو استعفاد یا تو انھوں نے آپ کو تیرہ ہزار تنخواہ کی پیشکش کی مگر آپ نے فرمایا'' میں تنخواہ کے لئے نہیں بلکہ وہاں کی ضرورت کے تحت لاہور واپس جارہا ہوں۔''

جب آپ کے گرویدہ عوام کو آپ کے جانے کا علم ہوا تو لوگوں نے آپ کے پاؤں تک پکڑے۔ آپ نے ان پر اہداف واضح کیے تو انھوں نے بھاری دل اور اشکبار آنکھوں کے ساتھ اجازت دی۔ آپ کی الوداعی تقریبات کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا۔ آپ جس ڈیرہ پر بھی جاتے سینکڑوں لوگ دیوانہ وار ٹوٹ پڑتے اور ہر اجتماع میں لوگ برملا کہتے کہ آج علاقہ سے ایک ڈاکٹر نہیں بلکہ مظلوم و محروم عوام کا مسیحا رخصت ہورہا ہے جب آپ کی شہادت کی خبر میانوالی کے علاقوں میں پہنچی تو بیسیوں جوان اور بزرگ لاہور آئے اور دیہاتوں میں بچوں اور خواتین نے بین کیے۔

آپ ''زینبیہ کمپلیکس'' آئے تو یہاں کی انتظامیہ نے آپ کو چھ ہزار کی آفر دی مگر آپ نے فرمایا ''چونکہ یہ فلاحی ادارہ ہے لہٰذا میں پانچ ہزار تنخواہ پر کام کروں گا اور اتنی رقم میں میرا اور میرے گھر کا گزارہ ہو جائے گا۔''

آپ نے مسیحائی خدمات سرانجام دے کر یہاں بھی غرباء کے دلوں میں گھر کیا۔ زینبیہ اسپتال میں آپ نے عام مریضوں کے علاوہ منشیات کے شکار لوگوں کا مفت علاج شروع کیا۔ آپ ایسے مریضوں کو کئی کئی روز تک وارڈ میں رکھتے اور ان کی مسلسل نگہداشت کرتے۔ آپ اپنے احباب سے کہتے کہ منشیات کے عادی لوگ نہ صرف اپنی زندگی کے دشمن ہیں بلکہ یہ اپنے گھر اور معاشرہ کے لئے بھی خطرناک ہیں۔ لہٰذا جہاں بھی ایسے شخص کو پائیں اس کے گھر سے رابطہ کر کے یہاں لے آئیں۔

انسانیت کی خدمت کے دوران کئی مریض آپ کے کپڑے خراب کرتے بلکہ زنجیروں میں بندھے ہوئے بعض مریض آپ پر تھوکتے مگر آپ ایک عزم کیساتھ ان کے معالجہ کے لئے ہر ممکنہ کوشش کرتے۔

ایک مرتبہ کسی شخص نے آپ سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب ان کو علاقہ کی پولیس بھی ٹھیک نہیں کر سکتی آپ نے خواہ مخواہ مصیبت اپنے سر لی ہوئی ہے۔ ان لوگوں سے بھلا کیا ملنا ہے۔۔۔؟ آپ نے امام حسین علیہ السلام کا فرمان جواب میں سنایا کہ ''جو کام صرف خدا کے لئے کیا جائے اس کا اجر خدا ہی دیتا ہے۔''

۱۹۹۰ء میں آپ نے موضع ہنجر وال ملتان روڈ پر اپنا پرائیویٹ کلینک کھولا اور وہاں کی غریب آبادی کی مسیحانہ خدمت شروع کی۔ یہاں آپ نے مریضوں کے ساتھ موجودہ ڈاکٹروں والا سلوک برتا نہ فیس کا مطالبہ کیا۔ جس مریض کا جتنا جی چاہتا یا اسے جیب جتنا اجازت دیتی آپ کو فیس پکڑا دیتا۔ بعض اوقات مریض دوائیاں لے کر آپ کو دعائیہ جملے دیتے اور چلے جاتے تو آپ فرماتے ''فیس، دعا میں آ گئی ہے''۔

۱۹۹۲ء میں آپ ملک کے معروف شیخ زید اسپتال اور فیڈرل پوسٹ گریجوایٹ انسٹی ٹیوٹ

لاہور میں رجسٹرار کے عہدہ پر فائز ہوئے اور تا حیات یہاں فرائض انجام دیتے رہے۔

میو اسپتال سے لے کر شیخ زید اسپتال کی ملازمت کے دورانیہ میں آپ نے اپنی نوکری کو ذریعہ ثواب جان کر دکھی انسانیت کی خدمت کی۔ آپ دوسرے ڈاکٹروں کی طرح کبھی متکبر ہوئے نہ مریض اور اس کے کسی تیماردار کا دل دکھایا۔ یہاں تک کہ آپ اپنے ملازمین سے اس طرح پیش آئے کہ آپ کے ساتھ کام کرنے والے مختلف مکاتب فکر کے لوگ آپ کی شہادت پر دھاڑیں مار کر روتے ہوئے دیکھے گئے۔

آپ نے اپنی زندگی کو مولائے کائنات حضرت علیؑ کے اس فرمان کے قالب میں ڈھالا جو انھوں نے نہج البلاغہ میں ارشاد فرمایا ہے ''لوگوں سے اس طرح سے ملو جب تک زندہ رہو وہ تمھارے مشتاق ہوں اور جب مر جاؤ تو وہ تم پر ماتم کریں۔''

مجھے وہ دن یاد آ رہا ہے جب میں بھی شیخ زید اسپتال میں ملازم تھا۔ میں اپنے آفس سے اٹھ کر ڈاکٹر صاحب کی زیارت کے لئے جا رہا تھا کہ ان کے آفس کے سامنے والے سبزہ زار میں ایک مالی اور دوسرا ڈاکٹر صاحب کا چپڑاسی حقہ پی رہے تھے۔ مالی چپڑاسی کو کوس رہا تھا کہ تم کام نہیں کرتے حقہ پینے آ جاتے ہو کیا تمھارا افسر یہاں نہیں ہوتا۔۔۔؟

میرا افسر تو یہاں ہوتا ہے مگر وہ دوسرے افسروں جیسا نہیں۔ چپڑاسی نے جواب دیا کیا مطلب۔۔۔؟ مالی نے پھر استفسار کیا۔

میرا افسر شاہ جی ہے وہ ہمیں تنگ نہیں کرتا۔ زیادہ تر کام اپنے ہاتھوں سے کرتا ہے۔۔۔ کبھی غصہ میں آ جائے بھی تو گالی نہیں دیتا صرف ''بندہ خدا'' کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے۔۔۔ جب خوش ہوتا ہے تو اپنی الماری سے بسکٹ نکال کر کھلاتا ہے۔۔۔ ہمیں ضرورت پڑتی ہے تو اپنی تنخواہ سے ہماری مدد کرتا ہے۔۔۔ قرآن مجید پڑھنے کی زیادہ تاکید کرتا ہے۔۔۔ شیعہ ہے مگر تبلیغی اجتماع میں رائیونڈ بھی جاتا ہے۔۔۔'' چپڑاسی نے دل کی گہرائیوں سے تعریف کرتے ہوئے یہ جملے کہے۔

مالی یہ باتیں سن کر حیران ہوا اور کہنے لگا ''اس کا مطلب ہے کہ تمھارا افسر کربلا والے

سیدوں میں سے لگتا ہے کسی دن مجھے بھی ایسے شخص کی زیارت کروا دینا۔''

میں نے مالی اور چپڑاسی کی یہ گفتگو سنی سو مولا علی علیہ السلام اور ان کے غلام کا وہ واقعہ یاد آ گیا۔ جب ایک مرتبہ مولا علیؑ نے کسی کام کے سلسلہ میں اپنے غلام کو کئی بار آواز دی مگر وہ نہ آیا۔ آخر امام اٹھے اور وہ کام خود کر لیا۔ جب تھوڑی دیر بعد غلام آیا تو امام نے پوچھا

''کیا تم نے میری آواز نہیں سنی تھی''
سنی تھی۔۔۔ غلام نے جواب دیا
پھر آئے کیوں نہیں۔۔۔ مولاؑ نے فرمایا

مولاؑ کافی تھکا ہوا تھا۔۔۔ کام کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا اور مجھے یقین تھا کہ آپ مجھے سزا بھی نہیں دیں گے اور حسب معمول اپنا کام خود کر لیں گے۔۔۔ غلام نے معذرت کرتے ہوئے عرض کی۔

سفیر انقلاب کی زندگی آئمہ کی زندگی کا نمونہ پیش کرتی تھی ان کا زندگی میں جن لوگوں سے بھی واسطہ پڑا وہ آج بھی آپ کے فراق میں روتے ہوئے یہی کہتے سنائی دیتے ہیں۔

تری خوشبو نہیں ملتی، ترا لہجہ نہیں ملتا
ہمیں تو شہر میں کوئی، ترے جیسا نہیں ملتا

☆☆☆☆☆

انقلاب اسلامی ایران اور سفیر انقلاب

۷۷۔۱۹۷۶ء میں آپ آئی۔ایس۔او پاکستان کے مرکزی صدر بنے تو اس وقت ایران میں اسلامی انقلاب کی تحریک میں حرارت آ چکی تھی اور وہاں کے علماء کو انقلاب کا صبح کا سورج طلوع ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ امام خمینیؒ کی فکر کی شعاعیں دنیا بھر میں ظلمت کے اندھیروں کا سینہ چیر رہی تھیں اور حق پرستوں کے قافلے تشکیل پا رہے تھے۔

پاکستان میں علامہ سید صفدر حسین نجفی واحد شخصیت تھے جو امام خمینیؒ کی فکر کے امین بن کر اہلیان پاکستان کو امام خمینیؒ اور اسلامی انقلاب کا تعارف کرا رہے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پاکستان کے مسلمان بالخصوص اہل تشیع انقلاب کی روح سے بیگانہ تھے۔ مرجعیت کا تصور صرف علماء تک محدود تھا جبکہ عوام اور علماء کے درمیان ایک خلیج حائل تھی۔

ان مشکل حالات میں علامہ سید صفدر حسین نجفی جہاد کا علم اٹھا کر دینی مدرسہ کی دیواروں سے باہر نکلے تو انھیں ایک مجاہد کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ابھی وہ حالات کا جائزہ لے ہی رہے تھے

کہ انھیں اپنے پہلو میں کھڑا ہوا وہ مجاہد ملا جوان کا اپنا تربیت یافتہ تھا۔۔۔ جوان کی گود کا پروردہ تھا ۔۔۔ جوان کی انگلی پکڑ کر چلنا سیکھا تھا۔۔۔ جوان کی محنتوں کا ثمر تھا۔۔۔ جس کا نام انھوں نے ''محمد علی'' رکھا تھا۔

روحانی باپ بیٹا عوامی حلقوں میں آئے۔ عالم نے فکر پھیلائی مجاہد نے حالات کو گرفت میں لیا۔ بزرگوں تک بزرگ نے پیغام پہنچایا اور جوانوں سے جوان نے گفتگو کی۔ علامہ صاحب نے جو کچھ قرطاس پر لکھا ڈاکٹر صاحب نے اسے عوام تک پھیلایا، فقیہہ نے جو سمت دی نمائندہ نے وہی راہ اختیار کی۔

آغاز میں اسلامی انقلاب اور امام خمینیؒ کے پیغامبروں کے سر الزام آئے اور مشکلات نے ان کی راہ میں دیوار بننا چاہا مگر ہر الزام کا مقابلہ کرتے ہوئے اور ہر مشکل کی دیوار کو گراتے ہوئے یہ باپ بیٹا آگے بڑھے تو چند بابصیرت لوگ ان کے ساتھ ہو لئے اور یوں قافلہ حق تیار ہو گیا۔ شروع میں یہ قافلہ علامہ صاحب کے عقیدتمندوں اور ڈاکٹر صاحب کے ہم فکر نوجوانوں پر مشتمل تھا مگر کچھ عرصہ بعد عوام اس میں شامل ہوئے تو امام خمینیؒ کے حمایتیوں کا سیل بیکراں رواں ہو گیا۔

حالات کے بدلتے تیور دیکھ کر علامہ سید صفدر حسین نجفی نے امام خمینیؒ کی ''توضیح المسائل'' کا ترجمہ کرنا شروع کر دیا تو ڈاکٹر صاحب نے اس کی راہ ہموار کرنے کی ٹھان لی۔ علامہ صاحب نے توضیح المسائل چھپوائی تو ڈاکٹر صاحب نے ملک کے کونہ کونہ میں اسے تقسیم کیا۔ علامہ صاحب نے امام خمینیؒ کا تعارف اور ان کی تحریک کے مقاصد تحریر فرمائے اور امام خمینیؒ کی پہلی کتاب ''حکومت اسلامی یا ولایت فقیہہ'' کا ترجمہ کیا ڈاکٹر صاحب نے انھیں پورے ملک میں پھیلا دیا۔

۱۹۷۶ء میں جب عراقی علماء پر امام خمینیؒ کی حمایت کے جرم میں تشدد اور قتل عام ہوا تو ان پر ظلم اور ان کی شہادتوں پر احتجاج کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے ایک پوسٹر شائع کروایا جس کا عنوان تھا۔

''وہاں خون کی ہولی کھیلی گئی اور ہم یہاں خاموش رہے''

۱۹۷۸ء میں شاہ ایران کو پاکستانی حکومت نے دورہ کی دعوت دی تو ڈاکٹر صاحب

اور برادر ثاقب نقوی نے ایک پوسٹر شائع کروایا جس پر درج تھا ''ہم قاتل شاہ کا استقبال نہیں کرتے'' یہ پوسٹر اسلامیان پاکستان کے نام سے چھپوایا گیا۔ جب یہ پوسٹر لاہور کے در و دیوار پر چسپاں ہوا تو حکومتی ایوانوں اور ایران کے قونصل خانوں میں کھلبلی مچ گئی۔

شاہ ایران تو پاکستان نہ آسکا البتہ ایرانی قونصلیٹ نے روایتی شیعہ لیڈروں کو بلا کر اپنی تشویش سے آگاہ کیا۔ جس پر بعض رہنماؤں نے عذر پیش کیا کہ ''یہ حرکت خمینیؒ کے چیلوں کی ہے۔''

انقلاب اسلامی کے طلوع سے قبل جب امام خمینیؒ پیرس میں جلا وطنی کی زندگی گزار رہے تھے لاہور سے علامہ سید صفدر حسین نجفی اور سیٹھ نوازش علی صاحب ٹرسٹی جامعۃ المنتظر ڈاکٹر محمد علی شہید کے والد مولانا سید امیر حسین نقوی نے اپنے چند احباب کو جمع کیا اور تجویز پیش کی کہ ہماری طرف سے امام کو تائیدی خط جانا چاہیے تمام احباب نے ڈاکٹر صاحب کی فکر کی تائید کی اور خط کا متن تیار کیا گیا جس میں تحریر تھا۔ ''اے نائب امام، پاکستان کے فرزندان اسلام آپ کے ہر حکم پر کٹ مرنے کے لئے تیار ہیں۔ آپ کی قیادت میں اسلامی انقلاب کی حمایت اور سامراج سے ٹکر لینے کا عہد کرتے ہیں۔''

یہ خط آئی۔ ایس۔ او پاکستان کی جانب سے لکھا گیا۔ جب یہ نامہ امام خمینیؒ کی خدمت میں پہنچایا گیا۔ تو امام نے جواباً فرمایا ''میں فرزندان اسلام کے جذبات کی قدردانی کرتا ہوں اور مجھے ان سے یہی توقع ہے کہ وہ اپنے ملک سے بھی سامراج کو رخصت کریں گے امام نے اس واقع پر آئی۔ ایس۔ او کو انقلاب کے طلوع کی پیشگی مبارکباد اور دعائے خیر فرمائی۔

۱۹۷۸ء کے آخری ایام میں آغا حسین نوری امام خمینیؒ کے نمائندہ کی حیثیت سے دورہ پر پاکستان آئے اور انھوں نے لاہور میں چار روزہ قیام کے دوران اہم افراد سے ملاقاتیں کیں۔ اس موقع پر انھوں نے آئی۔ ایس۔ او پاکستان کے چار نوجوانوں کو بھی خصوصی وقت دیا اور روزانہ چار روز تک یہ وفد ان سے ملاقاتیں کرتا رہا۔ اس وفد میں ڈاکٹر صاحب کی ذات نمایاں اور معتبر تھی۔

انقلاب کی آمد سے چند ماہ قبل ایرانی طلباء نے لاہور کے مال روڈ پر شاہ ایران کے ظلم کے خلاف احتجاجی مظاہرہ کیا تو ڈاکٹر صاحب نے اس مظاہرہ کی قیادت کی اور تکبیر کا پہلا نعرہ بھی آپ

نے بلند کیا۔

انہی ایام میں شاہ کی حکومت فدایان خمینیؒ پر ظلم کے پہاڑ توڑ رہی تھی۔ایک وقت میں سینکڑوں نوجوان شہید کیے جارہے تھے تو آئی۔ایس۔او پاکستان نے امام کی حمایت اور شاہ کے خلاف پہلی بار مال روڈ لاہور پر مظاہرہ کیا جس کی قیادت سفیر انقلاب نے کی۔اس موقع پر لاہور کے ڈپٹی کمشنر سعید مہدی نے ڈاکٹر صاحب کو بلا کر کہا'' آپ واپس چلے جائیں وگرنہ ہم ماریں گے'' ڈاکٹر صاحب نے جواباً کہا''ہم میدان میں واپس جانے کے لئے نہیں اترے ہم اپنا مشن پورا کریں گے اور آپ اپنا مشن پورا کریں''

۱۹۸۱ء میں جب ایران میں آیت اللہ بہشتی اپنے ۷۲ ساتھیوں کے ہمراہ شہید ہوئے تو سب نوجوانوں کے دل شدید غمگین تھے لیکن اس واقعہ کے ٹھیک ایک ماہ بعد جب اسلامی جمہوریہ ایران کے صدر محمد علی رجائی اور وزیر اعظم آقای باہنر کے اکٹھے شہید ہونے کی اطلاع پاکستان پہنچی تو پاکستان میں ایک عجیب اضطراب کا عالم تھا لہٰذا آئی ایس او مرکز کی طرف سے اگلے روز مال روڈ لاہور پر مسجد شہداء کے سامنے تعزیتی جلوس نکالنے کا پروگرام بنایا گیا ساری رات تیاری ہوتی رہی۔تقریباً 12 بجے ایک خاص طریقے سے بینرز اور پلے کارڈ وغیرہ وہاں پہنچائے گئے سینکڑوں لوگ موقع پر پہنچ گئے جونہی جلوس نکلا تو پولیس نے نہ فقط آگے بڑھنے سے روکا بلکہ شرکاء پر تشدد بھی شروع کر دیا اور کئی ساتھی بھی حراست میں لے لئے۔یہ پہلا موقع تھا کہ صرف چند ایک افراد کے علاوہ نوجوانوں ڈاکٹر نقوی سمیت آئی ایس او مرکز لاہور ڈویژن کے عہدیدار اور سابقہ مرکزی صدور کی ایک بڑی تعداد کو زندان میں ڈال دیا گیا تھا لیکن یہ نوجوان اس قدر جذبات سے لبریز تھے کہ انھوں نے رات بھر تھانہ سول لائنز کو نعروں کی گونج سے لرزائے رکھا پولیس کے سوالوں کے جواب میں مخصوص جواب تیار کیے گئے تھے اور جب بھی کوئی پولیس والا کسی سے سوال پوچھتا تو وہی مخصوص جواب دیا جاتا۔تقریباً 24 گھنٹے حوالات میں رہنے کے بعد انتظامیہ نے مذاکرات کے نتیجے میں تمام ساتھیوں کو رہا کر دیا۔

۱۱ فروری ۱۹۷۹ء کو جب ایران کی سرزمین پر انقلاب اسلامی کی پو پھوٹی روشنی کی ایک

کرن خوشبو کو اپنے دوش پر لئے پاکستان پہنچی۔عین انہی ایام میں ''جامعۃ المنتظر'' میں آئی۔ایس۔او کا سالانہ مرکزی کنونشن ہو رہا تھا۔جس میں شرکاء کو مبارکباد کیساتھ ساتھ امام خمینیؒ کی جدوجہد کا بھرپور تعارف کروایا گیا۔اس موقع پر ایک قرارداد کے ذریعہ امام اور انقلاب کو خوش آمدید کہا گیا اور ان کے ساتھ ایفائے عہد کا اعلان ہوا۔

کنونشن میں شریک ہر نوجوان اپنی اپنی فہم کے مطابق پرمسرت تھا اور اپنے اپنے انداز میں اظہار مسرت کر رہا تھا۔ایسے میں سفیر انقلاب انتہائی پرجوش انداز میں سٹیج پر آئے اور سامعین سے مخاطب ہوئے۔''برادران عزیز سب سے پہلے میں آپ کو انقلاب اسلامی کی آمد پر مبارکباد پیش کرتا ہوں اور اس اجتماع میں واضح کرتا ہوں کہ یہ چودہ سو سال بعد آئمہ کی سرزمین سے طلوع ہونے والا اسلامی انقلاب اور امام زمانہ کی سرپرستی میں قائم ہونے والی اسلامی حکومت دنیا بھر کے مسلمانوں کے لئے نعمت خداوندی ہے۔اس سے پہلے ہمارا فریضہ تھا کہ ہم امام زمان عجل اللہ فرجہ کے نائب حضرت آیت اللہ خمینیؒ کی صدائے استغاثہ پر لبیک کہتے اور صدیوں پر محیط شہنشایت اور سامراجیت کے خلاف برسر پیکار رہتے۔الحمدللہ کہ جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اپنی حیثیت کے مطابق امام کی صدا پر لبیک کہا اور اس صدا کو دوسرے احباب تک پہنچایا۔۔۔۔

برادران عزیز! آج جبکہ اسلامی انقلاب کا سورج طلوع ہو چکا ہے اور محروموں، مظلوموں اور محکوموں کی امید یعنی مستعفین جہان حضرت امام خمینیؒ مسلمانان عالم کی تقدیر بدلنے کے لئے پرچم اسلام لے کر ہمارے سامنے تشریف لائے ہیں۔اب ہم پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ہم سامراج کے زہریلے پروپیگنڈہ کے مقابلہ میں انقلاب اور امام کا نہایت دیانتداری اور خلوص سے تعارف کرائیں۔یاد رکھنا کہ اس انقلاب اور امام کی شخصیت کو جذبات یا محبت کی زیادتی کی وجہ سے اپنے دائروں میں محدود نہیں کرنا یہ خالصتاً اسلامی انقلاب ہے اس کا دفاع، اس کا پرچار اور اس کی خدمت ہم سب پر لازم ہے۔لہٰذا میں آپ سے استدعا کرتا ہوں کہ آپ اپنے علاقوں میں جا کر امام اور انقلاب کی ترویج کریں اور عالمی سامراج کے خلاف زمین ہموار کرنا شروع کر دیں۔یہی آپ کا فریضہ ہے، یہی آپ کی ذمہ داری ہے اور یہی وقت کا تقاضا ہے۔''

آئی۔ایس۔او کے سالانہ کنونشن کے چند روز بعد ڈاکٹر صاحب نے قابل اعتماد اور سینئر تنظیمی برادران کا ایک اجلاس بلایا جس میں آپ نے احباب پر واضح کیا کہ ''امام خمینیؒ کی حقیقی پیروی کے لئے ہمیں سب سے پہلے ان کی تقلید کرنا ہوگی تاکہ ہم امام کے حکم کو فرض کی حیثیت سے سرانجام دیں۔

ڈاکٹر صاحب اور دیگر کئی سینئر ساتھی پہلے سے امام خمینیؒ کے مقلد تھے۔اس طرح دوسرے احباب بھی رفتہ رفتہ امام خمینیؒ کے مقلد بن گئے۔

انقلاب اسلامی کی آمد کے فوراً بعد امام خمینیؒ کی طرف سے دو ''رکنی وفد پاکستان میں جماعت اسلامی کے بانی حضرت سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کو مبارکباد اور انقلاب کی حمایت کا ہدیہ تشکر پیش کرنے لاہور آیا تو اسلامی جمعیت طلبہ، جماعت اسلامی کے کارکنان اور آئی۔ایس۔او کے نوجوانوں نے ایئرپورٹ سے مولانا مودودی کی رہائش گاہ تک ان کا والہانہ استقبال کیا۔اس موقع پر خمینیؒ۔۔۔مودودی بھائی بھائی کے نعرے بھی بلند ہوئے جو آج بھی تاریخ کے دامن میں محفوظ ہیں۔وفد نے امام کا اہم پیغام مولانا صاحب کو پہنچایا اور مولانا کا ایک طویل نامہ اپنے ساتھ لے گئے۔جس میں اسلام کی خدمت کے لئے مستقبل کا لائحہ عمل تھا۔

امام کا نمائندہ وفد علامہ سید صفدر حسین نجفی کی امام اور انقلاب کی ترویج کے لئے زحمتوں کا شکریہ ادا کرنے ''جامعۃ المنتظر'' بھی گیا جہاں انھوں نے علامہ صاحب کو بھی امام کا پیغام تشکر پہنچایا۔اس موقع پر ڈاکٹر صاحب اور ان کے چند اہم احباب بھی موجود تھے۔جن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ مرحوم نے فرمایا تھا ''انقلاب اور امام کے تعارف میں ان مجاہدین کی زحمتیں قابل قدر اور قابل تحسین ہیں'' چنانچہ اس وفد نے ڈاکٹر صاحب کا خلوص دل سے شکریہ ادا کیا اور آپ کی محنتوں کو سراہا۔

۲۰ ستمبر ۱۹۸۰ء کی رات جب امریکہ کے اشارہ پر عراق نے ایران پر جارحیت کی توصبح کی نشریات میں۔بی۔بی۔سی نے حملہ کی خبر نشر کردی۔ڈاکٹر صاحب اس وقت اپنے گھر میں بیٹھے، ناشتہ کررہے تھے۔جونہی آپ نے عراقی جارحیت کی خبر سنی۔ایک دم تڑپے اور ناشتہ چھوڑ دیا۔

پریشانی کے انہی لمحات میں آپ نے فوراً ''روزنامہ نوائے وقت لاہور'' کے چیف ایڈیٹر حمید نظامی کو فون کیا اور ان پر گفتگو کے دوران واضح کیا کہ ''یہ جنگ عالمی سامراج کے اشارہ پر مسلط کی جارہی ہے اور امریکہ ایران سے نہیں بلکہ اسلام سے شکست کا بدلہ لینا چاہتا ہے لہٰذا ایسے میں بحیثیت ایک مسلم میں آپ سے اپیل کرتا ہوں اور توقع رکھتا ہوں کہ آپ اسلامی انقلاب کا بھرپور دفاع کریں اور مغربی ذرائع ابلاغ کا منہ توڑ جواب دیں۔''

اسی دوران میں آپ نے شہر میں دیگر ہم فکر احباب سے صلاح مشورہ کیا کہ ان حالات میں ہماری ذمہ داری کیا بنتی ہے۔آخر طے پایا کہ فوری طور پر زخمی شہریوں کے لئے ادویات پہنچائی جائیں۔چونکہ یہ ڈاکٹر صاحب سے متعلقہ کام تھا۔چنانچہ آپ نے سب سے پہلے اپنی جیب سے پانچ سو روپے عطیہ کے طور پر جمع کرائے اور شہر کے مخیر حضرات سے رابطہ کرکے لاکھوں روپے کی ادویات خریدیں اور ایران چھوڑنے چلے گئے۔آپ کو ویزا میں معمولی سی غلطی کی وجہ سے کئی گھنٹے سرحد پر رکنا پڑا یہاں تک کہ ویزا کی درستگی کے لئے آپ کو واپس کوئٹہ بھیج دیا گیا۔آپ دوائیوں کے ٹرک سمیت کوئٹہ لوٹے اور ویزا درست کرانے کے بعد انہی قدموں واپس چلے گئے۔جب آپ سرحد پر پہنچے تو وہاں کے ملازمین حیران رہ گئے اور کہنے لگے کہ ہمارا ملازم بھی اگر کوئٹہ جائے تو وہ تین دن بعد لوٹتا ہے جبکہ تم ایک شام بعد واپس لوٹ آئے ہو کس دھات کے بنے ہوئے ہو۔۔۔؟''

علاوہ ازیں ایران عراق جنگ کے ابتدائی سالوں میں پاکستان کے عوام کی طرف سے ایرانی بھائیوں کی جو مدد کی گئی اس میں علماء کرام کی تبلیغ اور ڈاکٹر صاحب کی انتھک مجاہدانہ کوشش کا بے پناہ عمل دخل تھا۔

۱۹۸۲ء میں ڈاکٹر صاحب نے پروگرام طے کیا کہ پاکستان کے نظریاتی جوانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ انقلاب اسلامی کو قریب سے دیکھیں، وہاں کی تبدیلیوں کا مشاہدہ کریں اور وہاں کے پاسداران، علماء کرام اور بانیان انقلاب سے ملاقاتیں کرکے روحانی غذا حاصل کریں۔چنانچہ اس فکر کی تکمیل کے لئے آئی۔ایس۔او پاکستان کا دوسرا وفد ڈاکٹر صاحب کی زیر

قیادت ایران پہنچا۔ جہاں ان کا فقید المثال استقبال کیا گیا۔ وہاں کے ماحول میں پھیلی ہوئی دین کی خوشبو نے ان کے ذہنوں کو معطر کیا اور وہاں پر شریعت کے راج نے ان کے دلوں کو تازگی عطا کی ۔۔۔۔۔ پاسداران اسلام کے جذبہ جہاد نے ان کے خون کو گرمایا اور انبیاء کے ورثاء علماء کرام کی روحانیت نے ان کے اسلامی افکار کو نمو بخشی۔۔۔۔ حضرت امام رضا علیہ السلام کی سرزمین نے ان کے ذہنوں کی زمین کو زرخیزی اور بت شکن خمینیؒ کی ملاقات اور ان کے عطا کردہ افکار نے ان کی زندگی اور سوچوں کے رخ موڑ دیئے۔

اس دورہ کے دوران میں سفیر انقلاب ڈاکٹر محمد علی نقوی کے امام خمینیؒ سے عشق اور اسلامی انقلاب سے محبت نے نوجوانوں پر گہرے نقوش مرتب کیے جو آج بھی دلوں کی لوح پر محفوظ ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ایران میں داخل ہونے کے بعد اپنے تنظیمی برادران کو جو پہلا درس دیا۔ وہ کچھ یوں تھا ''برادران عزیز! آپ اس وقت آئمہ کی سرزمین پر قدم رکھ چکے ہیں۔ آپ سیر و سیاحت کے لئے نہیں آئے بلکہ آپ مشاہدہ کرنے آئے ہیں کہ یہاں پر پچیس سو سالہ شہنشاہیت کا بت کیسے توڑا گیا۔۔۔۔ صدیوں پر محیط عالمی استکبار کا طلسم کیسے ٹوٹا۔۔۔ فرزند امام نے کن بنیادوں پر تحریک چلائی۔۔۔۔ علماء کرام نے اس انقلاب کے لئے کتنی محنت کی۔۔۔۔ نوجوانوں کی تربیت کیسے ہوئی اور انھوں نے قربانیاں کیسے دیں۔۔۔۔ یہاں کے آج اور کل میں کتنا فرق ہے۔۔۔۔ اس انقلاب کے تقاضے کیا ہیں اور ہمیں اس کے لئے کیا کرنا ہے۔۔۔۔؟''

اس موقع پر ڈاکٹر صاحب نے اپنے برادران پر واضح کیا کہ یہاں کا خزانہ، یہاں کی ٹرانسپورٹ اور یہاں کی دیگر سہولتیں مال امامؑ کی بدولت ہیں۔ لہٰذا کسی مرحلہ پر بھی کوئی ایسا قدم نہ اٹھائیں کہ جس سے مال امامؑ آخرالزمان کے ضیاع کا گمان ہو۔ یہاں تک کہ آپ وضو اور غسل میں پانی اور کمروں میں بجلی کے ناجائز استعمال سے بھی گریز فرمائیں۔

یہاں ڈاکٹر صاحب نے اپنے عشق کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا: ''برادران عزیز! حتیٰ المقدور کوشش فرمائیں کہ آپ کے زیادہ تر اوقات اطاعت خدا میں صرف ہوں اور آپ زیادہ سے زیادہ وقت پیر جماران خمینیؒ بت شکن کے علاوہ ''جماران'' میں گزاریں تاکہ آپ کو نائب امام

کی زیارت بھی نصیب ہوا وران کے گھر کو دیکھ کر روح کی تازگی بھی ملتی رہے۔ چنانچہ عشق کی لذت میں اضافہ کے لئے ڈاکٹر صاحب برادران کو مسجد آیت اللہ کنپانی لے گئے جو ''جماران'' کے علاقہ میں واقع تھی۔ آپ جونہی پیر جماران کے گھر کی جانب دیکھتے تو آپ کے چہرے پر پھول کی سی تازگی آتی اور لبوں سے ''خدایا خدایا تا انقلاب مہدی۔ خمینیؒ رانگہدار'' کے جملے بے اختیار ادا ہوجاتے۔

اگرچہ حکومت ایران کی جانب سے اس وفد کو ٹرانسپورٹ، علماء کرام کی ملاقاتیں، قیام اور طعام کی اعلیٰ سہولیات میسر تھیں۔ مگر ڈاکٹر صاحب زیادہ تر وقت علماء کرام کی ملاقاتوں اور مساجد میں گزارتے۔ معمولی سا کھانا کھا کر برادران کیساتھ جہاں جگہ ملتی سو جاتے۔ بعض اوقات آپ برادران کے ساتھ دائرے میں بیٹھ کر خربوزے سے روٹی کھاتے اور ایسے میں نفس امارہ کو نفس مطمئنہ کی طرف لوٹنے کا درس دیتے۔

اس دورہ کے دوران میں ایک مرتبہ جب برادران نے رات زمین پر سو کر گزاری اور صبح معمولی سا کھانا کھایا تو ایک ساتھی نے ڈاکٹر صاحب سے مزاحاً کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب ایران کے دورہ پر آئے ہیں۔ جنگ خندق لڑنے نہیں آئے۔ آپ نے تو ہمارے پیٹوں پر پتھر بندھوا دیئے ہیں؟ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ''عزیز دوست! آپ لوگوں کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ اپنے بارے میں مجھے معلوم ہے کہ مجھ جیسا نالائق انسان جس کی انقلاب کے لئے کوئی خدمات نہیں اس قابل نہیں کہ اس پر مال امامؑ خرچ ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو پروٹوکول ہمیں دیا جارہا ہے۔ ہماری حیثیت سے بھی زیادہ ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ مال امامؑ ہماری آسائشوں پر خرچ ہونے کی بجائے محاذ جنگ پر مصروف ان مجاہدوں تک پہنچے جو اسلام کی بقاء کی جنگ لڑ رہے ہیں۔''

یہ کارواں اپنے دلوں میں جذبات کا سمندر لئے وطن لوٹا تو برق رفتاری سے امام کا پیغام اور انقلاب کے تاثرات پھیلانے لگا۔ انقلاب ایران کی سالگرہ کا موقع آیا تو ڈاکٹر صاحب تحریک جعفریہ کے صوبائی دفتر لاہور میں تمام جزوی مصروفیات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بیٹھ گئے۔ آپ نے پورے ملک میں انقلاب کی ویڈیو فلمیں دکھانے کی جامع منصوبہ بندی کی اور اتحاد بین

المسلمین کے سیمینار کرانے کا لائحہ عمل تیار کیا۔

آپ نے انقلاب کے تعارف کے لئے عشرہ منانے کا اعلان کیا جسے آپ کی نظریاتی فوج (آئی۔ایس۔او پاکستان) نے تکمیل تک پہنچایا۔ ملک بھر کے ہر ضلع میں انقلاب کی سالگرہ کے اجتماع منعقد ہوئے جہاں شیعہ وسنی علماء کرام نے خطابات کیے نوجوان نے گاؤں گاؤں جا کر انقلاب کی فلمیں دکھائیں۔ یہ کہنا ہرگز بے جا نہ ہوگا کہ ''آئی۔ایس۔او کے نوجوانوں نے امام کا پیغام قریہ قریہ پہنچانے میں خوب حق ادا کیا اور اپنی ان حسرتوں کو پورا کیا جس کے بارے میں وہ ہر نماز کے بعد زیارتِ امام حسین علیہ السلام میں کہتے ہیں کہ ''کاش ہم کربلا میں ہوتے۔''

علماء کرام کی محنت اور نوجوانوں کی ڈاکٹر صاحب سے وابستگی نے اسلامی برادران میں انقلاب اور امام کے عشق کی وہ لو جلائی جسے سرنگوں کرنا بڑے بڑے شیطانوں کے لئے ناممکن ہوگیا۔ یہ نوجوان جہاں جاتے، جہاں بیٹھتے، جہاں گفتگو کرتے ان کے لبوں پر حقیقت موجزن ہوتی اور یہ عاشقان امام خمینیؒ، لوگوں کو انقلاب اسلامی کی آمد کے بارے میں بتاتے۔

اخلاق پریشاں تھا، تہذیب ہراساں تھی
بدکار حضوروں سے، بدنسل جنابوں سے
عیار سیاست نے ڈھانپا تھا جرائم کو
ارباب کلیسا کی حکمت کے نقابوں سے
عیش، ایک کا لاکھوں کی غربت سے پنپتا تھا
منسوب تھی یہ حالت، قدرت کے حسابوں سے
طبقوں سے بٹی دنیا صدیوں سے پریشاں تھی
غمناکیاں رستی تھیں آباد خرابوں سے
انساں کا مقدر اور، اسلام کی عظمت بھی
آزاد ہوئے آخر شاہی کے عذابوں سے

بعض اوقات جب معتمد ساتھی ڈاکٹر صاحب سے سوال کرتے کہ آخر وہ کونسی وجوہات تھیں

جن کی بناء پر آپ نے ملک کے ہر در و دیوار تک امام کا پیغام اور گھر گھر تک امام کی تصاویر پہنچائیں۔ جبکہ عالمی استعمار، اس کے ایجنٹ اور ہمارے حکمران آپ کی فکر کے مخالف تھے۔۔۔؟ تو آپ خوشگوار تاثرات کے ساتھ جواب دیتے کہ ''علماء کرام کی محنت اور آئی۔ایس۔او پاکستان کی زحمات اس کی بنیادی وجوہات تھیں جبکہ ان دونوں حلقوں کا محور امام سے عشق تھا۔ آپ فرماتے کہ ہمارے نوجوانوں نے ملک میں امام کی تصاویر اور توضیح المسائل ٹرکوں کے حساب سے تقسیم کیں اور مختصر عرصہ میں خاطر خواہ نتائج حاصل کیے۔''

سفیر انقلاب کو بانی انقلاب سے جنون کی حد تک عشق تھا۔ کوئی ایسا مسئلہ جو یہاں کے علماء کی دسترس سے باہر ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب دفتر امام خمینیؒ سے رابطہ کرتے اور امام کی رائے یا فتوی کے منتظر رہتے۔ ایک مرتبہ راقم نے تحریک جعفریہ کے صوبائی دفتر ۲۔ دیوسماج روڈ پر ڈاکٹر صاحب سے چند امور پر بحث کی تو آپ نے فوراً فرمایا امام سے پتہ کرتے ہیں جب تک امام خمینیؒ کا سایہ ہمارے سروں پر قائم ہے اس وقت تک ہمیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ نے ایران میں دفتر امام سے رابطہ کیا اور چند روز بعد مجھے وضاحت سے آگاہ فرمایا۔

میں نے ''سفیر نور'' کتاب میں علامہ سید عارف حسین الحسینی شہید کی امام خمینیؒ سے عقیدت کے واقعات نقل کیے مگر مجھے ذاتی طور پر کبھی امام خمینیؒ کی ذات پر گفتگو کے دوران میں شہید حسینی کے چہرے کے تاثرات نوٹ کرنے کا موقع نہ ملا۔ میری زندگی میں ڈاکٹر محمد علی نقوی شہید وہ واحد انسان تھے جن کے لبوں پر امام کا ذکر آتے ہی ان کے چہرے پر پھول کی سی تازگی آجاتی تھی۔

قارئین پر یہ واضح رہے کہ ڈاکٹر صاحب امام خمینیؒ کو غیر معصوم سمجھتے تھے اور شیعہ عقیدہ کے مطابق وہ بارہ آئمہ کے قائل تھے۔ مگر امام خمینیؒ کو آئمہ کا نائب یا ان کا جانشین اور ان کی فکر کا پیغامبر ضرور سمجھتے تھے۔ آپ کی نظر میں امام خمینیؒ کی ذات نائب امام زمانہؑ کی حیثیت رکھتی تھی جس کے بارے میں امام آخرالزمانؑ کی وصیتیں واضح ہیں کہ ''ہمارے بعد نائبین آپ پر جبکہ ہم ان پر خدا کی طرف سے حجت ہوں گے'' چنانچہ ڈاکٹر صاحب امام خمینیؒ کی حیثیت کے بارے بالکل واضح تھے اور وہ دل و جان سے امام خمینیؒ کی بات کو اپنے لئے حجت سمجھتے تھے۔

انقلاب کی آمد کے بعد جب کچھ مخالف قوتوں نے یہ محسوس کیا کہ پاکستان میں انقلاب اسلامی کا اثر بڑی تیزی سے سرایت کر رہا ہے تو انھوں نے مختلف ہتھکنڈوں سے انقلاب اور امام خمینیؒ کی مخالفت کرنا شروع کر دی۔ ایسے میں استعماری قوتوں کے ایجنٹوں نے ہمارے درمیان سے چند روایتی لیڈروں اور علماء کو استعمال کیا۔ اختلاف میں تیزی آئی تو علماء حقہ اور علماء سو کی اصطلاحات سامنے آگئیں۔ ایک مرتبہ جب ڈاکٹر صاحب سے پوچھا گیا کہ علماء حقہ اور علماء سو کی پہچان کیا ہے۔۔۔؟ تو آپ نے فرمایا ''جو عالم دین ولی فقیہ امام خمینیؒ کی بالواسطہ یا بلاواسطہ مخالفت کرتا ہے وہ علماء سو میں سے ہے جبکہ وہ علماء جو خط امام کے پیرو ہیں وہ علماء حقہ ہیں اور ایسے علماء کی پیروی لازم ہے۔ آپ ہر محفل اور ہر جلسے میں نوجوانوں کو تاکید فرماتے کہ وہ ہر معاملہ میں خط امام کو پیش نظر رکھیں۔

۱۹۸۶ء میں جب امام خمینیؒ نے فرمایا ''ہر کس کہ می تواند بیاید بہ جبہ برود'' ''ہر وہ شخص جو طاقت رکھتا ہے محاذ پر پہنچے'' تو یہ صدا ڈاکٹر صاحب کے کانوں تک پہنچی اور آپ بغیر حیل و حجت محاذ پر جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ یہاں تک کہ آپ نے گھر والوں کو بھی اپنے پروگرام سے آگاہ نہ کیا بلکہ محاذ پر پہنچنے کے تیسرے روز فون کے ذریعہ اہل خانہ کو اطلاع دی کہ ''میں اس وقت محاذ پر ہوں'' یہاں سے آپ نے اپنے والد صاحب کو لندن خط تحریر فرمایا جس کا مفہوم کچھ یوں تھا ''اے والد بزرگوار۔۔۔ میں اس وقت ایران کے محاذ جنگ پر مجاہدین اسلام کی خدمت میں مصروف ہوں۔ میں آپ سے خط کے ذریعہ معذرت چاہتا ہوں کہ یہاں آتے وقت آپ سے اجازت نہیں لے سکا۔ چونکہ امام کی صدائے استغاثہ میرے کانوں تک پہنچ چکی تھی اور مجھے اپنی زندگی کی وفا کے بارے میں یقین بھی نہ تھا۔ اس لئے میں کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر یہاں پہنچ گیا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ مجھے معاف فرمائیں گے۔

میں آپ سے شہادت کی دعا کا ملتمس ہوں خدا کرے کہ مجھے ان پاکباز نوجوان کے ساتھ شہادتوں کے پرسرور ماحول میں شہادت نصیب ہو۔''

جب آپ محاذ پر تھے آئی۔ایس۔او پاکستان کا وفد انقلاب کے مشاہدہ کے لئے وہاں

پہنچا۔ڈاکٹر صاحب اپنے ان برادران سے ملے تو وفد میں موجود برادر غلام حیدر حیدری سابق مرکزی آفس سیکرٹری آئی۔ایس۔او پاکستان نے آپ کو تنہائی میں بتایا کہ آپ کے اہل خانہ آپ کے لئے خاصے پریشان ہیں۔حیدری صاحب کی بات سن کر آپ نے جواب دیا ''میرے گھر والوں سے کہنا کہ میں بخیریت ہوں۔۔۔یہاں شہادتوں کا ماحول ہے۔۔۔کچھ روز قبل امام خمینیؒ سے ملاقات کر کے آئے ہیں اور ان کی دست بوسی کا اعزاز حاصل ہوا ہے۔میرا جی نہیں چاہتا کہ میں ایسے روحانی ماحول کو چھوڑ کر اور شہادت جیسی نعمتوں سے منہ موڑ کر واپس لوٹ آؤں۔''

حیدری صاحب نے قائل کرنے کی کوشش کی کہ اگر آپ یہاں رہے تو پھر پاکستان میں ایسا ماحول پیدا کرنے کے لئے کون آئے گا؟۔۔۔آپ نے وعدہ کیا کہ ''بشرط حیات جلد وطن لوٹ آؤں گا لیکن ابھی مجاہدین اسلام کے زخموں سے رستا لہو مجھے مسیحائی خدمات پر مجبور کر رہا ہے۔''

جب آپ پاکستان لوٹے تو پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط عزم و ہمت کے ساتھ باطل قوتوں سے برسر پیکار ہو گئے۔

آپ کی امام خمینیؒ سے محبت کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ اتحاد بین المسلمین کے پروگرام میں حالات کے پیش نظر چند احباب نے امام خمینیؒ کا نام لینے کے لئے رائے طلب کی۔تو آپ نے سختی سے ڈانٹتے ہوئے کہا کہ امام کے نام پر کسی قسم کی مصلحت عزیز نہیں ہے اور آپ احباب پر خفا ہوئے کہ آخر آپ نے ایسا سوچا کیوں ہے روس کے سابق صدر گورباچوف کو اسلام کی دعوت اور گستاخ رسول سلمان رشدی کے خلاف امام خمینیؒ کے فتویٰ نے پورے عالم میں ارتعاش برپا کیا تو ڈاکٹر صاحب بے پناہ خوش ہوئے اور فرمانے لگے ''امام کے ہوتے ہوئے ایک طرف محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دین پھیل رہا ہے اور دوسری جانب گستاخان محمدؐ پر غضب طاری ہے۔گویا امام خمینیؒ قرآن کریم کی اس آیت کی تفسیر ہیں جس میں ارشاد رب العزت ہے کہ ''مسلمان آپس میں نہایت نرم اور کفار پر بڑے سخت ہیں۔''

آپ کی کوشش رہی کہ انقلاب اسلامی ایران کی کوئی خدمت سامنے ہو اور آپ اس کے لئے زحمات برداشت کر کے سرخرو ہوں۔آپ سے جہاں تک ہو سکا آپ نے پاکستان اور ایران

میں بے نظیر خدمات سرانجام دیں۔نظریاتی، فکری، اقتصادی اور سیاسی تعاون کے لئے بھی آپ نے انقلاب اسلامی ایران کی یادگار خدمت کی۔

انقلاب اسلامی ایران کے بعد جب آیت اللہ طاہری پاکستان میں نمائندہ امام خمینیؒ کی حیثیت سے تشریف لائے اور انھوں نے ''جامعۃ المنتظر'' میں دروس کا سلسلہ شروع کیا تو ڈاکٹر صاحب نے نماز صبح کے بعد باقاعدہ سے ان کے دروس میں شرکت فرمائی اور احباب کو بھی آگاہ کیا کہ ''نمائندہ امام کے دروس انقلاب پرور ہیں بلکہ مجھے تو ان سے امام خمینیؒ کی خوشبو آتی ہے۔''

سفیر انقلاب کا اسلامی انقلاب سے لگاؤ تین بنیادوں پر تھا جس کا اظہار انھوں نے ۱۱ فروری ۱۹۹۰ء میں روزنامہ جنگ لاہور کے خصوصی ایڈیشن برائے انقلاب اسلامی ایران میں یوں فرمایا کہ ''ایران کا اسلامی انقلاب قیادت، نظریہ اور قربانیوں کا ثمر ہے۔جب تک وہاں کے عوام ان بنیادی، اصولوں پر قائم ہیں ہم اس وقت تک ان کا ساتھ دیتے رہیں گے کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ انقلاب کی بقاء ان اصولوں میں مضمر ہے۔''

۱۹۹۰ء میں ایک مرتبہ راقم نے ایرانی قونصل خانہ لاہور کے عملہ کے رویہ کے خلاف قونصلیت جنرل آقای علی قمی کے نام کھلا خط لکھا۔جس میں پاکستانی مسلمان اور انقلاب کے حمایتی نوجوان کے حوالہ سے مہذب مگر سخت زبان استعمال کی۔جب یہ خط لاہور میں پھیلا تو قونصلیٹ جنرل نے ہم سے رابطہ کرنے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب سے بھی اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ڈاکٹر صاحب مجھے ملے تو کہنے لگے ''یہ جو کچھ آپ نے لکھا ہے حقائق۔۔۔؟'' میں نے کہا ''میں ثبوت کے ساتھ یہ ساری چیزیں پیش کر سکتا ہوں'' تو فرمانے لگے ایرانی فرشتے نہیں ہیں۔اگر آپ کسی موقع پر محسوس کریں کہ ان کے اقدامات سے انقلاب اسلامی کے تشخص کو مجروح کیا جا رہا ہے تو آپ ضرور تنقید کیا کریں کیونکہ ہم امام کے سپاہی ہیں اور جہاں بھی کوئی نقص یا کمی دیکھیں اسے دیانتداری کے ساتھ سلجھائیں۔''

خانہ فرہنگ ایران کے سابق ڈائریکٹر جنرل صادق گنجی شہید کے بعض اقدامات پر ڈاکٹر صاحب اخلاف رکھتے تھے کہ گنجی صاحب کے بعض ایسے افراد سے تعلقات ہیں اور ایسے

لوگوں کی محفلوں میں دیکھے جاتے ہیں جن کو اسلامی معاشرہ احترام کی نظر سے نہیں دیکھتا اسلامی انقلاب کے سفیروں کا تشخص اسلامی حوالے سے ہونا چاہیے نہ کہ کلچر کو فروغ دیتے دیتے وہ قابل اعتراض کلچر میں گر جائیں۔''

انقلاب اسلامی کے ابتدائی سالوں میں پاکستان کے ایک معروف شاعر نے ''ہفت روزہ رضا کار لاہور'' میں انقلاب کے بارے میں ایک نظم شائع کرانا چاہی تو ڈاکٹر صاحب نے تجویز دی کہ اگر شاعر کا نام شائع کیے بغیر ممکن ہو تو شائع کر دیں۔ سب ایڈیٹر نے جواز پیش کیا کہ شاعر کے نام سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ڈاکٹر صاحب نے جواباً فرمایا: ''اے عزیز دوست انقلاب اسلامی باکردار شخصیات کی بدولت آیا ہے اور اس کی حفاظت اور ترویج باکردار لوگوں کو کرنی چاہیے۔ یہ شاعر امام کی تعریف تو لکھتے ہیں مگر پاکستان میں ان کے نمائندہ کی مخالفت کرتے ہیں۔''

۶ جولائی ۱۹۸۷ء کی قرآن وسنت کانفرنس کے اجتماع کے لئے جلسہ گاہ کے اہم اور حساس مسئلہ پر علامہ سید عارف حسین الحسینی کی تجویز پر ان کے تمام رفقاء نے اختلاف کیا اور ڈاکٹر صاحب بھی دلی طور پر قائد کی تجویز سے مختلف تھے۔ مگر جونہی قائد نے ڈاکٹر صاحب کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ میری رائے یہ ہے کہ کانفرنس ''مینار پاکستان'' پر منعقد ہونی چاہیے تو ڈاکٹر صاحب نے لبیک کرتے ہوئے حامی بھری اور اپنے قریبی ساتھی سے کہا ''اس شخص کی بات تین حوالوں سے ہم پر حجت ہے۔ ایک یہ کہ یہ ہمارے قائد ہیں دوم یہ کہ ہمیشہ ان کی ہر بات کے پیچھے کوئی اور طاقت گویا ہوتی ہے اور سوم یہ کہ یہ امام خمینیؒ کے نمائندہ ہیں۔ لہٰذا ان کی کسی بات کے آگے چون وچرا گناہ کرنے کے مترادف ہے۔''

یہ آپ کی امام خمینیؒ سے محبت کا نتیجہ تھا کہ دنیا بھر میں امام کے نمائندگان سے آپ کے روابط تھے اور آپ ان کے امر کی تعمیل بھی لازم سمجھتے تھے۔

۱۹۸۶ء میں جب آیت اللہ سید علی خامنہ ای صدر اسلامی جمہوریہ ایران کی حیثیت سے سرکاری دورہ پر پاکستان آئے تو لاہور میں ان کے استقبال کے تمام انتظامات ڈاکٹر صاحب کی گرفت میں تھے۔ جب وہ کسی وجہ سے اسلام آباد سے لاہور مقررہ دن پر تشریف نہ لائے بلکہ

ان کی آمد کو ایک روز کی تاخیر ہوگئی تو استقبالی ہجوم سے ڈاکٹر صاحب نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ''ہمارے معزز مہمان کل تشریف لائیں گے لہٰذا دور دراز سے آئے ہوئے لوگوں کو گھروں کو واپس نہیں لوٹ جانا۔ یہ صدر ایران کا استقبال نہیں بلکہ امام خمینیؒ کے نمائندہ کا استقبال ہے۔ لاہور والے حضرات کو چاہیے کہ وہ باہر سے آئے ہوئے برادران کو اپنے گھروں میں لے جائیں اور ان کی مہمان نوازی کریں۔''

دوسرے روز جونہی نمائندہ امام خمینیؒ لاہور ایئرپورٹ پر آئے تو ڈاکٹر صاحب اور آپ کے احباب نے ان کا مثالی استقبال کیا اور اس موقع پر ''مرگ بر امریکہ اور یار اامام خوش آمد'' کے فلک شگاف نعرے بلند ہوئے۔ اس تاریخی استقبال کے بعد ڈاکٹر صاحب انتہائی پرمسرت تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ ''یقیناً'' امام خمینیؒ خوش ہوں گے کہ اسلامیان پاکستان نے ان کے نمائندہ کو دل کی گہرائیوں سے خوش آمدید کہا ہے۔''

ڈاکٹر محمد علی نقوی کی امام خمینیؒ اور انقلاب اسلامی سے محبت وعقیدت ''لاریب'' تھی۔ آپ بہت جری اور مضبوط اعصاب کے مالک انسان تھے۔ بڑے بڑے حادثوں میں آپ کے چہرے پر شکن تک نہیں آئی تھی۔ مگر جب آپ نے امام خمینیؒ کی رحلت کی خبر سنی تو آپ آئی۔ ایس ۔او کے مرکزی دفتر ۲۔ بھلہ سٹاپ پہنچے۔ وہاں پر موجود برادران جونہی پرسہ دینے کے لئے ڈاکٹر صاحب کی طرف بڑھے تو آپ کی دھاڑیں نکل گئیں۔ جبکہ ڈاکٹر صاحب اپنے والدین کی وفات پر صرف اشکبار ہوئے یہ نہیں کہ انھیں اپنے والدین کے فراق کا غم نہیں تھا بلکہ وہ خود فرماتے تھے کہ ''میرے والدین کی رحلت نے مجھے یتیم کیا تھا جبکہ امام خمینیؒ کی رحلت نے مسلمانان عالم کو یتیم کیا ہے۔ اس لئے یہ صدمہ ذاتی صدمات سے بہت بھاری ہے۔''

امام خمینیؒ کی رحلت پر مولانا کوثر نیازی مرحوم نے فارسی میں ایک شعر لکھا۔

حال ما در ہجر رہبر کم تر از یعقوب نیست
او پسر گم کردہ بود ما پدر گم کردہ ایم

(ترجمہ: رہبر کے ہجر میں ہماری حالت حضرت یعقوبؑ سے ہرگز کم نہیں

ہے۔ان سے ان کا بیٹا جدا ہوا تھا جبکہ ہم سے ہمارا باپ بچھڑ گیا ہے۔)

جب ڈاکٹر صاحب نے سیاہ بینر پر لکھا ہوا یہ شعر پڑھا تو فرمایا ''اس عبد خدا نے ہماری ترجمانی کی ہے۔''

سفیر انقلاب نے لاہور میں اسلامی انقلاب کی چودھویں سالگرہ پر امام خمینیؒ کی ذات کے بارے میں صاحبزادہ خورشید احمد گیلانی کا مراسلہ سنا جو بہترین لفظوں سے مزین اور عقیدت کی خوشبو سے معطر تھا تو فرمانے لگے کہ آج کے اس جلسہ میں ہمارے (شیعہ) کسی مقرر نے وہ فکر نہیں دی جو گیلانی صاحب کے مراسلہ میں تھی گیلانی صاحب کی محنت نے جلسہ کا حق ادا کر دیا ہے۔'' ہم گاڑی میں روانہ ہوئے تو کہنے لگے ''تسلیم میاں! آئندہ آپ بھی ایسے ہی خوبصورت اور بامقصد مراسلات لکھنے اور پیش کرنے کی کوشش کریں کیونکہ امام کی خوبصورت فکر کو اگر خوبصورت الفاظ اور خوبصورت انداز میں پیش کیا جائے تو پیغام میں اثر پیدا ہو جاتا ہے۔''

امام خمینیؒ کی ذات سے آپ کے عشق کا اثر براہ راست آپ کے بچوں پر بھی تھا۔ایک مرتبہ ہم چار پانچ احباب تحریک نفاذ فقہ جعفریہ کے صوبائی دفتر میں بیٹھے تھے کہ ڈاکٹر صاحب کے دو سالہ معصوم بیٹے موسیٰ رضا بھی آ گئے۔ڈاکٹر صاحب نے موسیٰ کو گود میں لیا اور کمرہ میں لگی ہوئی تین تصاویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا ''موسیٰ امام کی تصویر کونسی ہے۔تو موسیٰ نے انگلی کے اشارہ سے امام کی تصویر بتائی۔ہم نے اخذ کیا کہ ایسا معصوم بچہ جس نے ابھی تک زبان نہیں کھولی مگر کھلی آنکھوں سے امام کی معرفت کر لی ہے۔اسی طرح آپ کے دو بچے سلمان اور دانش جب بھی آئی۔ایس۔او کے کنونشن میں آتے تو ان کے سینے پر امام کی تصویر ضرور لگی ہوتی تھی۔

جس قدر ڈاکٹر صاحب انقلاب اور امام سے عشق رکھتے تھے اس قدر امام با انقلاب کی اعلیٰ شخصیات کو بھی آپ کی معرفت اور آپ سے محبت تھی۔کراچی میں مقیم آیت اللہ سید علی خامنہ ای کے نمائندہ آقا بہاء الدینی نے ایک بھری محفل میں فرمایا کہ ''میں نے پاکستان میں ایک نوجوان بھی ایسا نہیں دیکھا جو امام خمینیؒ اور انقلاب اسلامی ایران سے عشق رکھتا ہو اور اس کا تعلق ڈاکٹر محمد علی نقوی سے نہ ہو۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام کی محبت کا اصل محور ڈاکٹر نقوی کی ذات ہے۔''

ان سے جب ایران میں ڈاکٹر صاحب کے بارے میں تاثرات لئے گئے تو انھوں نے فرمایا کہ ''ڈاکٹر صاحب سے ان کا تعلق عاشق معشوق کا تھا۔'' علامہ سید عارف حسین الحسینی کی شہادت کے بعد یہ اعزاز ڈاکٹر صاحب کی ذات کو حاصل ہے کہ ان کی شہادت پر ایران کی اعلیٰ شخصیات نے ذاتی طور پر تعزیت کی اور ایرانی نشر و اشاعت میں کئی روز تک آپ کی زندگی کے پہلو زیر بحث رہے۔

یہ بات بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ڈاکٹر محمد علی نقوی شہید نے شعوری طور پر امام خمینیؒ کی معرفت کی اور شعوری طور پر اپنے نظریہ پر قائم رہے۔وہ امام خمینیؒ کا اس قدر عرفان رکھتے تھے کہ انھوں نے ہمیشہ امام کے فرمان کو اپنے لئے واجب سمجھا اور اس کے جزیات نکالنے یا منطق تلاش کرنے کی کبھی کوشش نہ کی۔آپ کا نظریہ تھا کہ کسی شخصیت کو ایک بار درک کر لینے کے بعد اس کی ہر بات پر رائے قائم کرنا معرفت کے متضاد ہے۔

سفیر انقلاب کو قریب سے جاننے والے احباب آج بھی اس بات کے گواہ ہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے امام یا نمائندہ امام کے کسی فرمان سے بھی بال برابر انحراف نہیں کیا بلکہ ان کے ہر حکم کو واجب جان کر ادا کرنے کی کوشش کی۔آپ نے اپنے نظریہ سے وفا کی خاطر پولیس کے تشدد، گرد و پیش کے جبر، روزگار کے ستم، اپنوں کی زیادتیاں اور غیروں کے ظلم برداشت کیے۔۔۔آپ کے سر پر ضربیں، آپ کے نحیف جسم پر تشدد کے نشانات، آپ کے دل پر سینکڑوں زخم یہاں تک کہ آپ کے جسم میں پیوست گولیاں امام خمینیؒ سے عشق کا نتیجہ تھیں۔۔۔آپ نے ہر ظلم مسکرا کر سہا، وطن کے اندر اور وطن سے باہر مصائب و مشکلات کے کٹھن ترین مراحل سے گزرے مگر کسی بھی مرحلہ پر آپ کے پاؤں میں لغزش پیدا ہوئی نہ چہرے پر کوئی شکن نظر آئی۔۔۔آپ نے زندگی کا ہر مشکل مرحلہ فراموش کیا مگر امام خمینیؒ کی ملاقات اور ان کی دست بوسی آپ کے لئے سرمایہ حیات بن گئی۔

ڈاکٹر صاحب کی ذات رازوں کا سمندر تصور کی جاتی تھی جو بات ان کے دل تک پہنچ جاتی یا ذہن کی لوح پر لکھی جاتی، لبوں سے اس کا اظہار بہت مشکل ہو جاتا تھا۔مگر امام سے ملاقات کے لمحات کو انھوں نے کئی بار اپنے احباب کے سامنے دہرایا اور ہر بار نئی لذت حاصل کی۔سفیر

انقلاب بتایا کرتے تھے کہ جب وہ ایران کے محاذ پر مصروف خدمت تھے تو ایک روز ان کے لشکر کو ''جماران'' قم لایا گیا تا کہ وہ زیارتیں اور سیر وتفریح کرلیں جب یہ لشکر اسلام امام خمینیؒ کے علاقہ میں پہنچا تو انھیں اچانک یہ خبر دی گئی کہ آج ان کی ملاقات امام سے کرائی جائے گی۔ یہ خبر سن کر مجاہدین کے فرط مسرت سے آنسو چھلک پڑے۔ ڈاکٹر صاحب اپنی حالت بیان کرتے تھے کہ ان کی داڑھی اور بال بڑھے ہوئے تھے۔ ان کا کوٹ بھی ستھرا نہ تھا۔ پینٹ کی حالت تو ویسے ناگفتہ بہ تھی۔ مگر یہ باتیں اور خیالات مر چکے تھے صرف اور صرف امام کی زیارت کا اشتیاق زندہ تھا۔ چنانچہ مجاہدین وقت مقررہ سے قبل ملاقات گاہ تک پہنچ گئے۔ آخر امام تشریف لائے۔ باری باری انھوں نے مجاہدین سے مصافحہ کیا اور دعا دی۔ عاشق امام فرماتے تھے کہ ''انھیں امام کی دست بوسی کی لذت اور سرور تا زیست نہیں بھولے گا بلکہ جب بھی تصور میں وہ لمحات آتے ہیں وہی لذت حاصل ہونا شروع ہوجاتی ہے''

ہر وہ محفل جس میں امام کا ذکر ہوتا آپ کی پسندیدہ محفل ہوتی تھی اور وہ افراد جو امام اور ان کی فکر کا تذکرہ کرتے تھے آپ کو محبوب لگتے تھے۔ آپ کی خواہش ہوتی تھی کہ امام کا ذکر وسیع پیمانے پر ہو اور ان کا آفاقی پیغام بلا تفریق تمام مسلمانوں بلکہ غیر مسلم تک بھی پہنچے۔ ایسی محافل جس میں امام کی ذات کو محدود کرنے کی کوشش کی جاتی آپ کو بھلی نہ لگتی تھیں۔ بلکہ آپ فرماتے کہ جو شخص امام کی فکر یا ذات کو شیعہ دائرہ میں محدود کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ ظلم کرتا ہے۔ ایک موقع پر آپ نے کسی کا واقعہ نقل کیا کہ وہ شخص امام کی برسی پر ایران گیا تو امام کے مزار کے گرد چند سکھوں کو ماتم کرتے دیکھا۔ جب اس نے سکھوں سے گریہ وماتم کی وجہ پوچھی تو انھوں نے بتایا کہ امام خمینیؒ ایرانیوں کے امام (قائد) نہیں تھے بلکہ وہ دنیا کے تمام حریت پسند انسانوں کے امام تھے کیونکہ انھوں نے موجودہ زمانہ کے حبس زدہ ماحول میں ہمیں سانس لینے کا فن سکھایا تھا۔''

عاشق امام، سفیر انقلاب کی دلی خواہش تھی کہ دنیا کا ہر مظلوم، ہر محکوم، ہر مستضعف امام خمینیؒ کو اپنا امام (رہبر) تسلیم کرے اور ان کی صدا پر لبیک کہہ کر وقت کے ہر ظالم، ہر حاکم، ہر جابر ہر فاسق وفاجر سے ٹکرا جائے۔

ایک موقع پر امام کے حوالہ سے آپ نے اپنی تشنہ مسرت کا ذکر فرمایا کہ ''کاش بیت المقدس امام کے ہاتھوں آزاد ہوتا اور امام اس میں نماز کی امامت کراتے اور ہم ان کی اقتداء میں نماز ادا کرتے۔''

چونکہ ڈاکٹر صاحب مزاجاً غیور، حریت پسند اور حق پرست مجاہد تھے۔ اس لئے امام خمینیؒ کے بارے میں آپ کا نظریہ کچھ یوں تھا کہ

عطا کیا ہے ہمیں اس نے زندگی کا شعور
یہ سانس لینے کا ہم کو ہنر دیا اس نے
شفق کے رنگ بکھیرے ہیں اس نے عالم پر
سیاہ شب کو لباسِ سحر دیا اس نے

جونہی آپ کی شہادت کی خبر ایران، شام لبنان موصول ہوئی تو متعدد تنظیموں نے آپ کی شہادت پر تعزیتی پوسٹرز اور پمفلٹ شائع کروائے۔ ان ممالک میں آپ کی مجالس تراحیم منعقد ہوئیں اور ایران میں آپ کے صاحبزادے سید محمد سلمان نقوی نے پروگرام میں شرکت کی۔ ذرائع ابلاغ میں آپ کی شہادت کا کئی روز تک ان الفاظ میں تذکرہ ہوتا رہا کہ ''پاکستان کے نوجوانوں کی امید، انقلاب اسلامی کے پرستار، امام خمینیؒ اور شہید حسینی کے جانثار ساتھی، امریکہ کے کٹر دشمن اور پاکستان کے ڈاکٹر مصطفی چمران وطن اور اسلام دشمن قوتوں کے ہاتھوں شہید ہوگئے۔''

☆☆☆☆☆

تحریک جعفریہ وسفیر انقلاب

۶ جولائی ۱۹۷۷ء کو ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت معزول ہوئی تو اس کی کوکھ سے جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء نے جنم لیا۔ بھٹو کے خلاف ''قومی اتحاد'' کی تحریک کی حرارت کو محسوس کرتے ہوئے ضیاء الحق نے نظام مصطفی کے نفاذ کا اعلان کر دیا۔ چونکہ ''قومی اتحاد'' میں شامل تمام مذہبی جماعتوں کا تعلق ''فقہ حنفی'' سے تھا۔ اس لئے ضیاء الحق نے نظام مصطفی کو بھی ''فقہ حنفی'' کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی جو مکتب اہل بیت کے پیروکاروں پر گراں گزری۔ فقہ جعفریہ سے تعلق رکھنے والی ملک کی اہم اور موثر آبادی کو نظام مصطفی کے نفاذ پر قطعاً اعتراض نہ تھا بلکہ یہ ان کی دیرینہ خواہش تھی مگر وہ اپنی فقہ پر دوسری فقہ کے تسلط کے حق میں نہ تھے۔ اہل تشیع کا مطالبہ تھا کہ

ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کے بعد ہر فقہ کے پیروکاروں کے فیصلہ جات اس کی فقہ کے مطابق ہوں جبکہ ضیاء الحق اپنے مفادات اور مخصوص مقاصد کی تکمیل کے لئے ایک سمت میں بہے جا رہا تھا۔

علامہ مفتی جعفر حسین مرحوم جو اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن تھے نے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے مقاصد کو درک کرتے ہوئے نظریاتی کونسل کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا اور قومی حقوق کے تحفظ کے لئے متحرک ہو گئے۔

حالات کے تیزی سے بدلتے ہوئے تیور دیکھ کر ملت جعفریہ کے عمائدین نے ماضی کی طرح حکومت کے عزائم کے خلاف تحریک چلانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ ۱۲، ۱۳ اپریل ۱۹۷۹ء کو بھکر میں پوری قوم کو اکٹھا کر کے اسے حکومت کے عزائم سے آگاہ کیا گیا۔ جب پوری قوم نے قائد کے افکار سے اتفاق کیا تو ''تحریک نفاذ فقہ جعفریہ پاکستان'' کا قیام عمل میں آ گیا۔

چونکہ میرا مقصد یہاں تحریک جعفریہ کا تاریخی پس منظر اور حالات لکھنا نہیں بلکہ اس کی پوری تفصیل ''سفیر نور'' میں شائع ہو چکی ہے۔ لہٰذا ہمیں اس پوری تاریخ میں ''سفیر انقلاب'' کے کردار کو تلاش کرنا ہے اور دیکھنا یہ ہے کہ ایک نوجوان نے قومی معاملات میں کس طرح اٹھان لی، اس کی اٹھان میں کتنا درد تھا، وہ کن کن مراحل سے گزرا، کہاں سے چلا اور کہاں تک چلا۔۔۔؟

جب علامہ مفتی جعفر حسین نظریاتی کونسل کے رکن تھے تو سفیر انقلاب اپنے چند برادران کے ہمراہ مفتی صاحب کو قائل کرتے تھے کہ حکومت کے کسی عہدہ پر رہ کر حکومت کے خلاف تحریک چلانا ناممکن نہیں تو بصد مشکل ضروری ہے۔ چنانچہ مفتی صاحب کو استعفیٰ کے مرحلہ پر لانے میں نوجوان گروپ کا گہرا عمل دخل ہے۔

بھکر کے اجتماع کا اعلان ہوا تو آئی۔ایس۔او پاکستان نے تمام تر انتظامات اپنے ہاتھوں میں لئے اور قوم کو سرخرو کرنے کی ٹھان لی۔ سفیر انقلاب ڈاکٹر محمد علی نقوی جو اس وقت اپنی پیشہ وارانہ زندگی کا آغاز کر چکے تھے۔ لاہور میں بیٹھے ملک بھر سے مربوط رہے اور لحہ بہ لحہ بھکر کے انتظامات سے آگاہ ہوتے رہے۔

کنونشن سے ایک روز قبل سفیر انقلاب اپنے اہم تنظیمی احباب کے ہمراہ بھکر پہنچے۔ وہاں

کے منتظمین سے ملے، اپنے تنظیمی نوجوانوں کی محنتوں کو سراہا اور اہم برادران کے ساتھ لائحہ عمل تیار کیا۔

۱۲ اپریل کو ملک بھر سے قافلے بھکر پہنچنا شروع ہوئے تو آئی۔ایس۔او کے نوجوانوں نے انھیں خوش آمدید کہا اور جلسہ گاہ کو اپنی گرفت میں رکھا۔ایک موقع پر جلسہ کے دوران تیز آندھی آئی تو سفیر انقلاب نے سٹیج پر کھڑے ہو کر صدا بلند کی ''دوستو! پولز کو مضبوطی سے تھام لو۔آج سے تمھارا پہلا امتحان شروع ہے اگر معمولی سی آندھی نے قوم کے سروں پر شامیانے گرا دیئے۔تو پھر ثابت ہو جائے گا کہ تم مستقبل میں گرنے والے طوفانوں کو بھی نہیں روک سکتے۔'' آپ کے یہ جملے سن کر نوجوان پولز سے چمٹ گئے اور آندھی کو شکست دی۔

۲۱ اپریل کو ''تحریک نفاذ فقہ جعفریہ پاکستان'' کا وجود عمل میں آیا اور اس کی قیادت علامہ مفتی جعفر حسین کو سونپی گئی۔جب مفتی صاحب کی قیادت کا اعلان ہونے کا وقت آیا تو ایک آدھ نامور خطیب سٹیج پر آئے اور کہنے لگے ''مفتی صاحب ہمارے برخوردار ہیں، علامہ مرزا یوسف حسین لکھنوی کی موجودگی میں قیادت کا اہل اور کون ہو سکتا ہے۔۔۔؟'' یہ وہ پہلا موقع تھا جب سفیر انقلاب سٹیج کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ سن کر اپنے چند نظریاتی احباب کے ساتھ اٹھے اور با آواز بلند نعرہ لگایا۔

ایک ہی قائد، ایک ہی رہبر مفتی جعفر، مفتی جعفر

پھر یہ نعرہ اس شد و مد سے بلند ہوا کہ مخالفین کی آواز شور میں دب گئی اور قوم کو ایک پاکباز، جری، بے داغ اور صاحب درد قائد میسر آیا۔

سفیر انقلاب اور ان کے رفقاء کا یہ نعرہ سند بن گیا اور ہر اس مقام پر گونجا جہاں کہیں قیادت کے خلاف کسی بھی جعلی قیادت نے سر اٹھانے کی کوشش کی۔اپریل ۱۹۸۲ء کو ڈیرہ غازی خان کے ایک معروف جلسہ میں جب عقیل ترابی کے لئے جلسہ کے بانی نے ''قائد ملت جعفریہ'' کا جملہ ادا کیا تو اس وقت آئی۔ایس۔او کے نوجوان اٹھے اور انھوں نے وہی نعرہ بلند کیا۔

ایک ہی قائد، ایک ہی رہبر مفتی جعفر، مفتی جعفر

جب منبر مجالس پر گرفت رکھنے والے پیشہ ور مقررین، قصر قیادت میں دراڑیں نہ ڈال سکے تو انھوں نے قیادت سے مربوط علماء حقہ کے خلاف عقائد کی جنگ کا آغاز کر دیا تا کہ سادہ لوح عوام جذبات کی رو میں بہہ کر اپنے ہاتھوں سے اپنی تباہی کی داستان رقم کریں۔جنگ کے بنیادی نکات آئمہ سے مدد طلب کرنا، عزاداری و زنجیر زنی، تخلیق آئمہ، تشہد میں شہادت ثالثہ اور سیدہ کا غیر سید سے نکاح وغیرہ وغیرہ تھے۔ چار پانچ سال تک اختلافات کا زہر اس قدر پھیلا کہ پوری ملت جعفریہ مسموم ہو گئی۔

جارحیت کرنے والوں کا نشانہ علماء حقہ بنے۔قوم واضح طور پر دو گروہوں میں تقسیم ہوئی۔ جارح ''غالی'' اور نشانہ بننے والے ''مقصرین'' ٹھہرے۔منبر پر مسلط افراد نے مدارس اور مساجد میں بیٹھے ہوئے علما کے خلاف اس قدر زہر اگلا کہ انبیا کے وارث علما پر سب و شتم تک ہونے لگا۔

جب نوبت یہاں تک پہنچی تو سفیر انقلاب تڑپے اور اپنے احباب کو اکٹھا کر کے فرمایا:

مسافران گرفتہ دل! پھر علم اٹھاؤ
کہ زائچوں کی عبارتیں پھر بدل گئی ہیں

آپ نے مرکزی احباب کو صورتحال، پس منظر اور مستقبل کے خدشات سے آگاہ کیا اور ان سے اس خواہش کا اظہار فرمایا کہ ''وہ عقائد کی طوفانی جنگ میں علماء حقہ سے مربوط ہوں اور قوم کی رگوں میں پھیلی ہوئی زہر کا تریاق معلوم کریں۔سب سے پہلے خود کو مطمئن کریں اور پھر دلائل کے ہتھیاروں سے لیس ہو کر معاشرہ میں نکلیں اور تمام تر اعتراضات کا جواب دیں۔''

ڈاکٹر صاحب نے ان حالات میں علماء سے استفادہ کیا اور قوم میں رخنہ پھیلانے والوں کی تہہ تک پہنچے۔آپ نے حقائق اور انکشافات پر مبنی کتب اور رسائل کا ایک تھیلا بنایا جسے لے کر آپ ہر متاثرہ مقام تک گئے۔ یہ تھیلا ہر وقت آپ کے ساتھ ہوتا تھا اور آپ جب بھی کسی قومی اجتماع میں پہنچتے یا کسی محفل میں جاتے تو آواز بلند کرتے ''عقیدے ٹھیک کروالو۔عقیدے ٹھیک کروالو'' چنانچہ آپ کا یہ تھیلا ''عقائد کا تھیلا'' مشہور ہو گیا۔

آپ نے طوفانی حالات میں نہایت صبر اور بے جگری سے جنگ لڑی جہاں بھی گئے دلائل

کے انبار لگا دیئے اور اعتراض کرنے والوں کو لاجواب کر کے قائل کیا۔ آپ کا موقف تھا کہ عقائد کی اس جنگ کے پیچھے استعماری ایجنٹ کارفرما ہے اور یہ سارا طوفان انقلاب اسلامی ایران کے خلاف برپا کیا گیا ہے۔ تاکہ دنیا بھر میں اس کے حمایتی نفاق کا شکار ہوں۔

ایک طرف سفیر انقلاب نے ملک بھر میں نظریاتی دوستوں کے تعاون سے عوام کو حقائق سے آگاہ کیا جبکہ دوسری جانب منبر پر امام خمینیؒ اور علماء حقہ کے خلاف شعلے اگلنے والوں کی زبان بند کی۔ ڈاکٹر صاحب کی نظریاتی فوج نے ملک بھر میں سازشی ٹولہ کا مجالس کے اندر اور باہر مقابلہ کیا اور انھیں زبان منہ میں رکھنے پر مجبور کر دیا۔ اس سلسلہ میں کئی نوجوان تشدد کا نشانہ بھی بنے یہاں تک کہ آئی۔ ایس۔ او پاکستان کے سابق مرکزی صدر برادر ثاقب نقوی بھی اس حادثہ کی زد میں آئے۔ ان کا جرم یہ تھا کہ انھوں نے محسن ملت علامہ سید صفدر حسین نجفی جیسی عظیم مرتبت شخصیت کے خلاف زبان دراز کرنے والے ایک معروف مقرر کی شدید مزاحمت کی تھی۔ جس کے بعد لاہور میں ایک ہنگامہ برپا ہوا اور کئی سالوں تک برادر ثاقب نقوی تنظیمی دائرے سے باہر رہے اور وہ ان لوگوں میں شامل ہو گئے جن کے بارے کہا جاتا ہے۔

وہ لوگ جو شب کی سلطنت میں ہتھیلیوں پر چراغ لائے
صلیب بردوش، آبلہ پا صعوبتوں کے حصار میں ہیں

سفیر انقلاب اور ان کے رفقاء نے ہر سطح پر قائد ملت جعفریہ علامہ مفتی جعفر حسین کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لئے شب و روز کوششیں کیں۔ چونکہ تحریک کے قیام کے ابتدائی ایام میں علماء کرام و عمائدین تنظیمی پلیٹ فارم پر زیادہ فعال نہ تھے اور نہ ہی تنظیمی ڈھانچوں اور تقاضوں سے زیادہ ہم آہنگ تھے۔ اس لئے آئی۔ ایس۔ او پاکستان اور آئی۔ او پاکستان کے تجربہ کار نوجوانوں نے بنیادی امور کو انتہائی محنت اور لگن سے نبھایا۔ تحریک کا پہلا دستوری ڈھانچہ تیار کرنے میں تنظیمی نوجوان نے بہت سی جماعتوں کے دستور پڑھے۔ فعال تنظیموں کے دستور اور پالیسیاں زیر غور لائیں، اپنے علماء کرام کی فکر کو درک کیا اور قومی تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھ کر ''دستوری ڈھانچہ'' پیش کر دیا۔ علماء کرام کی مشاورت اور نظارت کے بعد یہ دستور تیار ہوا جسے آج بنیادی اکائی کی حیثیت حاصل ہے۔

تحریک نفاذ فقہ جعفریہ پاکستان کے ابھی تنظیمی ادارے تشکیل نہیں پائے تھے کہ جنرل ضیاء الحق نے زکوٰۃ وعشر آرڈیننس جاری کر دیا۔ جس کی تشریحات مکتب تشیع کی ''فقہ'' سے متصادم نظر آئیں۔ چنانچہ تحریک کے قائدین نے ضیاء الحق کے فقہ جعفریہ کے خلاف بڑھتے ہوئے رجحانات کو روکنے کے لئے ۵ جولائی ۱۹۸۰ء کو اسلام آباد میں کنونشن کے انعقاد کا اعلان کیا۔

کنونشن کے انعقاد سے ایک ہفتہ قبل مرکزی صدر آئی ایس او مرکزی کابینہ کے تین ارکان کے ہمراہ راولپنڈی پہنچے۔ پنڈی روانہ ہونے سے قبل رات کو انھوں نے سروسز ہسپتال میں ڈاکٹر محمد علی نقوی سے ملاقات کی اور کنونشن کے انتظامات کا جائزہ لینے کے بعد مفصل منصوبہ بندی کی۔

کنونشن کے میزبان مسجد اثناعشری میں کنونشن کے انعقاد کا فیصلہ کر چکے تھے لیکن آئی ایس او کے مرکزی صدر نے اس جگہ کو ناکافی سمجھتے ہوئے یہ تجویز پیش کی کہ کنونشن ہا کی گراؤنڈ میں منعقد کیا جائے۔

۴ جولائی کو سہ پہر آئی ایس او، آئی او کے اراکین کی ایک میٹنگ زیر صدارت مرکزی صدر آئی ایس او غلام شبیر سبزواری مسجد اثناعشری میں ہوئی جس میں انتظامات کے لئے مختلف کمیٹیاں بنائی گئیں۔ گراؤنڈ میں کنونشن منعقد کرنا ایک حساس مسئلہ تھا لہٰذا اس کام کی ذمہ داری ڈاکٹر محمد علی نقوی نے سنبھالی اور وہاں موجود تمام افرادی قوت کو گراؤنڈ میں لے گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے گراؤنڈ میں ٹینٹ کھڑے کر دیئے گئے اور گراؤنڈ کو کنونشن کے لئے آمادہ کر دیا۔

۴ جولائی کی شام تک ہزاروں کی تعداد میں محبان اہل بیتؑ اسلام آباد پہنچ چکے تھے۔ ۴ اور ۵ جولائی کی درمیانی شب تحریک کی سپریم کونسل اور مشاورتی کونسل کا اجلاس ہوا۔ جس میں حکومت کی تمام مخالفت کے باوجود کنونشن اسلام آباد ہا کی گراؤنڈ میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور یہ فیصلہ کروانے میں آئی ایس او کے اراکین بالخصوص ڈاکٹر شہید کا بنیادی کردار تھا۔

۵ جولائی کی صبح آٹھ بجے جلسے کا آغاز ہوا جس کی صدارت قائد ملت جعفریہ مفتی جعفر حسین قبلہ نے فرمائی۔ ساڑھے دس بجے قبلہ مفتی صاحب نے خطاب کیا اور اعلان کیا کہ صرف علماء کا ایک احتجاجی مگر پرامن جلوس وزارت مذہبی امور کی طرف مارچ کرے گی۔ جب یہ جلوس روانہ ہوا

تو عوام نے شدید خواہش کے باوجود نظم وضبط کا ثبوت دیا اور جلوس میں جانے کی بجائے پنڈال میں موجود رہے۔ وزارت مذہبی امور میں مسٹر محمود اے ہارون وزیر مذہبی امور سے ملاقات ہوئی۔ ملاقات کے بعد وہ دو گھنٹے کا وقت لے کر چلا گیا اور پھر واپس نہ آیا۔ آخر کار مفتی صاحب واپس پنڈال تشریف لائے اور قوم کو تمام صورت حال سے آگاہ کیا اور پرامن طور پر سیکرٹریٹ کے گھیراؤ کا اعلان فرمایا۔

قبلہ مفتی صاحب کی پنڈال واپسی سے قبل آئی۔ ایس۔ او اور آئی۔ ایس۔ او کے پاکستان بھر سے آئے ہوئے جانثاروں میں سے ۹۰ جانثار کفن پہن کر اسٹیج پر پہنچ چکے تھے۔ ان کی سربراہی ڈاکٹر محمد علی نقوی کر رہے تھے۔ ان جانثاروں نے حضرت عباس علمدارؑ کے پرچم کی قسم کھا کر عہد کیا تھا کہ جان جاتی ہے تو جائے مگر پائے ثبات میں ذرہ برابر لغزش نہیں آئے گی۔ ان جانثاروں نے لاکھوں فدایان اہل بیتؑ کے سامنے جب یہ عہد دہرایا تو مومنین فرط جذبات سے دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے اور انھوں نے بھی عہد کیا کہ ان کفن پوشوں سے پہلے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کریں گے۔ الٰہی عہد کرنے والوں میں ایک نوجوان محمد حسین شاد بھی تھے جنھوں نے چند منٹ بعد اپنے نوجوان خون سے تاریخ کا ایک ناقابل فراموش باب رقم کیا اور تحریک نفاذ فقہ جعفریہ کو سرخرو کر کے سنت علی اکبرؑ ادا کی۔ کفن پوش جانثار جو بالکل نہتے مگر قوت ایمان سے لیس تھے۔ آنسو گیس کے شیلوں اور گولیوں کی پرواہ کیے بغیر پورے استقلال اور عزم کے ساتھ جلوس کے آگے چل رہے تھے اور مفتی صاحب قبلہ ایک کار میں اس عظیم جلوس کی قیادت فرما رہے تھے۔

یہ جلوس نہایت پرامن طریقے سے اپنی منزل کی طرف ابھی روانہ ہو ہی رہا تھا کہ پولیس نے مداخلت کی اور نہتے و پرامن مظاہرین پر اندھا دھند آنسو گیس کے شیل برسانے شروع کر دیئے مگر وہ قوم جس کے سامنے کربلا کی تاریخ ہو وہ قوم جو اپنے حق کے حصول کی خاطر اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہانے کا عہد کر چکی ہو۔ وہ قوم جو مرنا جانتی ہو اس کے سامنے یہ تمام حربے ہیچ ثابت ہوئے اور لاکھوں فدایان فقہ جعفریہ کا یہ عظیم الشان جلوس اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہا اس دوران آنسو گیس کا ایک شیل محمد حسین شاد آف شورکوٹ ضلع جھنگ کے سر پر آ کر لگا

جس سے وہ شہید ہو گئے۔ ان کے خون سے یہ پیغام لکھا گیا ''شہید کا جو خون ہے وہ قوم کی حیات ہے''۔ آخر کار ان مظاہرین نے سیکرٹریٹ کا مکمل گھیراؤ کر لیا اور ساری رات بارش میں مجلس و ماتم کرتے گزاری۔

تاریخ گواہ ہے پاکستان میں پہلی بار کسی جماعت نے مرکزی سیکرٹریٹ کا گھیراؤ کیا اور قوم شاہد ہے کہ اس گھیراؤ میں ڈاکٹر محمد علی نقوی کا کردار نمایاں تھا۔

۶ جولائی کو جب مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے ملت جعفریہ کے سامنے گھٹنے ٹیکے تو اس نے قائدین کو مذاکرات کی دعوت دی۔ علامہ مفتی جعفر حسین کی زیر قیادت پانچ رکنی وفد مذاکرات کیلئے ''پریزیڈنٹ ہاؤس'' پہنچا۔ ایک مرحلہ پر جب اس اعلیٰ وفد کو تاخیر ہوئی تو قوم میں یہ تاثر ابھرا کہ شاید قائدین اغوا یا محصور کر لئے گئے ہیں تو ان سنگین لمحات میں سفیر انقلاب اور ان کے رفقاء نے حکومت کو وارننگ دی کہ

''اگر ان کے قائدین کو ایک گھنٹہ کے اندر اجتماع میں نہ لایا گیا تو وہ مرکزی سیکرٹریٹ پر حملہ کر دیں گے۔'' سفیر انقلاب کے اس اعلان سے حکومت اس قدر لرزاں ہوئی کہ انھیں تحریک کے قائدین کو فی الفور عوام میں لانا پڑا۔

۶ جولائی کے مذاکرات کی کامیابی کے بعد علامہ مفتی جعفر حسین نے قوم کو مبارکباد دی اور انھیں ''معاہدہ اسلام آباد'' کے بارے میں بتایا کہ ''آج کے بعد حکمران ہماری فقہ پر کسی دوسری فقہ کو مسلط نہیں کریں گے اور ہر موقع پر فقہ جعفریہ کے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھیں گے۔''

اس عظیم فتح کے بعد سفیر انقلاب جب اسلام آباد سے لاہور کے لئے عازم سفر ہوئے تو راستے میں احباب سے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کی۔ احباب نے ان کی جرات کو خراج تحسین پیش کیا تو انھوں نے اپنے ضعیف قائد کی عظمت اور احباب کے ایثار کو سراہا۔ اس سفر میں آپ نے دیگر زاویوں کے علاوہ تین نکات پر روشنی ڈالی۔

۱۔ یہ کہ سیکرٹریٹ کے گھیراؤ کے مناظر کو زیر بحث لایا گیا اور پارا چنار کے مجاہد عالم دین علامہ سید عارف حسین الحسینی کی شخصیت اور جرات کی مدحت کی۔

۲۔ اس کنونشن میں ابھرے ہوئے قوم کے بین الاقوامی تشخص اور معیار کو برقرار رکھنے کی مستقل منصوبہ بندی کی خواہش کا اظہار فرمایا۔

۳۔ آپ نے احباب پر واضح کیا کہ ضیا الحق فطرتاً ایک کینہ پرور انسان ہے اور وہ شیعہ قوم سے اپنی اس شکست کا انتقام ضرور لے گا۔ چونکہ ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' اس کی سرشت میں ہے لہٰذا وہ ہمارے مقابلہ میں ایک متشدد گروہ تشکیل دے گا جو ہم سے ٹکر لے کر ہمارے تحرک کو محدود اور ہماری فکر کو مجروح کرنے کی بھرپور کوشش کرے گا۔

آخر وہی ہوا جو آپ کی دور اندیش نظروں نے دیکھا۔ علامہ سید عارف حسین الحسینی قائد بنے، قوم کے معیار اور تشخص نے بین الاقوامی سطح کو چھوا اور ضیا الحق نے مذہبی متشدد گروہ تشکیل دے کر ملت جعفریہ پر ضرب لگانے کی کوشش کی۔

معاہدہ اسلام آباد کے بعد ڈاکٹر صاحب اپنے احباب کے ایک وفد کے ساتھ علامہ مفتی جعفر حسین کی رہائش گاہ واقع گوجرانوالہ گئے جہاں ان سے مستقبل کی مستقل منصوبہ بندی کے بارے میں مفصل بات چیت کی۔ آپ کا موقف تھا کہ ''تحریک نفاذ فقہ جعفریہ پاکستان'' کے دائرہ کار کو بڑھا کر عوام کو اعتماد میں لیا جائے تاکہ وہ کسی بھی مرحلہ پر ظالم حکومت کا مقابلہ کر سکیں چونکہ مفتی صاحب تحریک کو ایک ملکی جماعت بنانے میں برق رفتاری کے قائل نہ تھے وہ چاہتے تھے کہ حکومت کی کروٹوں کے مطابق تحریک کو استوار کرنا چاہیے۔ انھیں یقین تھا کہ ضیا الحق بہت جلد اسلامی رٹ کو بھول جائے گا اور وہ ایک مقام پر آ کر اسلامی نظام کے نفاذ سے انحراف کا مرتکب ہوگا۔

تنظیمی نوجوانوں کا اصرار تھا کہ قائد ملت جعفریہ ملک گیر دورہ جات کر کے عوام سے رابطہ مہم کا آغاز فرمائیں اور انھیں تحریک کے اغراض ومقاصد سے آگاہ کریں۔ چنانچہ علما کرام اور عمائدین قوم سے مشورہ کے بعد مفتی صاحب نے دورہ جات کا سلسلہ شروع کیا جسے کامیاب بنانے میں آئی۔ ایس۔ او پاکستان نے سردھڑ کی بازی لگائی۔ مفتی صاحب جہاں بھی جانے کا ارادہ کرتے اس کی اطلاع ڈاکٹر محمد علی نقوی کو دیتے اور ڈاکٹر صاحب آئی۔ ایس۔ او کے پلیٹ فارم سے متعلقہ ڈویژن اور ضلع کو قائد کی آمد کی اطلاع پہنچا دیتے۔ یہی وجہ تھی کہ قائد ملت جعفریہ

جہاں تشریف لے جاتے ان کا والہانہ استقبال ہوتا اور عوام کے جم غفیر سے انھیں بات کرنے اور ان تک اپنا پیغام پہنچانے کا موقع میسر آتا۔

مفتی صاحب ابھی تحریک کا تنظیمی ڈھانچہ اور جماعتی بنیادیں استوار کر ہی رہے تھے کہ دست قضا نے ان کی زندگی کا رخ موڑ دیا اور وہ ۲۹ اگست ۱۹۸۳ء کو سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔

حضرت علامہ مفتی جعفر حسین مرحوم نے اپنی سوا چار سالہ قیادت میں اپنی بیماری اور ضعیف العمری کو بالائے طاق رکھ کر بے پناہ قومی خدمت کی۔ علم وحلم کا یہ بیکراں سمندر اپنی موجوں سے قوم کی کشتی کو کنارا عطا کر گیا۔۔۔ وہ کسی مقام پر مصلحت کا شکار ہوئے نہ کسی مرحلہ پر ظلم کی طرف داری کی۔۔۔۔ وہ پیرسالی میں بھی چٹانوں کی طرح آمریت کے سامنے سینہ سپر رہے اور قومی مفادات کو جان سے عزیز تر سمجھا۔۔۔ وہ زندگی کی جوان سانسوں سے روح کی تھرتھراتی منزل تک حکومت کے متعصّبانہ اقدامات سے برسرپیکار رہے۔ اس لئے۔

اس حسن پاکباز کی آتی ہے اب بھی یاد
نور سحر کے ساتھ کبھی چاندنی کے ساتھ

تحریک نفاذ جعفریہ پاکستان کی ناؤ کے پہلے ناخدا اس دار فانی سے رخصت ہوئے تو تاک میں بیٹھے ہوئے مخالفین کو مسند سنبھالنے کا موقع مل گیا۔ چنانچہ تحریک کے دستور کی پرواہ کیے بغیر اپنوں نے غیر دستوری قائد کی تاج پوشی کر دی اور راولپنڈی کی ''علی مسجد'' میں مولانا حامد علی موسوی کی دست بوسی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

جب یہ خبر ڈاکٹر محمد علی نقوی تک پہنچی تو آپ نے احباب کو اکٹھا کیا اور فرمایا:

اٹھو! وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

اس موقع پر آپ نے واضح کیا کہ عیار حکمران نے ۱۹۸۰ء کی شکست کا انتقام لینے کی ٹھان لی ہے کیونکہ جعلی قیادت کے گرد فوجی جرنیلوں اور خفیہ اداروں کی صورت حال میں انھیں پہلے سے کہیں زیادہ کام کرنے کی ضرورت ہے۔

۱۰ فروری ۱۹۸۴ء کو جب بھکر میں علامہ مفتی جعفر حسین کے جانشین کے انتخاب کے لئے اجلاس کا اعلان ہوا تو سفیر انقلاب ایک روز پہلے وہاں پہنچے اور عمائدین سے صلاح مشورے کرتے رہے۔ آپ وہاں پر ہونے والے فیصلہ جات اور اجلاس کی کارروائی سے مسلسل لاہور کے احباب کو آگاہ کرتے رہے اور ایک لمحہ وہ بھی آیا جب آپ کی حسرت عملی صورت میں سامنے آئی یعنی علامہ سید عارف حسین الحسینی قائد ملت جعفریہ منتخب ہو گئے۔

سفیر انقلاب قائد کا اعلان سنتے ہی لاہور روانہ ہوئے اور ان کے استقبال کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے کیونکہ دوسرے روز قائد نے لاہور پہنچنا تھا۔ ۱۱ فروری کو ''سفیر نور'' علامہ سید عارف حسین الحسینی کربلا گامے شاہ لاہور پہنچے تو ''سفیر انقلاب'' ڈاکٹر محمد علی نقوی نے احباب اور عوام کے ساتھ آپ کا والہانہ استقبال کیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب ''سفیر انقلاب'' نے ''سفیر نور'' کی دست بوسی کی۔

جب علامہ سید عارف حسین الحسینیؒ ''جامعہ المنتظر'' پہنچے تو ڈاکٹر صاحب نے اپنے چند معتمد احباب کے ساتھ ان سے نشست کی۔ جب قائد ملت جعفریہ کو افتخار ملت جعفریہ کا تعارف کرایا گیا تو انھوں نے فرمایا: ''ڈاکٹر صاحب کو کون نہیں جانتا۔''؟ مختصر ملاقات کے بعد جب ڈاکٹر صاحب احباب کے ساتھ گھر کو واپس لوٹے تو فرمانے لگے ''اس شخص کے لہجہ کا درد اور پیشانی کا نور شہید بہشتی اور شہید مطہری جیسا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ پاکستان جیسے ملک میں بھی ہمیں ایک روحانی قائد نصیب ہوا ہے۔''

آپ نے اپنے ان احساسات وجذبات کا اظہار ''مدرسہ آیت الحکیم راولپنڈی'' میں بھی قائد کے روبرو کیا تھا کہ ''ہم آپ کو شہید بہشتی اور شہید مطہری کی حیثیت سے دیکھتے ہیں'' آپ کے یہ جملے سن کر قائد ملت جعفریہ کی آنکھیں چھلک گئی تھیں۔ اگرچہ قائد نے اس وقت آپ کے لئے کوئی جملہ ادا نہ فرمایا تھا مگر یقیناً ان کے روح کی آواز یہی ہوگی کہ ''ڈاکٹر صاحب ہم بھی آپ کو ڈاکٹر مصطفی چمران کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔''

چونکہ سفیر نور اور سفیر انقلاب مزاجاً ہم آہنگ تھے اور ان حضرات کی فکر کے زاویے بھی تقریباً ایک جیسے تھے اس لئے شروع ہی سے ان کے دل ایک ساتھ دھڑکنا شروع ہو گئے اور یوں یک جان دو قالب کی عملی تصویر سامنے آئی۔

ابتدائی ایام میں سب سے بڑا مسئلہ حقیقی قیادت کے تعارف کا تھا جو خاصا مشکل اور محنت طلب تھا۔ کیونکہ عوام کے سامنے ایک قیادت کا اعلان ہو چکا تھا اور مجالس عزا میں معروف مقررین اس کا تعارف کرا چکے تھے۔ چونکہ اس وقت علامہ سید عارف حسین الحسینی کی قیادت سے مربوط علما کرام کی گرفت مخالف گروہ سے زیادہ نہ تھی۔ اس لئے عوام کو حقائق سے آگاہ کرنے کی تمام تر ذمہ داری آئی۔ ایس۔ او پاکستان اور آئی۔ او پاکستان کے دوش پر ٹھہری اور کچھ عرصہ بعد مدارس دینیہ کے طلبا کی تنظیم ''جمعیت طلبہ جعفریہ'' نے بھی خاصی معاونت کی۔

آغاز میں ڈاکٹر صاحب نے لاہور میں تحریک کے صوبائی دفتر کی ضرورت کو محسوس کیا تو 2 دیوسماج روڈ لاہور کرایہ پر لی گئی عمارت میں دفتر کھول لیا بعد میں اس عمارت کو امامیہ سنٹر کے عنوان سے خرید لیا گیا۔ جس کے لئے رقم آئی۔ ایس۔ او کی چند سالہ سالانہ بچت، آئی۔ ایس۔ او اور آئی۔ او کے عطیات سے فراہم کی گئی۔

امامیہ سنٹر میں تحریک نفاذ فقہ جعفریہ، امامیہ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن پاکستان اور امامیہ آرگنائزیشن پاکستان کے مرکزی دفاتر قائم ہوئے اور یہاں پر ہونے والے تمام امور کی سرپرستی ڈاکٹر صاحب نے فرمائی۔

جب یہ سنٹر عوامی رابطوں کا مرکز بنا تو اس وقت ڈاکٹر صاحب کی ملازمت ضلع شیخوپورہ میں تھی۔ آپ روزانہ گھر سے اسپتال جاتے اور واپسی پر سیدھا ''امامیہ سنٹر'' آتے اور رات گئے تک دفتری امور کا جائزہ لیتے۔ دفتر کی صفائی اور عملہ کی عوام سے ملنساری پر خصوصی توجہ دیتے۔ بسا اوقات یہاں ایسا بھی ہوتا کہ ڈاکٹر صاحب تھکے ہارے ملازمت سے آتے تو دفتر میں پڑے ہوئے برتن دھوتے اور دفتر میں جھاڑو تک دیتے۔ اس کتاب کے سلسلہ میں لئے گئے انٹرویو کے دوران میں میرے سامنے بیسیوں احباب نے روایت کی ہے کہ انھوں نے کئی بار ڈاکٹر صاحب کو اس دفتر کی نالیاں تک صاف کرتے دیکھا ہے۔

امامیہ سنٹر کے قیام کے بعد عیدالقربان کے موقع پر تحریک نفاذ فقہ جعفریہ لاہور نے قربانی کی کھالیں اکٹھی کرنے کی مہم چلائی۔ اس موقع پر ڈاکٹر صاحب دفتر میں فون پر تمام حامی مومنین

سے رابطہ میں مصروف تھے اور چند احباب کھالیں اکٹھی کر رہے تھے۔

چونکہ افراد کی کمی تھی اس لئے اگر کسی گھر سے کھال لے جانے کا فون آتا تو ڈاکٹر صاحب خود موٹر سائیکل پر سوار ہوتے اور کھال لے آتے۔ شام تک کھالیں اکٹھی ہوتی رہیں تو گرمی کے باعث ان سے بو پھیلنے لگی۔ ڈاکٹر صاحب نے وہاں پر موجود دونو جوانوں سے کہا ''عزیز دوستو! یہ کھالیں مال امام ہیں لہٰذا ان کی حفاظت ہمارا فریضہ ہے دکان سے نمک لائیں تا کہ انھیں لگایا جائے۔ نمک لایا گیا تو دونوں دوست پریشان ہوئے کہ آخر نمک کون لگائے گا۔۔۔؟ ایسے میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی شرٹ کی آستین چڑھائیں اور کھالوں پر نمک لگانا شروع کر دیا۔ آپ کو دیکھ کر دوسرے احباب بھی معاون ہوئے اور یوں کئی گھنٹوں تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ احباب کے بقول اگر اس دوران میں کوئی فون آجاتا اور لوگ ڈاکٹر صاحب سے پوچھتے کہ حضور آپ عید کے روز دفتر میں کیا کر رہے ہیں تو آپ جواباً فرماتے ''نمک بیٹھا ہوں'' آپ کی عجز وانکساری اور قومی تنظیم سے محبت کے انداز کو دیکھ کر ان افراد میں بھی کام کرنے کا جذبہ پیدا ہوا جو کام کرنے کو عار محسوس کرتے تھے۔

ابتدائی ایام میں تحریک کا دفتر مالی مسائل کا شکار تھا جبکہ عوام دور دراز علاقوں سے رابطوں کے لئے آتے تھے۔ ان کی مہمان نوازی کے اخراجات کسی حد تک ڈاکٹر صاحب اپنی تنخواہ سے پورے کرتے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ آپ دیر تک دفتر میں کام کرتے رہتے اور رات کو یہاں سو جاتے اور صبح سویرے یہیں سے ملازمت کے لئے نکل جاتے۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ آپ رات کو دفتر میں سوئے ہوئے ہوتے تھے کہ مہمان آجاتے آپ اوڑھنا بچھونا ان کے حوالے کرتے اور خود میز یا کرسیوں کو ملا کر سو جاتے اگر میز کرسیاں بھی خالی میسر نہ آتیں تو آپ صحن میں پڑی ہوئی نماز کی صف کو نیچے بچھا کر سر کے نیچے اینٹیں رکھ لیتے اور یوں آپ کی رات بسر ہو جاتی۔

ایک مرتبہ تحریک کے کارکنان نے آپ سے شکوہ کیا کہ تحریک ملکی سطح کی جماعت ہے جبکہ اس کے دفتر میں سونے کے لئے گدے اور سرہانے تک میسر نہیں۔ آپ نے احباب کی بات سنی اور ٹھنڈی آہ لے کر فرمایا۔ ''آپ کو کیا معلوم کہ ملت اسلامیہ کے قائد علامہ سید عارف حسین الحسینی کے دفتر کی کیا حالت ہے اور وہ دو ملازمین کے درمیان بوسیدہ گدے اور پھٹے پرانے سرہانے

پر کیسے سوتے ہیں؟''

یہ وہ ایام تھے جب تحریک جعفریہ کی مالی حالت بہت کمزور تھی یہاں تک کہ تحریک کے صوبائی دفتر کے اخراجات تک پورے نہیں ہوتے تھے۔ ایسے میں ڈاکٹر صاحب ہی کی محنتوں سے دفتر کا بھرم رہتا تھا۔ ان حالات میں آپ نے لاہور شہر کے مومنین کے گھروں میں سینکڑوں صندوقچیاں بنوا کر رکھ دیں اور مومنین سے گزارش کی کہ وہ اپنی نذر نیاز، صدقات اور امام ضامن کی رقم وغیرہ ان میں ڈالیں۔ آپ ایک کارکن کے ذریعہ ماہوار ان صندوقچیوں کو اٹھواتے اور ان میں سے مومنین کی نیاز حاصل کرتے جس سے کسی حد تک دفتر کے اخراجات پورے ہو جاتے۔

ان ایام میں آپ آئی۔ایس۔او پاکستان کے مرکزی دفتر کے امور کی نگرانی بھی کرتے اور تحریک کے دفتر میں بحیثیت کارکن خود بھی مصروف کار رہتے۔ آپ نے نوجوانوں پر واضح کیا کہ ''حالات اسی بات کے متقاضی ہیں کہ قائد ملت اسلامیہ علامہ سید عارف حسین الحسینی کی شخصیت اور قیادت کا تعارف ملک کے گوشہ گوشہ میں کرایا جائے اور ان کے دورہ جات کو حتی الامکان کامیاب بنایا جائے۔''

قائد ملت اسلامیہ کے تعارفی پوسٹر لاہور سے شائع ہوئے تو سفیر انقلاب نے لاہور کے در و دیوار پر یہ پوسٹر اپنے ہاتھوں سے چسپاں کیے۔ تحریک کے پروگرام کی تشہیر کے لئے آپ نے سینکڑوں بار دیواروں پر لکھائی کی، پوسٹر لگائے۔ آپ کے جذبہ کو دیکھ کر تھکے ہارے نوجوانوں کی بیٹری چارج ہوتی اور وہ رات بھر کام کرتے رہتے۔

سفیر انقلاب دفتر میں بیٹھے ہوتے تو کسی علاقہ کا کوئی شخص بھی جونہی دفتر میں آتا آپ سب سے پہلے اس سے علاقہ میں قیادت کے بارے رجحانات کا استفسار کرتے اور جب وہ جانے لگتا تو آپ اسے قائد کی تصاویر اور تعارفی لٹریچر تھما دیتے اور قیادت کے پرچار کی تاکید فرماتے۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ ۱۹۸۵ء میں مجھے کسی تنظیمی کام کے سلسلہ میں لاہور آنا پڑا چونکہ میں اس وقت گومل یونیورسٹی ڈیرہ اسماعیل خان میں زیر تعلیم تھا اس لئے ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے ڈیرہ اسماعیل خان کے عوام کی قائد سے وابستگی کے بارے میں سوالات کیے۔ جب میں نے مثبت صورت حال

واضح کی تو فرمانے لگے۔ ''جہاں علامہ غلام حسن جاڑا صاحب جیسی مقتدر اور بزرگ شخصیت موجود ہو۔ وہاں ایسا ہی ہونا چاہیے۔ مزید برآں وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ ''ہمیں قیادت کے پرچار کے لئے ان علاقوں میں مشکلات کا سامنا ہے جہاں دینی مدارس نہیں ہیں۔ جہاں علما حقہ کا عوام سے رابطہ کمزور ہے اور جہاں تنظیمی فکر کا فقدان ہے۔ تاہم ہمارے نوجوان برق رفتاری سے مصروف جہاد ہیں اور انشاءاللہ بہت جلد ہم اپنی قیادت کو ملت اسلامیہ کی واحد نمائندہ قیادت کے طور پر پیش کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ آپ نے اس موقع پر جو اعتماد بھری گفتگو کی وہ علامہ محمد اقبالؒ کے اس شعر کی عکاس تھی۔

کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے
ہے بھروسہ اپنی ملت کے مقدر پر مجھے

☆☆☆☆☆

نشرواشاعت

قیادت کے تعارف کا پہلا نشرواشاعتی مرحلہ لاہور سے شروع ہوا جس کی سرپرستی سفیر انقلاب نے فرمائی۔ پشاور سے اخوندزادگان نے علامہ سید عارف حسین الحسینی کا مختصر تعارف اور تصویر شائع کروائی جبکہ پاکستان بھر میں منظم ترویج کے لئے ڈاکٹر صاحب نے تصاویر، تعارف، ماہنامہ راہ عمل اور ہفت روزہ رضا کار کے خصوصی ایڈیشن شائع کرائے۔

آپ نے علامہ سید صفدر حسین نجفی و دیگر علما کرام سے رابطہ کر کے انھیں قیادت کا بھرپور

تعارف کرانے اور عوام کو مائل کرنے کی اپیل کی اور ساتھ ہی ان سے ملک بھر کے خطباء مساجد کو تاکیدی خطوط لکھوائے تاکہ وہ جمعہ اور دیگر اجتماعات میں حقیقی قیادت کو متعارف کرائیں۔

دوسری جانب آپ نے اپنی نظریاتی قوت امامیہ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن پاکستان کو خبردار کیا کہ وہ اپنی دیگر مصروفیات کو بالائے طاق رکھ کر قیادت کے تعارف کے لئے اپنی توانیاں صرف کریں اور وہ شہروں سے نکل کر دیہاتوں تک علامہ مفتی جعفر حسین مرحوم کے جانشین کا تعارف کرائیں، ان کی تصاویر پہنچائیں اور عوام کو حقیقت حال سے آگاہ کریں۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے معتمد احباب کے کچھ گروپ تشکیل دیے جنھیں چھ ماہ کے اندر ''دو قیادتوں کے وجود اور عوامی رجحانات'' کی جامع رپورٹ پیش کرنے کی تاکید کی۔ جب ملک بھر کی صورت حال آئینہ کی طرح آپ کے سامنے آئی تو آپ نے وہاں کے تقاضوں کے مطابق منصوبہ بندی کی اور آخرکار کامیابی کے پرچم گاڑھے۔

اپریل ۱۹۸۴ کو پشاور میں علامہ سید عارف حسین نے اپنی کابینہ کا انتخاب کیا تو ڈاکٹر صاحب کو ان کی خداداد صلاحیتوں اور رجحانات کے باعث نشرواشاعت کی اہم مسئولیت کے لئے منتخب کیا گیا۔

جب آپ نے پاکستان میں علماء کرام اور تنظیمی برادران کے ذریعہ خاطر خواہ کامیابی حاصل کرلی تو آپ کو خیال آیا کہ اگر ایران کے جید علما کرام علامہ سید عارف حسین الحسینی کی قیادت کی تائید فرمادیں تو مخالفین کے پروپیگنڈہ کا پانسہ پلٹ جائے گا۔

یہ وہ دور تھا جب امام خمینیؒ دنیا بھر میں اپنے نمائندگان مقرر فرمارہے تھے جن کے ذریعہ وہ انقلاب اسلامی کا پیغام عوام تک پہنچانے کے خواہاں تھے۔ حوزہ علمیہ قم المقدسہ میں موجود طلباء کی طرف سے جہاں علامہ سید عارف حسین الحسینی کی قیادت کی بھرپور تائید کی گئی وہاں پر انھوں نے مراجع عظام کی تائیدات کو بھی حاصل کیا اس کے لئے سب سے زیادہ جدوجہد علامہ سید محمد جواد ہادی نے کی۔ ادھر پاکستان میں جب قیادتوں کے تعارف کا ٹکراؤ عروج پر پہنچا تو ولی فقیہ امام خمینیؒ کی طرف سے علامہ سید عارف حسین الحسینیؒ کے لئے نمائندہ ولی فقیہ کی تائیدی سند پاکستان پہنچ گئی۔ جس کی اشاعت کے بعد مخالف گروپ کے غبارے سے ہوا نکل گئی اور مخالفین جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔

علامہ سید عارف حسین الحسینی کو نمائندہ ولی فقیہ کی سند ملنے پر ڈاکٹر صاحب کو روحانی تسکین پہنچی اور آپ نے تنظیمی اجتماعات میں اس بات پر زور دیا کہ برادران قائد ملت اسلامیہ کو نمائندہ ولی فقیہ کی حیثیت سے متعارف کرائیں۔

آپ نے کئی بار خود بھی اس بات کا اظہار فرمایا کہ علامہ عارف حسین الحسینیؒ کی ذات ان کے لئے بے حد محترم ہے کہ وہ ملت جعفریہ پاکستان کے سربراہ ہیں اور ان کی ہر بات اس لئے حجت بھی ہے کہ وہ نائب امام ولی فقیہ حضرت امام خمینیؒ کے نمائندہ ہیں۔ ان کا عقیدہ تھا کہ نمائندہ ولی فقیہ کی حمایت ولی فقیہ کی حمایت ہے اور ولی فقیہ کی حمایت امام زمان علیہ السلام کی حمایت ہے۔

جب علما کرام اور تنظیمی برادران کی محنت کے طفیل قائد ملت اسلامیہ کا تعارف عوام تک پہنچ گیا تو ڈاکٹر صاحب نے اپنے چند اہم احباب کے ساتھ قائد عظیم الشان سے ملکی دورہ جات کی گزارش کی۔ باہمی صلاح مشورہ کے بعد قائد نے آمادگی کا اظہار فرمایا مگر بات دورہ جات کی کامیابی پر مشروط ٹھہری۔ چنانچہ تبلیغاتی امور علمائے کرام نے سنبھالے جبکہ انتظامی امور کی ذمہ داری ڈاکٹر صاحب نے قبول کی۔ اس سلسلہ میں سفیر انقلاب نے دن رات محنت کر کے دورہ جات کا شیڈول تیار کیا اور ہر علاقہ کی صورت حال کے مطابق منصوبہ بندی کی۔ بعض اہم مقامات پر آپ قائد کے دورہ جات سے قبل تشریف لے گئے وہاں کے بااثر لوگوں سے ملے اور انتظامات کا جائزہ لیا۔

آپ نے تحریک جعفریہ اور اس کی قیادت کو مضبوط کرنے کے لئے اتنے طویل اور کٹھن سفر کیے جنھیں سوچ کر حواس جواب دینے لگتے ہیں۔ آپ کی ان مسافتوں کے ہمسفر احباب آج بھی گواہ ہیں کہ آپ کے پاس ایک سفری بستر (Sleeping Bag) ہوتا تھا۔ جسے آپ سر کے نیچے رکھ کر آرام کر لیتے اور سردی کی شدت میں اس میں لپٹ کر ٹرین کے فرش اور اسٹیشنوں کے فٹ پاتھ پر بھی سو جاتے۔

ملک بھر میں قائد ملت اسلامیہ علامہ سید عارف حسین الحسینی کے دورہ جات کی بے پناہ کامیابی کے بعد ڈاکٹر صاحب نے کئی بار برادران کے سامنے اظہار فرمایا کہ ''انقلاب اسلامی ایران امام خمینیؒ اور قائد حسینیؒ کے پرچار میں تنظیم آئی۔ ایس۔ او پاکستان کا گہرا عمل دخل ہے

''چونکہ آپ ذہنی طور پر تنظیم کے حق میں تھے اس لئے آپ نے محسوس کیا کہ طلباء کے علاوہ بھی ملت کی دیگر تنظیمیں وجود میں آئیں اور اس طرح وہ بھی اپنے پلیٹ فارمز سے متحرک ہوں۔ چنانچہ آپ نے ملک گیر تنظیم سازی کی تحریک چلائی جس کے نتیجہ میں امامیہ ڈاکٹرز، امامیہ انجینئرز، امامیہ وکلاء، امامیہ ٹیچرز، امامیہ ایمپلائز ویلفیئر آرگنائزیشن اور امامیہ کسان جیسے پلیٹ فارمز تشکیل پائے اور مثبت نتائج دیئے۔ کچھ عرصہ بعد حالات کے پیش نظر امامیہ کو ''اسلامک'' میں تبدیل کر دیا گیا اور آج کل اسلامک ایمپلائز ویلفیئر آرگنائزیشن متحرک اور فعال ہے۔

جس طرح آئی۔ ایس۔ او کی بنیاد رکھتے وقت آپ کا نظریہ تھا کہ ملک بھر میں مختلف پلیٹ فارمز پر کام کرنے والے امامیہ طلبا ایک مرکزی پلیٹ فارم پر جمع ہوں اور ان کا تشخص ایک جماعت کے حوالے سے ہو اسی طرح تحریک جعفریہ کے قیام کے بعد آپ کی خواہش تھی کہ تمام ملی تنظیمیں تحریک میں ضم ہو جائیں اور ملک بھر میں ایک تشخص کے ساتھ مضبوطی سے کام کریں۔

آئی۔او سے اختلاف

ملت جعفریہ کی ملک گیر تنظیم امامیہ آرگنائزیشن پاکستان (آئی۔او پاک) سے آپ کے اختلافات کی اہم وجہ بھی یہی تھی کہ وہ تحریک جعفریہ سے علیحدہ تشخص کے ساتھ کام کرنے کے خواہاں تھی۔ جبکہ ڈاکٹر صاحب ایک وقت میں قومی سطح کے ایک پلیٹ فارم کے قائل تھے۔

چونکہ امامیہ آرگنائزیشن پاکستان ملت جعفریہ کی تاریخ کا ایک معتبر باب ہے اس لئے مناسب ہوگا کہ طائرانہ نظر میں اس کا جائزہ لیا جائے تاکہ اس عنوان کو رقم کرنے اور بعد میں اس

سے اختلاف کرنے میں سفیر انقلاب کا کردار واضح ہو۔

مئی ۱۹۷۲ کو امامیہ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن پاکستان کا قیام عمل میں آیا اور یہ کارواں یقین محکم اور عمل پیہم کے ساتھ منزل کی جانب رواں ہوا۔ دو سال کے مختصر عرصہ میں اس قافلہ میں اضافہ بھی ہوا اور اس سے چند سالار بھی بچھڑے۔ چونکہ اس الٰہی تنظیم کا نصب العین ''تعلیمات قرآن اور سیرت حضرت محمد وآل محمد علیہم السلام کے مطابق نوجوان نسل کی زندگی استوار کرنا اور انھیں عہد حاضر کی تاریکیوں، فتنہ پردازیوں اور چیرہ دستیوں کا مقابلہ کرنے کے قابل بنانا تا کہ وہ اچھے انسان اور مومن بن کر دین مبین کی سربلندی اور اپنی اخروی نجات کا سامان فراہم کر سکیں'' تھا، اس لئے ابتدائی سالوں میں محسوس کیا گیا کہ جو برادران تربیت حاصل کر کے تعلیم سے فارغ ہو کر معاشرہ میں جا رہے ہیں یہ ان کی ذمہ داری میں شامل ہے کہ وہ جہاں معاشرہ میں خود ایک حقیقی مومن ہوں وہاں اپنی تنظیم آئی۔ایس۔او کے برادران کو روحانی، فکری اور مالی تعاون بھی فراہم کریں۔ چنانچہ اس نظریہ کے تحت دسمبر ۱۹۷۴ کو ''امامیہ آرگنائزیشن پاکستان'' کی بنیاد رکھی گئی اور آئی۔او، آئی۔ایس۔او کی ''Parent Organization'' کہلائی۔

سفیر انقلاب ۷۷۔۱۹۷۶ میں آئی۔ایس۔او پاکستان کے مرکزی صدر بنے آپ جونہی تعلیم اور تنظیم کی مسئولیت سے فارغ ہوئے مرحلہ وار آگے بڑھے اور ۱۹۷۸ میں باقاعدہ طور پر آئی۔او پاکستان کے رکن بن گئے۔ آپ ۱۹۸۴ تک آئی۔او سے مربوط رہے اور اسی دوران میں وہ تمام تر امور باحسن انجام دیتے رہے جن کی تکمیل کے لئے آئی۔او کا قیام عمل میں آیا تھا۔

ایک مرحلہ پر آپ نے محسوس کیا کہ آئی۔او اپنے تنظیمی دائروں کو وسعت دے رہی ہے اور ان اہداف سے انحراف کر رہی ہے جو اس کی خشت اول میں شامل تھے چنانچہ آپ نے خاصی بحث وتمحیص کے بعد آئی۔او کو خیر باد کہا۔

آئی۔او سے آپ کے اعلان لاتعلقی نے تنظیمی حلقوں میں بھونچال برپا کیا اور کئی سالوں تک اس حساس مسئلہ پر گفتگو ہوتی رہی۔ آپ نے اس نازک موڑ پر اپنی ذات کو تحریک جعفریہ کے لئے وقف کر دیا جبکہ آئی۔ایس۔او پاکستان کی سرپرستی کے لئے آئی۔ایس۔او کے سابق

ممبران پر مبنی ''امامینز'' (Imamians) کے نام سے ایک نئے شعبہ کی بنیاد رکھی۔

۱۹۸۹ میں پہلی بار مجھے ماہنامہ العارف کے لئے ڈاکٹر صاحب سے انٹرویو کرنے کا موقع ملا تو میں نے آئی۔او کے بارے میں ان سے کھل کر سوالات کیے۔ یہاں تک کہ ہماری گفتگو مناظرانہ رنگ اختیار کر گئی۔

☆ آپ نے آئی۔او سے اعلان بیزاری کیوں کیا؟

} جب تک آئی۔او اپنے بنیادی اغراض ومقاصد (آئی۔ایس۔او کی سرپرستی) سے انصاف کرتی رہی میں اس سے مربوط رہا اور جب میں نے محسوس کیا کہ اس میں غیر تنظیمی افراد داخل ہو رہے ہیں اور تنظیم کے اغراض ومقاصد میں نمایاں تبدیلی آئی ہے تو میں نے اسے چھوڑنا بہتر سمجھا ہے۔

☆ آئی۔او اگر معاشرہ میں ملت کے افراد کو فعال کرتی ہے اور قومی طاقت کے طور پر منظر عام پر آ کر اسلامی معاشرہ کا قیام عمل میں لاتی ہے تو اس میں کیا حرج ہے؟

} اس مقصد کے لئے تحریک نفاذ فقہ جعفریہ پاکستان موجود ہے۔

☆ ''کیا امامینز آئی او کا نعم البدل ہے۔''

} امامینز (Imamians) آئی۔او کا نعم البدل نہیں بلکہ آئی۔او کے بنیادی اہداف کا نعم البدل ہے۔

☆ کیا'' آپ امامینز اور آئی۔او کا ٹکراؤ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

} ایسا ہرگز نہیں اگر آج بھی آئی۔او اپنے دستور میں یہ جملہ شامل کر دے کہ اس تنظیم میں کوئی غیر آئی۔ایس۔او شامل نہیں ہوگا ہم آج امامینز کے خاتمہ کا اعلان کرتے ہیں۔

☆ بعض حلقوں کی طرف سے یہ تاثر پیش کیا جاتا ہے کہ ملت جعفریہ کے بعض تعلیم یافتہ لوگ تحریک نفاذ فقہ جعفریہ پاکستان میں علما کرام کے زیر اثر کام کرنے میں ہچکچاہٹ کا شکار ہیں جبکہ وہ آئی۔او کے پلیٹ فارم پر متحد ہیں اور اس طرح سے وہ قومی قوت میں اضافہ کا باعث ہیں۔

} اگر کچھ لوگ علماء کرام کے ماحول میں کام کرنے میں کسی ہچکچاہٹ کا شکار ہیں تو انھیں چاہیے کہ وہ علیحدہ تنظیمیں، دستور، ڈھانچے اور قیادتیں منظر عام پر نہ لائیں بلکہ تحریک کے دائرہ میں

داخل ہوکر اسے وسعت بخشیں اور ایسا ماحول پیدا کریں جو ہر فرد کے لئے قابل قبول ہو۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ متحرک تنظیموں میں اختلاف رائے ہوتا رہتا ہے اور ہمیشہ مثبت اور تعمیری اختلاف تنظیموں کا حسن ٹھہرتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب آئی۔او کے اہم رہنماؤں کے کردار، اخلاق اور خلوص کو سراہا کرتے تھے اور جہاں نظریاتی سطح پر انھیں اختلاف ہوتا تھا برملا اظہار بھی فرماتے تھے۔ ایک مرحلہ پر انھوں نے آئی۔او سے بھرپور اختلاف کیا مگر زندگی کے آخری ایام میں آئی۔او کے دو سابق چیئرمین جناب احمد رضا خان اور جناب افسر حسین خان سے پے در پے ملاقاتیں کر کے اختلافات کی خلیج کو ختم کیا اور ماضی کی چند تلخیوں کو یکسر فراموش کر کے تنظیموں کو ایک جان کرنے کی نتیجہ خیز کوشش کی۔

برادر افسر حسین خان کے بقول کہ ڈاکٹر صاحب کے آئی۔او سے اختلافات جزوی تھے صرف انھیں طریقہ کار سے اختلاف ہوتا تھا وہ امام خمینیؒ اور شہید حسینی کے شانہ بشانہ کام کرنا چاہتے تھے جبکہ آئی۔او کے دیگر رہنما محاذ سے پیچھے ارکان کی تربیت کرنے کے خواہاں تھے شاید وہ سرکاری ملازمتوں وغیرہ کے حوالہ سے ایسا کرنے کے قابل نہ تھے۔ بعض احباب کا خیال ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو آئی۔او کی روایتی شیعیت سے بھی اختلاف تھا جبکہ آپ نظریاتی اور انقلابی شیعیت کے حق میں تھے۔ آئی۔او کے رہنما گردوپیش کے نتائج کو سامنے رکھ کر منصوبہ بندی کرتے تھے جبکہ ڈاکٹر صاحب اپنے اسلامی ہدف کے حصول کے لئے گردوپیش کے حالات سے بے نیاز ہوکر مسائل میں کود پڑتے تھے اور علامہ اقبال کی فکر کی تفسیر بن جاتے تھے کہ

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق

☆☆☆☆☆

چونکہ آپ کی تحریک اور قیادت سے وابستگی شعوری تھی اس لئے آپ اپنے نظریہ میں نہایت واضح تھے۔ آپ نے تحریک جعفریہ سے یہاں تک وفا کی کہ آپ کو بعض علماء کرام سے شدید اختلاف کرنا پڑا۔ جن ایام میں علامہ سید عارف الحسینی شہید کی قیادت عروج پر تھی ان دنوں وفاق علما شیعہ کے پلیٹ فارم پر خاصا تحرک دکھائی دیتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک مرحلہ ایسا بھی آیا

جب ''تحریک'' اور ''وفاق'' کے اختلافات کی بازگشت بہت دور تک سنائی دی۔

ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب اپنے قائد علامہ سید عارف حسین الحسینی کے ہمراہ ملک کے ایک معروف دینی مدرسہ میں گئے تو وہاں پر موجود ایک عالم دین نے قائد کی شان میں نہایت سخت زبان استعمال کی۔ اس موقع پر تو ڈاکٹر صاحب اور ان کے چند رفقا سب کچھ برداشت کر گئے مگر اس روز کے بعد آپ نے ان حضرات کی کھل کر مخالفت کی۔ ایک مرحلہ پر آپ نے احباب کی محفل میں فرمایا ''کسی شخص کا لباس محترم نہیں ہوتا بلکہ اس کا نظریہ محترم ہوتا ہے۔''

آپ اپنے نظریہ میں نہایت واضح تھے اور کبھی بھی ابہام کا شکار نہیں ہوئے۔ ہمیشہ دلائل اور برہان سے بات کی اور اپنے نظریہ پر قائم رہے۔

سفیر انقلاب کی زندگی میں ایک نازک مرحلہ ایسا بھی آیا جب تحریک جعفریہ اور اس کی قیادت علامہ سید عارف حسین الحسینی شہید کے بارے میں ایک نکتہ پر آپ کو علامہ سید صفدر حسین نجفی مرحوم سے معذرت کے ساتھ اختلاف کرنا پڑا۔ حالانکہ علامہ صفدر حسین صاحب کے بارے میں ڈاکٹر صاحب فرمایا کرتے تھے کہ ''یہ وہ شخصیت ہیں جنھوں نے مجھے اپنے والدین اور دین کی پہچان کرائی ہے۔''

تاریخ آج بھی گواہی دیتی ہے کہ سفیر انقلاب ڈاکٹر محمد علی نقوی شہید نے ''سفیر نور'' علامہ سید عارف حسین الحسینی شہید کا کسی مرحلہ پر بھی ساتھ نہیں چھوڑا۔ بلکہ کربلا کے ان وفادار شہداء کی سیرت ادا کی کہ جو وقت شہادت ایک دوسرے کو امام حسینؑ کی طرف اشارے کر کے کہتے تھے ''دشت کربلا میں فرزند زہراؑ کو تنہا نہ چھوڑنا۔''

قیادت کے ابتدائی ایام میں جب علامہ سید عارف حسین الحسینی نے حضرت امام خمینیؒ کے فرمان کی تعمیل کرتے ہوئے ''یوم القدس'' منانے کا اعلان فرمایا اور خود مظاہرہ کی قیادت کے لئے لاہور تشریف لائے تو آپ نے لاہور کے تمام آئمہ مساجد اور مدارس جعفریہ کے علماء کرام سے رابطہ فرمایا اور ان سے اسرائیل و امریکہ کے خلاف بیت المقدس کی آزادی کے لئے مظاہرہ میں بھرپور شرکت کی استدعا کی۔ یہ وہ ایام تھے جب جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء نے عوام کے

سروں پر خوف کی بھیانک چادر تان رکھی تھی اور اس کے جبر کی حبس سے عوام کی سانس گھٹ رہی تھی۔ جب لاہور کی انتظامیہ کو علامہ سید عارف حسین الحسینی کے مظاہرے اور منصوبے کا علم ہوا تو انھوں نے آئمہ مساجد اور کئی علماء کو ہراساں کرنا شروع کر دیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کے مظاہرے کے روز قیادت کو اپنوں کی طرف سے معذرت کے فون آنا شروع ہو گئے۔ جب اس صورتحال کا ڈاکٹر صاحب کو علم ہوا تو آپ نے لاہور کے تنظیمی احباب کو اکٹھا کیا اور فرمایا ''دوستو آج فرزند زہراء، نمائندہ ولی فقیہ قائد ملت جعفریہ ہمارے شہر لاہور میں شیطان بزرگ امریکہ اور اس کی ناجائز اولاد اسرائیل کے خلاف قبلہ اول کی آزادی کے لئے مظاہرہ کرنے تشریف لائے ہیں، آمر کے ایجنٹوں اور انتظامی مشینری نے خوف پھیلا کر ہمارے لوگوں کو مظاہرہ میں شرکت سے باز رکھنے کی کوشش کی ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ کچھ اہم شخصیات دن کے اجالے میں قائد کا ساتھ دینے میں ٹال مٹول کر رہی ہیں جبکہ ان سے وہ لوگ اچھے تھے جنھوں نے رات کے اندھیرے میں فرزند زہراؑ کو چھوڑ دیا تھا۔ لہٰذا آج وفا کی رسم نبھانے کا وقت آ گیا ہے ہمیں ہر حال میں اپنے قائد کے گرد رہنا ہوگا۔۔۔ خدا نہ کرے اور یہ نوبت نہ آئے کہ ہمارے قائد کسی مشکل مرحلہ پر ہمیں دائیں بائیں تلاش کریں یا ان پر صدائے استغاثہ بلند کرنے کی گھڑی آ پہنچے''

اس روز کا پرخوف منظر دیکھنے والے شاہد ہیں کہ ڈاکٹر صاحب اپنے محبوب قائد کے گرد پروانے کی طرح گھومتے رہے اور کئی مقامات پر پولیس کے دائرے توڑے۔ اس مظاہرہ کے دوران ایک مرحلہ ایسا بھی آیا جب پولیس نے مظاہرین پر اپنی بندوقیں تان لیں مگر ایسے میں ڈاکٹر صاحب اپنے چند احباب کے ہمراہ قائد کے آگے آئے اور دفاعی دیوار کی صورت اختیار کر گئے۔

☆☆☆☆☆

سانحہ کوئٹہ اور سفیر انقلاب

۱۹۸۵ میں علامہ سید عارف حسین الحسینی نے فیصلہ کیا کہ وہ مفتی صاحب کے سفر کو ہر حالت میں جاری رکھیں گے اور اس سلسلہ میں حکومت کے ساتھ طے شدہ ''معاہدہ اسلام آباد'' پر عمل درآمد کے لئے حکومت وقت کو یادداشت پیش کریں گے۔ چنانچہ طے یہ پایا کہ ۶ جولائی کو ملت جعفریہ قومی دن کے طور پر منائے گی اور ہر صوبائی دارالحکومت میں اجتماعات کر کے حکومت سے وعدہ وفا

کرنے کا مطالبہ کرے گی۔

اس فیصلہ کے تحت کراچی کے علاوہ لاہور، پشاور اور کوئٹہ میں ۶ جولائی کے روز اجتماع منعقد ہوئے۔ لاہور اور پشاور میں اجتماعات پرامن رہے جبکہ کوئٹہ میں حکومت نے مظاہرین پر گولیاں برسا کر بیس کے قریب افراد کو شہید اور درجنوں کو شدید زخمی کیا۔ جب اس ظلم کے بعد بھی حکومت کے دل کی آگ نہ بجھی تو انتظامیہ نے سینکڑوں افراد کو گرفتار کر کے کرفیو کا اعلان کر دیا اور ''علمدار روڈ'' کی شیعہ آبادی کی بجلی پانی بند کر کے کربلا کی یاد تازہ کر دی۔ شہر کے اندر خوف کی فضا نے اقتدار سنبھالا اور شہر کے باہر تعزیتی وفود کے راستے مسدود کر دیئے گئے۔ ان حالات میں قائد کے فرمان پر ملک بھر کے علماء کرام اور تحریک کے کارکنان کے وفود کوئٹہ پہنچے مگر ان میں سے اکثر گرفتار ہوئے اور ان پر جبر و تشدد کے پہاڑ توڑ دیے گئے۔

وحشت کے اس ماحول میں ڈاکٹر صاحب اپنی حکمت عملی کے تحت پہلے تعزیتی وفد میں کوئٹہ پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ وفد جب علمدار روڈ پر جامعہ امام الصادق کو نئے سرے سے آباد کرنے کی کوشش میں تھا کہ ہزارہ قبیلے کے لادین جوان مدرسہ میں داخل ہو گئے جہاں انھوں نے علماء کو سب و شتم کیا وہاں ڈاکٹر نقوی شہید پر ہاتھ اٹھا کر جسارت کی جس کی وجہ سے یہ وفد اسٹیشن کے قریب امداد ہوٹل میں منتقل ہو گیا یاد رہے کہ وفد پر ایجنسیوں کی شدید نگرانی موجود تھی۔

ایسی فضا میں جب اطلاعات کے تمام ذرائع منقطع تھے آپ کہیں نہ کہیں سے تحریک کے مرکزی آفس اور قائد کو صورتحال سے آگاہ کرتے۔ ایسے ماحول میں جہاں پرندے کا پر مارنا بھی تقریباً ناممکن تھا۔۔۔ سڑکیں اور گلیاں ویران تھیں۔۔۔ انسانوں کی آبادی کا تصور تک نہیں ہوتا تھا۔۔۔ پولیس اور فوج نے ماحول کو گرفت میں لیا ہوا تھا نہ جانے ڈاکٹر صاحب کیسے اور کن راستوں سے اخبارات کے دفتر پہنچ جاتے اور وہاں اپنے قائد اور عوام کے خیالات شائع کرواتے۔ آپ کے ایک قریبی رفیق نے روایت کی ہے کہ ڈاکٹر صاحب سائیکل پر سوار ہو کر مختلف روپ بدلتے۔۔۔ کبھی اخبار فروش کی شکل میں اور کبھی دیہاتی گاہک کے روپ میں شہر کا جائزہ لیتے۔ آپ کی سرگرمیوں اور بے قراری سے لگتا تھا کہ آپ نے طے کر لیا تھا۔

سو گئیں شہر کی سبھی گلیاں
اب میرے جاگنے کی باری ہے

آپ کی بیداری اس قدر پُراثر اور مفید تھی کہ قائد عظیم الشان کو دعائیہ جملے کہنا پڑے ''خدا کرے کہ ڈاکٹر صاحب گرفتار نہ ہوں'' سفیر انقلاب ایک ماہ سے زائد عرصہ کوئٹہ میں رہے جب حالات قدرے معمول پر آئے تو آپ وہاں سے لوٹے اور اپنے قائد کو تمام صورت حال سے آگاہ فرمایا۔ آپ نے قائد سے گزارش کی کہ وہ حکومت پر اپنے گرفتار شدہ کارکنان کی رہائی اور مقدمات کے خاتمے کا مطالبہ کریں جبکہ تحریک اور آئی۔ ایس۔ او د باؤ میں اضافہ کرے۔

سید عارف حسین الحسینی نے صدا بلند کی تو ڈاکٹر صاحب اور ان کی نظریاتی فوج نے حکومت کی نیندیں حرام کر دیں۔ جب حکومت کے خفیہ اداروں نے یہ محسوس کر لیا کہ حکومت کو زچ کرنے میں ڈاکٹر نقوی کا ہاتھ ہے تو انھوں نے آپ کے گھر پر چھاپے مارے اور ایجنسی کے ایک فرد کو آپ کے گھر کے سامنے سڑک پر چھوڑ گئے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی سرگرمیاں نوٹ کرنے والے سڑک پر بیٹھے ہوئے شخص کی نقل و حرکت کا جائزہ لیا تو آپ نے تحریک کے صوبائی دفتر میں اپنے معتمد ساتھیوں کو آگاہ فرمایا جب یہ احباب اس شخص کو اٹھا لائے تو اس نے اپنا تعلق معروف ایجنسی سے بتایا اور اپنے مقاصد کا اعتراف کیا۔

۱۹۸۶ کو جب کراچی میں تحریک کے تنظیمی اجلاس میں کوئٹہ کے اسیران کو رہا کرانے کے لئے لائحہ عمل تیار ہونے لگا تو اجلاس تذبذب کا شکار ہوا مگر ایسے میں ڈاکٹر صاحب نے لانگ مارچ کی تجویز پیش کی جسے طویل بحث کے بعد قبول کر لیا گیا اور قائد نے یکم مئی ۱۹۸۶ کو لانگ مارچ کرنے کا اعلان فرمایا اور سفیر انقلاب نے تمام انتظامی ذمہ داریاں قبول کر لیں۔

ڈاکٹر صاحب اجلاس کے خاتمہ پر لاہور عازم سفر ہوئے تو اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ ''مارکر'' (پنسل) لے لیں اور ابھی سے لانگ مارچ کے بارے میں چلو چلو کوئٹہ چلو کے نعرے لکھنا شروع کر دیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ آپ نے لاہور پہنچنے تک بیسیوں ٹرینوں اور ریلوے

اسٹیشنوں پر چاکنگ کی۔علاوہ ازیں آپ نے دوران سفر منصوبہ بندی کی اور ملک کی شخصیات کو اس اعلان کی کامیابی کے لئے خط لکھے۔ملتان پہنچتے ہی آپ نے ڈاک لفافے لئے اور وہیں سے یہ خطوط احسان جعفری صاحب نے ارسال کر دیے۔

آپ نے لاہور پہنچتے ہی لانگ مارچ کی کامیابی کے لئے شب و روز ایک کر دیئے۔ نشرواشاعت اور پروپیگنڈہ سے آمر حکمران کے ہاتھوں کے طوطے اڑائے۔آپ نے فوجیوں اور ٹرین ڈرائیوروں سے رابطے کیے تاکہ کسی ایمرجنسی کی صورت میں وہ انتظامات سنبھالیں اور ٹرینوں کو کوئٹہ تک لے جائیں۔

اس دوران میں آپ کو ہری پور میں وکلاء کے اجتماع سے خطاب کرنے کی دعوت ملی تو آپ مقررہ تاریخ سے قبل ایک روز، لاہور سے اپنی گاڑی میں دو احباب کے ساتھ روانہ ہوئے۔آپ نے گاڑی میں لانگ مارچ کے پوسٹر، گوند کے ڈبے، پینٹ اور برش ساتھ لئے اور ہری پور پہنچنے تک تمام راستہ میں چاکنگ کی اور جگہ جگہ پوسٹر لگائے۔جب آپ ہری پور پہنچے تو سیاہی لگے کپڑے اتارے، رنگ بھرے ہاتھ دھوئے اور پھر بار کونسل میں خطاب کرنے چلے گئے۔

جب حکومت نے لانگ مارچ کی تحریک کے آگے گھٹنے ٹیکے اور وقت کے آمر نے ملت جعفریہ کے سامنے دوسری بار شکست کا اعتراف کیا تو ڈاکٹر صاحب آئی۔ایس۔او کے مرکزی صدر برادر سید امتیاز علی رضوی کو ساتھ لئے قائد کی خدمت میں پشاور پہنچے اور انھیں کوئٹہ جانے کی گزارش کی تاکہ شہداء کے پسماندگان کی دلجوئی ہو سکے۔اس موقع پر قائد نے ڈاکٹر صاحب سے دل کی بات کی کہ وہ پہلے سے جانے کا ارادہ کر چکے ہیں البتہ انھیں رقم کا مسئلہ درپیش ہے کیونکہ وہ خالی ہاتھ نہیں جانا چاہتے۔قائد کے یہ جملے سن کر ڈاکٹر صاحب نے حامی بھری کہ وہ بسم اللہ کر کے راولپنڈی سے ٹرین پر روانہ ہوں اور لاہور میں انھیں مطلوبہ رقم پیش کر دی جائے گی۔

سفیر انقلاب، سفیر نور سے وعدہ کر کے لاہور لوٹے اور یہاں کے صاحب ثروت حضرات

کے دروازوں پر دستک دی۔یہاں کے عوام بالخصوص شیخ تاجر برادری نے آپ کی صدا کے درد کو محسوس کیا اور آپ نے دو روز میں ایک لاکھ روپے اکٹھے کر لئے۔

عوامی لانگ مارچ سے قبل حکومت بلوچستان نے تمام اسیر رہا کر دیئے۔کوئٹہ سے قائد ملت جعفریہ کو حالات سے آگاہ کر دیا گیا اطلاع ملتے ہی علامہ سید عارف حسین الحسینی نے کوئٹہ جانے پر نظر ثانی فرمائی البتہ اس سلسلہ میں اپنے معتمد رفیق سفیر انقلاب سے فون پر رابطہ کیا۔آپ تحریک کے صوبائی دفتر میں موجود تھے جب آپ سے قائد نے مشورہ کیا تو آپ نے فون پر ہی ایک منٹ کی اجازت لی۔۔۔آدھ منٹ کے لئے سوچا اور پھر عرض کی ''آغا صاحب آپ بسم اللہ پڑھ کر روانہ ہوں'' اور یوں قائد آپ کی تجویز پر پشاور سے کوئٹہ کے لئے عازم سفر ہو گئے۔

جب قائد لاہور پہنچے تو ڈاکٹر صاحب آپ سے ملے جمع شدہ رقم اپنے آقا کے سپرد کی اور عرض کی کہ آپ کے ساتھ یہاں سے دو افراد جا رہے ہیں کسی بھی مرحلہ پر رقم کے حوالہ سے پریشان نہیں ہونا آپ جو حکم دیں گے یہ برادران تعمیل کریں گے۔آپ خود بھی قائد کے ساتھ ہمسفر ہوئے اور قائد سے عوام کی عقیدتوں کا ماحول دیکھ کر بقول شاعر فرمایا:

اے محبوب قائد!

وقت کی آنکھ شبنمی سی ہے
جبر کی شب ذرا کڑی سی ہے
تیرے پاؤں میں ظلم کی زنجیر
ٹوٹ جائے گی عارضی سی ہے

آخر وہی ہوا کہ جبر کی کڑی رات نے دم توڑا۔۔۔آزادی کی شفق طلوع ہوئی۔۔۔ظلم کی زنجیریں ٹوٹیں۔۔۔قائد کے پاؤں کی ایک ٹھوکر سے زندانوں کے دروازے کھلے اور اسیران کوئٹہ لبیک کوئٹہ لبیک یا حسینی کہتے ہوئے سلاسل سے باہر آئے۔انھوں نے قائد کا تاریخی استقبال کیا یاد رہے کہ قائد کی روانگی سے استقبال کے اختتام تک کے تمام پروگرام ڈاکٹر صاحب کے طے شدہ تھے۔

قائد ذی وقار شہداء کے مزاروں اور ان کے پسماندگان کی صف ماتم پر تشریف لے گئے تو شہداء کی ارواح اور ان کے ورثاء نے محبوب قائد پر واضح کیا کہ اے فرزند زہراؑ آپ پر ہماری جانیں قربان ہیں جہاں تک ہماری قربانیوں اور ظالموں کے ظلم کا تعلق تو

حسینیت کا تو چودہ صدیوں سے آج تک قاعدہ یہی ہے
بدن سے تیروں کو توڑ دینا گلے سے خنجر کو کاٹ دینا

جب کوئٹہ کے حالات معمول پر آ گئے تو سانحہ میں شدید مجروح ہونے والے برادران کو ڈاکٹر صاحب نے لاہور بلوا لیا اور انھیں یہاں ہر قسم کی طبی سہولت فراہم کی۔ جو زخمی اسپتال سے فارغ کر دیے جاتے ان کی مزید دیکھ بھال اور مرہم پٹی کے لئے آپ نے تحریک کے صوبائی دفتر میں منی اسپتال قائم کر لیا جہاں آپ ان کی نگہداشت کے لئے ہمہ وقت حاضر رہتے۔ آپ نے باقاعدگی سے مجروحین کی خدمت کی یہاں تک کہ آپ کو عام طور پر رات کے پچھلے پہر گھر جانا نصیب ہوتا۔

ایک رات آپ کو مرہم پٹی کرتے اور وقت پر دوائیاں وغیرہ دیتے دیتے رات کے دو بج گئے آپ دو بجے گھر روانہ ہوئے۔ تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے بعد ایک زخمی ٹانکے کھلنے کے باعث درد سے چیخنے لگا ڈاکٹر صاحب ابھی سوئے ہی تھے کہ ڈیوٹی پر مامور برادر قاسم حسن نے آپ کو فون کر کے نیند سے بیدار کر دیا آپ نے غنودگی کے عالم میں برادر کی بات سنی فوراً بستر چھوڑ کر گاڑی پر سوار ہوئے اور مریض کے پاس پہنچ گئے۔

جب آپ سے کہا گیا کہ آپ آرام فرما لیتے صبح آ جاتے تو آپ نے فرمایا کہ ''یہ عام زخمی نہیں ہیں یہ وہ مجروح ہیں جنھوں نے میرے محبوب قائد کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے گولیاں کھائیں ہیں انھوں نے اپنے جوان بھائی، بیٹے اور اپنے جسم کے ٹکڑے قربان کیے ہیں کیا ہم ان کے لئے آرام بھی قربان نہیں کر سکتے؟''

بقول برادر قاسم حسن کہ ڈاکٹر صاحب نے ان مریضوں کے پیشاب آلود کپڑے تک صاف کیے اور یہ سب کچھ کرنے کے باوجود بھی کہتے تھے کہ ''ان برادران کی قربانیوں کا حق ادا

نہیں ہو سکتا۔''

اپریل ۱۹۸۶ میں پاکستان کی تاریخ کے بڑے آمر نے علامہ سید عارف حسین الحسینی کے لانگ مارچ کے اعلان اور ان کے عوام کے جذبوں کے آگے گھٹنے تو ٹیک دیئے مگر اس نے درک کر لیا کہ ملت جعفریہ سے ٹکرانا اس کی حکومت یا اداروں کے بس کا روگ نہیں۔ حکمرانوں اور ان کے خفیہ اداروں نے طے کیا کہ ملت جعفریہ کے گلے میں ایک ایسا مخالف جماعتی طوق ڈال دیا جائے جو اس کے تحرک کو محدود کر دے۔ چنانچہ ۶ ستمبر ۱۹۸۶ کو ملک میں شیعہ مخالف ایک ایسی تنظیم کو جنم دیا گیا جو حکمرانوں کے خیالات سے بھی کہیں زیادہ کارگر ثابت ہوئی اور ڈاکٹر صاحب کی ۷ جولائی ۱۹۸۰ کی پیشگوئی نے ان کی دور اندیشی کو سچ ثابت کر دکھایا جب آپ نے اسلام آباد کے معرکہ کی کامیابی کے بعد واپسی پر احباب سے فرمایا تھا کہ ''آمر حکمران کے پاس ہمارے مقابلہ کے لئے صرف ایک حربہ باقی ہے کہ وہ فرقہ وارانہ بنیادوں پر کسی رجعت پسند گروہ کو ابھارے اور اسے ہمارے پاؤں کی زنجیر بنا دے۔''

شیعہ مخالف تنظیم نے پہلی بار جھنگ سے دہشت گردی کا آغاز کیا اور انھوں نے صادق حسین عزادار کو شہید کیا۔ جب یہ اطلاع تحریک کے صوبائی دفتر میں پہنچی تو یہاں سے قائدین جھنگ روانہ ہوئے۔ جھنگ کے مومنین میں خاصا غم وغصہ تھا جبکہ پولیس حکومتی اشاروں کے باعث شیعوں کو دبانے کے تمام حربے استعمال کر رہی تھی۔ ایک مرحلہ پر پولیس نے امام بارگاہ میں آنسو گیس کے گولے پھینکے اور شدید لاٹھی چارج کیا۔ اس موقع پر کمالیہ کے ایک جوان امتیاز حسین سر پھٹنے کی وجہ سے شہید ہو گئے۔ جب مظاہرین امام بارگاہ کے اندر آ گئے تو وہاں کا مجسٹریٹ ''شریف نوریا'' للکارتا ہوا گیٹ پر آیا ''شیعو بے غیرتو کہاں چھپ گئے ہو'' یہ جملے ڈاکٹر صاحب کے کانوں سے ٹکرائے تو آپ اکیلے آگے بڑھے اور اس کے منہ کی طرف انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے کہا ''خبردار اگر زبان دراز کی تو۔۔۔'' ایسے میں آپ پر لاٹھیوں کی بارش ہوئی اور آپ گرفتار کر لئے گئے۔

آپ جیل پہنچے تو وہاں پر پہلے سے اسیر برادران کو حوصلہ دیا اور انھیں تاکید فرمائی کہ یہاں

ذات سے زیادہ اپنے نظریہ کو ترجیح دینا۔نہانے کے لئے پانی طلب نہ کرنا بلکہ وضو کے لئے پانی مانگنا، زیادہ کھا کر سونہیں جانا بلکہ کم کھا کر عبادت کرتے رہنا اور پھر ایسے میں امامؑ کو یاد کرنا۔''

قرآن وسنت کانفرنس اور سفیر انقلاب

فرقہ واریت کے اٹھنے والے طوفان، آمر حکمرانوں کے بھیانک خیالات اور ملک کی ابتر صورت حال کے پیش نظر مارچ ۱۹۸۷ کو تحریک کو فقہ کے دائرہ سے نکال کر ملک کے سیاسی افق پر لانے کا فیصلہ کیا گیا۔جس کے نام اور تاریخ کا اعلان قائد ملت جعفریہ نے فرمایا اور طے پایا کہ

۶ جولائی ۱۹۸۷ کے روز یہ ''قرآن وسنت کانفرنس'' موچی دروازہ لاہور میں منعقد ہوگی جس میں ملت اسلامیہ کے قائد معاہدہ اسلام آباد کی یاد تازہ کرنے، فرقہ واریت کو روکنے، حکمرانوں کو ملکی سا لمیت کا احساس دلانے، تحریک کو بطور سیاسی جماعت پیش کرنے اور ملک کے مظلوم اور محکوم عوام کی نجات کے لئے اپنے سیاسی لائحہ عمل کا اعلان فرمائیں گے۔

اس کانفرنس کی اہمیت اور اسے بہتر انداز میں منعقد کرنے کی خاطر تمام تر انتظامات کے نگران ڈاکٹر محمد علی نقوی ٹھہرے۔کانفرنس کے اعلان سے اختتام تک ڈاکٹر صاحب نے کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر دن رات اس کی کامیابی کے لئے کام کیا۔آپ نے اعلان سے انعقاد تک تحریک کے صوبائی دفتر لاہور میں ڈیرے ڈال دیے جہاں سے نشر واشاعت، پیغامات، خطوط اور ملک بھر میں اپنے عوام سے رابطے استوار کیے۔آپ کی ہدایات پر درجنوں اقسام کے ہزاروں پوسٹر اور سٹکرز شائع ہوئے جو وطن عزیز کے چپہ چپہ پر چسپاں دکھائی دیے۔کارکنان آج بھی اس بات کے گواہ ہیں کہ سفیر انقلاب نے یہ پوسٹر اور سٹکرز کئی مقامات پر اپنے ہاتھوں سے لگائے۔

آپ نے موٹر سائیکل سواروں کے قافلے تشکیل دیے جنھوں نے لاہور سے اسلام آباد، ملتان، فیصل آباد اور سرگودھا تک چاکنگ کی۔آپ نے ملک بھر کے خود بھی دورہ جات کیے اور قریہ قریہ سے آنے والے قافلوں کی رپورٹس تیار کیں۔

بعض اوقات جب ۶ جولائی کی ''قرآن وسنت کانفرنس'' کی کامیابی اور عوامی جوش وخروش کا تذکرہ ہوتا تو ڈاکٹر صاحب ایک واقعہ سناتے کہ ''اس کانفرنس کی کامیابی کے لئے علامہ سید ساجد علی نقوی ودیگر زعمائے قوم کام میں مصروف تھے۔سفر کے دوران میں ایک مقام پر پیاس نے ہمیں ستایا ہم ایک ''کھوکھا'' پر بوتلیں پینے کے لئے رکے تو ''کھوکھے'' کے اندر یا علیؑ مدد کا سٹکر لگا ہوا دکھائی دیا۔میرے استفسار پر وہ کھوکھے کا مالک شیعہ نکلا۔چنانچہ میں نے اسے ۶ جولائی کی کانفرنس کے بارے میں آگاہ کیا اور اس سے بھی ۷۵ روپے چندہ لیا۔''

کانفرنس کے انعقاد کے سلسلہ میں آپ کی مصروفیات کا یہ عالم تھا کہ تحریک کے صوبائی دفتر کے دوستوں نے مزاحاً مشہور کر دیا کہ ''آج کل ڈاکٹر صاحب کے پاس جو مریض بھی آتا ہے آپ

اس کے نسخہ پر ۶ جولائی، موچی دروازہ چلو۔۔۔صبح دوپہر شام ضرور لکھتے ہیں۔''

آپ نے کانفرنس سے پندرہ بیس روز قبل قائد ملت جعفریہ کو آگاہ کر دیا کہ کانفرنس میں شرکت کے خواہاں افراد کی تعداد کو اپنے دامن میں سمانا ''موچی دروازہ'' کے بس کا روگ نہیں رہا لہٰذا وہ یونیورسٹی گراؤنڈ کے بارے میں نظر ثانی فرمائیں۔

جب خدا کے برگزیدہ عبد اور ملت جعفریہ کے قائد کو اپنی روحانیت اور احباب کی رپورٹس نے عوام کے سمندر کی نوید دی تو انھوں نے مینار پاکستان پر قرآن وسنت کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کر دیا۔

تحریک کے دیگر قائدین اور منتظمین نے اس سے اختلاف کیا ان کا خیال تھا کہ مینار پاکستان کے گراؤنڈ کا پیٹ بھرنا بصد مشکل ہے مگر علامہ سید عارف حسین الحسینی نے فرمایا ''یہ فیصلہ اٹل ہے'' ڈاکٹر صاحب سمیت جو افراد قائد کی روحانی طاقت سے آگاہ تھے انھوں نے آپ کے چہرے کے تیور اور آنکھوں کی چمک دیکھ کر سر خم کر لئے۔

چونکہ یہ فیصلہ آخری دو روز میں ہوا اس لئے منتظمین کے لئے دو ماہ کے کیے گئے انتظامات تبدیل کرنا بظاہر ناممکن تھا مگر ایسے میں ڈاکٹر صاحب نے ''اللہ اکبر'' کا نعرہ بلند کیا اور دو روز کے اندر ''مینار پاکستان'' میں انتظامات کو مکمل کر کے سوچنے والوں کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔

آپ نے سیکورٹی کے تمام امور اپنے ہاتھ میں رکھے۔ ہر کارکن اور امامیہ اسکاؤٹس کو اس کی ذمہ داریاں تفویض کیں اور آپ نے اپنے پیغمبر اکرم رسول خداؐ کے جنگ احد کے موقع پر دیے گئے احکامات کی سنت ادا کرتے ہوئے احباب کو حکم دیا کہ وہ کسی بھی مرحلہ پر اپنے مقررہ مقام سے تل بھر نہ ہٹیں۔ آپ نے کانفرنس سے ایک روز قبل اور کانفرنس کے روز اپنے مواصلاتی نظام سے ہر کارکن اور محافظ کو اس کے مقام پر کئی بار چیک کیا۔

کانفرنس کے بیسیوں کارکنان کا کہنا ہے کہ انھوں نے کانفرنس کے آخری دو روز میں ڈاکٹر صاحب کو کہیں سوتے نہیں دیکھا شاید یہی وجہ تھی کہ آپ جیسا انتھک اور فولادی جسم وعزم کا شخص کانفرنس کے روز تقریباً ڈیڑھ بجے دوپہر بے حال ہو گیا اور آپ کو توانائی دینے کے لئے گلوکوز کی

بوتل لگانی پڑی۔

آپ ہوش میں آئے تو آرام کیے بغیر پھر مصروف کار ہو گئے۔ ڈیوٹی پر حاضر تمام کارکنان کو ہوشیار کر کے خود قائد ملت اسلامیہ کو لینے چلے گئے۔ آپ جونہی پنڈال میں اپنے محبوب قائد کے ساتھ آئے تو پنڈال استقبالی نعروں سے گونج اٹھا۔ زمین اور آسمان کے درمیان ایک ارتعاش آیا قائد ملت اسلامیہ علامہ سید عارف حسین الحسینی سٹیج پر تشریف لائے تو لاکھوں ہاتھ دعا کے لئے اٹھے اور ہر زبان پر یہ دعا موجزن ہوئی۔

خدایا خدایا تا انقلاب مہدی
زندہ رہے خمینیؒ زندہ رہے حسینی

آج بھی اگر ۶ جولائی ۱۹۸۷ کی ویڈیو فلم میں اس تاریخی کانفرنس کا منظر دیکھیں تو ڈاکٹر محمد علی نقوی فرط جذبات میں ڈوب کر وجد کی حالت میں

خدایا خدایا تا انقلاب مہدی
زندہ رہے خمینیؒ زندہ رہے حسینی

کے نعرے لگاتے ہوئے واضح نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ زندگی گزارنے والے احباب کا کہنا ہے کہ انھوں نے پہلی بار ڈاکٹر صاحب کو وجد کی کیفیت میں جھومتے دیکھا۔

اسی کانفرنس کے اختتام پر ایک صحافی نے آپ سے انٹرویو کیا ''جو کیمرے کی آنکھ میں محفوظ ہے'' گفتگو یوں ہوئی۔

☆ ''سنا ہے کہ آپ اس تاریخی کانفرنس کے نگران تھے''
} ''نہیں میں اس کانفرنس کا کارکن تھا''
☆ ''کیا آپ کی نظر میں یہ کانفرنس کامیاب رہی ہے؟''
} اس میں کوئی شک نہیں آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں یہ ہماری بہت بڑی کامیابی ہے۔''
☆ ''کیا آپ اس کی کامیابی پر خوش ہیں؟''
} ''الحمدللہ میں بے حد خوش ہوں''

☆ ''آپ کچھ مزید کہنا چاہیں گے؟''

} ''میری دعا ہے کہ ہمارے تمام قافلے بخریت گھروں کو پہنچ جائیں''

جب ۷ جولائی کو تمام کارواں بخریت پہنچ گئے تو ڈاکٹر صاحب نے اپنے رب کا شکر ادا کیا اور صوبائی دفتر تحریک میں لاہور کے کارکنان کے اعزاز میں ایک عشائیہ دیا۔ جب آپ سے پوچھا گیا کہ آپ اس قدر خوش کیوں ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: میں صرف اجتماع کو دیکھ کر خوش نہیں ہوا بلکہ میری خوشی کی وجہ یہ ہے کہ'' پاکستان کے قیام کے بعد پہلی مرتبہ اہل تشیع کی قیادت نے باقاعدہ طور پر ملکی امور میں مداخلت کرنے اور ملک میں سامراج کی مداخلت کو روکنے کا اعلان کیا اور ایک ساتھ ہی فرقہ سے بالاتر ہو کر ملک کے محروم اور محکوم عوام کے حقوق کی بازیابی اور قیام پاکستان کے مقاصد کے حصول کے لئے اپنی جدوجہد کا آغاز اور لائحہ عمل پیش کیا ہے۔''

☆☆☆☆☆

تحریک کا وسیع نظریاتی سفر شروع ہوا تو سفیر انقلاب کارواں ساز ٹھہرے۔ اتحاد بین المسلمین کا پیغام پھیلانے کے لئے مذہبی جماعتوں کے قائدین سے رابطے ہوئے یا جمہوریت کے استحکام کے لئے سیاسی پارٹیوں کے رہنماؤں سے ملاقاتیں ہوئیں ڈاکٹر صاحب تقریباً ہر مذاکراتی ٹیم میں شامل رہے۔

عظیم قائد ڈاکٹر صاحب کو فرط محبت وشفقت میں ڈاکٹر بھائی کہا کرتے تھے دور سے دیکھتے تو آپ کے روحانی چہرے سے نور کی کرنیں پھوٹ پڑتیں، آپ کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آجاتی اور آپ اٹھ کر ڈاکٹر صاحب کا استقبال کرتے۔ قائد شہید کا معمول تھا کہ اگر کوئی ان کی دست بوسی کرنے لگتا تو وہ جنبش سے ہاتھ کھینچ لیتے یا تو وہ نہیں چاہتے تھے کہ عوام فقط ان کی دست بوسی تک محدود رہے اور انھیں روایتی مرشد کا روپ دے دیں۔ ایک مرتبہ ذاتی طور پر میرے ساتھ بھی یہی نوبت آئی کہ آپ ڈیرہ اسماعیل خان تشریف لائے تو ایئر پورٹ پر حجۃ السلام

والمسلمین علامہ غلام حسن جاڑا، خورشید انور ایڈووکیٹ اور راقم جہاز تک گئے اپنے معزز مہمان اور قائد کو خوش آمدید کہا اس موقع پر قائد محبوب نے دونوں ہاتھوں سے مجھ سے مصافحہ کیا۔ میں نے فرط عقیدت میں دست بوسی کی کوشش کی تو آپ نے ہاتھ کھینچ لئے۔۔۔ پھر آپ نے میری جانب دیکھا تو آپ کو میری تشنہ حسرت کا جواب میری آنکھوں سے ملا آپ نے دایاں ہاتھ میرے سر پر رکھا۔۔۔ لب دبے معلوم نہیں کیا فرمایا۔۔۔ مجھے اب سمجھ آتی ہے کہ آپ کا دست، سر پر شفقت ہی نہیں تھا بلکہ آپ نے میری تعمیر کا افتتاح فرمایا تھا۔

خیر! بات ہو رہی تھی کہ قائد عموماً اپنی دست بوسی نہیں کرنے دیتے تھے البتہ پاکستان میں دو چار افراد ایسے ہیں کہ جب وہ دست بوسی کرتے تو قائد اپنا دست مبارک کبھی نہ کھینچتے ان میں ایک ڈاکٹر محمد علی نقوی کی ذات گرامی تھی۔

عالم قائد کی مجاہد بھائی سے محبت اس قدر مستحکم تھی کہ قائد ملت اسلامیہ جب کسی نئے منصوبہ کے بارے میں سوچتے یا ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں اپنی قوم اور ملک کی فلاح کے لئے کوئی نیا پروگرام ابھرتا تو فی الفور رابطہ کرتے۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک مرتبہ خود فرمایا تھا کہ بعض اوقات رات کے وقت قائد صاحب کا پشاور سے فون آتا کہ ''ڈاکٹر بھائی اگر آپ کے پاس وقت ہے تو آپ صبح ناشتہ میرے ساتھ کریں۔'' لہٰذا میں بذریعہ کوچ رات کو روانہ ہوتا اور صبح پشاور پہنچ جاتا۔ وہاں قائد نئے منصوبوں پر سیر حاصل گفتگو فرماتے اور سمت دیتے۔''

یہی حالت ڈاکٹر صاحب کی بھی تھی کہ جونہی آپ کو ''سفیر نور'' کی زیارت کا اشتیاق تڑپاتا یا کوئی اہم قومی مسئلہ رونما ہوتا تو آپ فوراً قائد کی خدمت میں پیش ہو جاتے۔ ایک دفعہ آپ پنجاب یونیورسٹی میں کسی کام سے گئے ہوئے تھے آپ کے بزرگوار سید اعجاز شاہ بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ راستہ میں موٹر سائیکل چلاتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں ضیاء الحق کے اعلان ریفرنڈم کے خلاف ایک سوچ نے انگڑائی لی اور آپ اپنے بہنوئی سے کہا کہ وہ انھیں اسٹیشن چھوڑ آئیں۔ آپ گھر لوٹے اور کپڑے تبدیل کیے بغیر سیدھا اسٹیشن پہنچے اور وہیں سے پشاور روانہ ہو گئے۔ راستہ میں آپ سے بہنوئی نے تکرار بھی کی کہ وہ کل چلے جائیں مگر آپ نے فرمایا ''زندگی کی مہلت

سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ گھر تو لوٹ ہی آنا ہے'' آپ پشاور پہنچے، قائد کو اپنا پلان بتایا، جو انھیں بے حد پسند آیا اور انھوں نے اس پر عمل درآمد کی اجازت دی۔

آپ کی قیادت سے وابستگی اور قیادت کا آپ پر اعتماد دیکھ کر اپنی صفوں کے چند مخالفین نے کہا تھا کہ ''عارف حسینی تو ڈاکٹر نقوی کے گرد گھومتے ہیں''

ڈاکٹر صاحب کو اپنے قائد سے اس قدر عقیدت تھی کہ فون پر گفتگو کرتے ہوئے احتراماً اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ قائد کی شہادت کے بعد آپ اپنے دفتر میں مصروف کار تھے کہ ایک نوجوان، شہید قائد کی خوبصورت تصویر لایا۔ آپ دیکھتے ہی بے اختیار کھڑے ہو گئے، تین بار تصویر کو بوسہ دیا اور اسے فریم کرانے اور اپنے دفتر بھجوا دینے کی تاکید فرمائی۔

☆☆☆☆

لاہور کی مرکزی قرآن وسنت کانفرنس کی کامیابی کے بعد ڈاکٹر صاحب اور آپ کے احباب نے فیصلہ کیا کہ تحریک کو اپنا سیاسی سفر ایک نئی اٹھان اور درد سے شروع کرنا چاہیے لہٰذا اس سلسلہ میں قرآن وسنت کانفرنس کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ چنانچہ اس ضمن میں ملتان، فیصل آباد اور ڈیرہ اسماعیل خان میں یادگار ''قرآن وسنت کانفرنس'' کا انعقاد ہوا جن کے انتظامات میں سفیر انقلاب نے بحیثیت فرزند قرآن وسنت تاریخی کردار ادا کیا۔

۴ مارچ ۱۹۸۸ کو ملتان کانفرنس کے اختتام پر جب قائد کچھ دیر کے لئے آرام فرمانے چلے گئے تو ڈاکٹر صاحب جنھوں نے ان کے ساتھ راولپنڈی روانہ ہونا تھا جلسہ گاہ ''قلعہ قاسم باغ'' میں رہے۔ یہاں تک کہ آپ نے کارکنان کے ساتھ دریاں لپیٹیں اور کرسیاں سمیٹیں۔ آپ کام سے فارغ ہوئے تو قائد کے پاس آ گئے جہاں سے سیدھے راولپنڈی چلے گئے اور گاڑی خود چلائی۔ جب آپ سے کسی دوست نے پوچھا کہ آپ مسلسل دو روز سے کام میں مصروف ہیں آرام کر لیں تو آپ نے فرمایا ''تھکاوٹ کا تعلق اپنی ذات سے ہے جب ہمارا سفر خدا کی ذات کے لئے ہے تو پھر تھکاوٹ کیسی۔۔۔؟''

۱۸ مارچ کو فیصل آباد کی قرآن وسنت کانفرنس کے وقت آپ نے انتظامی امور کے

ساتھ ساتھ حفاظتی اقدامات پر خاصی توجہ دی کیونکہ یہاں فرقہ وارانہ فساد کا خطرہ قوی تھا۔ جب کانفرنس کے دوران میں آندھی نے نظام درہم برہم کیے تو آپ نے ڈیوٹی پر مامور ہر کارکن سے رابطہ کیا اور انھیں اپنے مقام پر چوکنا رہنے کی ہدایت کی۔ کانفرنس کے اختتام پر قائد ملت اسلامیہ نے ایک ضیافت میں سیاست اور صحافت سے متعلقہ شخصیات اور صحافیوں سے ملکی اور بین الاقوامی صورتحال پر گفتگو کی اور ان کے تابڑ توڑ سوالات کے منہ توڑ جوابات دیے تو ڈاکٹر صاحب بے حد خوش ہوئے۔ اس محفل کی گفتگو کے بعد آپ نے اپنے احباب سے پوچھا کہ آیا کسی نے یہ گفتگو ریکارڈ کی ہے۔۔۔؟ جب جواب منفی میں ملا تو آپ نے بے حد افسوس کیا اور زندگی بھر اس گفتگو کے انداز کو یاد کرتے رہے۔ آپ اس محفل میں قائد کی دوراندیشی اور ملکی حالات پر گرفت کے اس قدر معترف تھے کہ آپ جب ''سفیر نور'' کتاب کے مسودہ کا جائزہ لے رہے تھے تو ایک مقام پر فرمایا'' کاش تسلیم بھائی ہمارے پاس فیصل آباد میں قائد کی گفتگو کا ریکارڈ ہوتا اور آپ اسے یہاں نقل کرتے'' آپ نے مزید فرمایا کہ ''ہمیں تو اس روز سے یقین ہو گیا تھا کہ ایسا شخص پاکستان میں تو کجا دنیا کے کسی کونہ میں بھی ہوتا تو امریکہ اور اس کے ایجنٹ اس کی سانسیں گوارہ نہ کرتے۔

۱۷ جون ۱۹۸۸ کو ڈیرہ اسماعیل خان کی کانفرنس ہوئی تو آپ مئی کی گرمی میں کانفرنس کے انتظامات کا جائزہ لینے کے لئے پہنچے پھر اس سلسلہ میں لاہور سے فون کے ذریعہ مربوط رہے اور کانفرنس سے ایک دو روز قبل پھر تشریف لائے تمام کارکنان کی حوصلہ افزائی کی۔ سٹیج کا نظام سنبھالنے والے افراد کے بارے میں معلومات طلب کیں۔

یہاں بھی کانفرنس کے اختتام پر ضلع کونسل کے ارکان کی جانب سے قائد ملت اسلامیہ کو عشائیہ دیا گیا جہاں آپ نے علاقائی سیاست دانوں سے ملکی حالات پر مفصل اور مدلل گفتگو کی جس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے فرمایا'' کہ ماشاءاللہ قائد محترم کو اب تو اردو بولنے پر خاصی گرفت حاصل ہو گئی ہے اور سیاسی سطح پر دیگر سیاسی رہنماؤں سے بہت ممتاز نظر آتے ہیں خدا نظر بد سے محفوظ رکھے۔''

ڈیرہ اسماعیل خان کی کانفرنس کے بعد آپ کا خیال تھا کہ سندھ میں ایک ''قرآن وسنت کانفرنس'' کا انعقاد ہو۔ مگر آپ اسی سال حج پر چلے گئے جہاں سعودی حکومت نے آپ کو گرفتار کرلیا۔ آپ پابند سلاسل ہی تھے کہ ادھر آپ کے محبوب اور ملت اسلامیہ کے افتخار علامہ سید عارف حسین الحسینی ۵ اگست ۱۹۸۸ کی دم صبح اپنے مدرسہ ''جامعۃ المعارف'' پشاور میں شہید کردیے گئے اور یوں ''سفیر نور'' اور ''سفیر انقلاب'' کی ہمسفری کا درخشاں باب ختم ہوگیا۔

آپ کو اپنے قائد کی شہادت کی اطلاع سعودیہ کے تاریک زندانوں میں دوروز بعد موصول ہوئی۔۔۔۔آپ پر کیا بیتی اور اس خبر کو کیسے سنا اور برداشت کیا یہ بات بیان کی محتاج نہیں۔

آپ سعودیہ میں کیوں اور کیسے گرفتار ہوئے اس کا تذکرہ اگلے صفحات پر آئے گا تاہم آپ کی رہائی ملت جعفریہ پاکستان کے پرزور مظاہروں اور دباؤ کی بدولت ہوئی۔ آپ کو چار ساتھیوں سمیت سعودی حکومت نے پاکستانی حکومت کے حوالے کیا۔ آپ کے علاوہ دیگر احباب رہا کردیئے گئے جبکہ پاکستانی تفتیشی ٹیمیں آپ کو ''سہالہ کیمپ اسلام آباد'' لے گئیں جہاں کچھ روز تک آپ سے تفتیش کی۔

تحریک جعفریہ کے سفر کا تیسرا مرحلہ:

ڈاکٹر صاحب جب جیل سے رہا ہوئے تو قائد شہید کے چہلم کا اعلان ہو چکا تھا اور اس وقت کے قائم مقام صدر تحریک نفاذ فقہ جعفریہ پاکستان علامہ سید ساجد علی نقوی لائحہ عمل تیار کررہے تھے۔ آپ جیل سے سیدھا مدرسہ ''آیت الحکیم'' راولپنڈی چلے گئے اور علامہ سید ساجد علی نقوی کو شہید قائد کا پرسا دیا آپ نے وہاں پر موجود کارکنان سے شکوہ بھی کیا کہ ابھی تک اسلام آباد اور راولپنڈی میں قائد شہید کے چہلم کے اشتہار چسپاں نہیں ہوئے۔

آپ کی کوشش تھی کہ اطلاع کیے بغیر چپکے سے لاہور پہنچیں تاکہ کارکنان کوئی جلوس وغیرہ نہ نکال سکیں۔ تاہم آپ سیدھا تحریک کے دفتر پہنچے تو کارکنان نے آپ کا تعزیتی خیر مقدم کیا۔ آپ کو قائد کی شہادت کا پرسا دیا اور آپ نے یتیم بھائیوں کو دلاسے دیے۔

آپ نے ہر ملاقاتی سے اپنے قائد کی شہادت کی تعزیت لی اور برادران کو قائد کے چہلم کے اجتماع کی کامیابی کے لئے کام کرنے کی تاکید فرمائی۔

سفیر انقلاب پشاور میں اپنے شہید قائد کی مقتل گاہ پر پہنچے۔ تو ساون کے بادل کی طرح ٹوٹ کے روئے۔ جب مقتل سے روانہ ہونے لگے تو آپ کی نظر وہاں دیوار پر چسپاں ہاتھ سے لکھے ہوئے ایک کاغذ پر پڑی جس پر درج تھا کہ

ہمارے بعد بھی رونق رہے گی مقتل میں
ہم اہل دل کو بڑے حوصلے میں چھوڑ آئے

اگرچہ آپ کو شعر وشاعری سے کبھی لگاؤ نہیں رہا مگر بعض اوقات شعر کی گہرائی اور مطلب آپ کے جذبات کی ترجمانی کرتا تو آپ داد دیتے۔ آپ نے یہ شعر پڑھ کر وہاں ایک طالب علم کو بلایا اور اسے تاکید کی کہ اس شعر کو بینر پر خوبصورت لکھوا کر مقتل کی دیوار پر لگوادیں۔

مقتل سے عہد وفا کرنے کے بعد آپ واپس آگئے جب آپ کو چند احباب کے ساتھ ''پیواڑ'' جانا پڑا تو اداس چہرے کے ساتھ مزار پر پہنچے۔ قوم کو یتیم کرکے پتھروں کے نیچے سوجانے والے قائد کی آرام گاہ کے پاؤں کی جانب بیٹھے۔ دھاڑیں مار کر روئے اور مناجات کیں۔ آپ کو اپنے قائد کی شہادت کا بے حد دکھ تھا اور اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ''شہید قائد کا خون ہماری گردنوں پر قرض ہے۔''

قائد شہید کے چہلم کے موقع پر جب موجودہ قیادت نے ڈیرہ اسماعیل خان میں روٹ بحال نہ کرنے کی صورت میں ۳۰ ستمبر ۸۸ کو ماتمی جلوس برآمد کرنے کا اعلان کیا تو ڈاکٹر شہید ''کربلائے ڈیرہ اسماعیل خان'' کی منصوبہ بندی میں مصروف ہوگئے۔

آئی۔ایس۔او کے مرکز کو ہدایات دیں۔ مرکزی امور طے کرلینے کے بعد ۳۰ ستمبر سے چار روز قبل ڈیرہ اسماعیل خان پہنچے۔ آپ نے وہاں کے قائدین اور آئی۔ایس۔او کے اہم برادران سے ملاقتیں کیں اور صورتحال کا جائزہ لیا۔ آپ نے دیگر شہروں سے آئے ہوئے بااعتماد تنظیمی ساتھیوں کی ٹیمیں تیار کیں جنھوں نے مختلف روپ میں شہر بھر کے لوگوں، مخالف عناصر کی

سرگرمیوں اور حکومتی اداروں کی نقل وحرکت کا جائزہ لیا اور ڈیرہ کے جذباتی نوجوانوں کو دلائل کے ساتھ قابو میں لایا۔ آپ نے فرمایا کہ ''ہمارا مقصد بغاوت نہیں بلکہ مرکز کی پالیسی کے مطابق ہم پہلے مرحلہ میں مذاکرات سے مسئلہ کا حل چاہیں گے اور اس کے بعد پرامن احتجاج کریں گے۔''

بڑے وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ اگر ان ایام میں نوجوانوں کے درمیان ڈاکٹر صاحب جیسی شخصیت نہ ہوتی تو وہ بہت کچھ کر گزرتے۔ میری زندگی کا یہ پہلا موقع تھا جب میں نے سفیر انقلاب کو قریب سے دیکھا۔ میں نے محسوس کیا کہ آپ ان حالات میں مسلسل مصروف کار رہے۔ مرکز سے مسلسل رابطہ، مختلف شہروں کے قائدین سے صورت حال پر گفتگو اور ڈیرہ کے بزرگوں اور نوجوانوں کے اجلاس میں باقاعدگی سے شرکت اور انھیں مرکز کی پالیسی سے آگاہ رکھنا آپ کی مصروفیات تھیں۔

۲۹ ستمبر ۱۹۸۸ کے روز جب ڈیرہ کو آنے والے تمام راستے سرحد حکومت نے بند کر دیئے اور ۳۰ ستمبر کے روز کرفیو کا اعلان کیا تو ڈاکٹر صاحب اپنی حکمت عملی کے تحت سینکڑوں افراد کو مقام مقررہ پر لانے میں کامیاب ہوگئے۔ یہاں بھی پولیس نے آپ کو گرفتار کرنے کی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہوسکے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک شخص نے ہمیں اطلاع دی تھی کہ وہ ڈاکٹر نقوی کو محفوظ

مقامات تک محدود رکھیں کیونکہ ان کی گرفتاری کے لئے خصوصی ٹیمیں روانہ ہوچکی ہیں۔ چونکہ مرکز کی جانب سے دو شخصیات علامہ سید افتخار حسین نقوی اور ڈاکٹر محمد علی نقوی تمام امور کے مسئول تھے اس لئے خفیہ اداروں کی نگاہیں آپ پر مرکوز تھیں۔

یہ بات ڈاکٹر صاحب کے علم میں آچکی تھی کہ سرحد کا حکمران فضل حق قائد شہید کے قتل میں ملوث ہے اور وہ علامہ سید ساجد علی نقوی کے پہلے اعلان پر ضرب کاری لگانے کا فیصلہ کر چکا ہے لہٰذا آپ نے بااعتماد ساتھیوں کو آگاہ فرمایا کہ وہ ہر حادثہ کے لئے تیار رہیں۔ جہاں سے جلوس نے برآمد ہونا تھا وہاں آپ نے ایک ''منی اسپتال'' قائم کرایا جہاں طبی امداد کے تمام لوازمات رکھوائے۔ آپ نے اس موقع پر مختلف بلڈ گروپ رکھنے والے نوجوانوں کا گروپ تشکیل دیا تاکہ ایمرجنسی کی حالت میں زخمیوں کو خون فراہم کیا جاسکے۔

میں اس بات کا گواہ ہوں کہ میں نے ڈاکٹر صاحب کو صرف رہنما کی حیثیت سے ہدایات دیتے نہیں دیکھا بلکہ آپ ہر مشکل مرحلہ میں پہلے خود آگے بڑھے اور پھر نوجوانوں کو کھینچا۔ یہاں تک کہ جب جلوس نکالنے کا وقت آیا۔ آپ نے قائد محترم سے رابطہ کیا انھیں صورتحال سے آگاہ فرمایا اور ان سے ہدایات لیں۔ آپ قائد سے رابطہ کر کے نوجوانوں میں آئے تو فرمایا کہ ''قائد نے فرمایا ہے کہ علم عباس اٹھاؤ۔۔۔ قدم بڑھاؤ۔۔۔ امام زمانہ عجل اللہ فرجہ آپ کے حامی وناصر ہوں۔''

آپ نے اس موقع پر نوجوانوں سے کہا کہ وہ جلوس کی روانگی سے پہلے دو رکعت نماز ادا کرلیں اور خدا سے اپنی نصرت کی دعا کریں۔ چنانچہ نوجوانوں کی کثیر تعداد نے نماز ادا کی۔ روضہ امام حسین علیہ السلام کی زیارت کی اور

ہماری یہ جوانیاں حسینؑ کی قربانیاں

کا نعرہ بلند کرتے ہوئے شہادت کے لئے تیار نظر آئے۔ آپ کی حکمت عملی سے صفیں درست ہوئیں۔ جب عصر کا وقت آیا تو ۱۴ اور ۲۷ کے قافلے علم عباسؑ اٹھا کر سڑکوں پر نکلے جن پر پولیس نے وحشیانہ فائرنگ کی۔ جس کے نتیجہ میں ۱۲ افراد شہید اور درجنوں زخمی ہوگئے۔ آپ نے لاشیں

بھی اٹھائیں اور زخمیوں کو طبی امداد بھی فراہم کی۔ آپ نے ڈیرہ کا اسپتال ایک روز پہلے دیکھ لیا تھا اس لئے ایمرجنسی میں آپ اپنے زخمیوں کے ساتھ اسپتال آئے اور ڈاکٹروں سے مفصل گفتگو کی۔

دوسری صبح جب شہداء کے لاشوں کو غسل وکفن دینے کا وقت آیا تو ڈاکٹر صاحب اکثر شہداء کو اپنے ہاتھوں سے غسل دیتے رہے۔ نماز جنازہ کے لئے صفیں درست ہوتیں تو آپ ''الصلوٰۃ ۔۔۔الصلوٰۃ'' کی صدا دیتے اور نماز جنازہ کے اختتام پر یا حسینؑ۔۔۔ یا حسینؑ کے پر درد جملے بلند کرتے اور ماحول میں درد پیدا کر دیتے۔

جب ہم ایک شہید کا جنازہ اس کے گھر چھوڑنے جا رہے تھے تو ڈاکٹر صاحب نے مجھے بلایا اور آہستہ سے کہا کہ ''روٹ بحال کرنے کے احکامات جاری ہو چکے ہیں۔ ان شاء اللہ کل پرسوں آپ لوگوں کا روٹ بحال ہو جائے گا اور آپ حسب روایت نوحہ وماتم کرتے ہوئے گزریں گے'' البتہ مجھے یہ بات اپنی ذات تک محدود رکھنے کی تاکید فرمائی اور اپنی بھیگی ہوئی پلکوں سے شہید کے جنازہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ''عزیز دوست دنیا کی طاقتور ترین چیز خون ہے'' آپ کا یہ تاریخی جملہ سنا تو بے ساختہ خیال آیا۔

فوج حق کو کچل نہیں سکتی
فوج چاہے کسی یزید کی ہو
لاش اٹھتی ہے پھر علم بن کر
لاش جب بھی کسی شہید کی ہو

جب ڈیرہ شہر کی سڑکیں شہداء کے خون کی طاقت سے آزاد ہوئیں تو بھکر موڑ پر رکے ہوئے احباب ڈیرہ پہنچے جن میں برادر ثاقب نقوی نمایاں تھے۔ جنھوں نے بھکر موڑ پر قافلوں کے جذبات کو گرمائے رکھا تھا۔ رات کو ہماری نشست آئی۔ ایس۔ او ڈیرہ ڈویژن کے ڈویژنل صدر برادر ظفر انصاری کے گھر ہوئی جہاں ڈاکٹر صاحب نے احباب کے سامنے ڈیرہ کے عوام کے جذبات اور آئی۔ ایس۔ او کے برادران کی وفاؤں کو نہایت عمدہ الفاظ میں بیان فرمایا اور اس موقع

پر آپ نے چند برادران کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ''ثاقب بھائی ان برادران کے ایک ''ترانہ شہادت'' نے مومنین کے جذبات کو عروج تک پہنچایا ہے۔ یقیناً ان برادران کا ترانہ سن کر رگوں میں خون کھولنے لگتا تھا۔ آپ نے ترانہ سنانے کی خواہش کی اور جب آئی۔ ایس۔ او ڈیرہ کے برادران مرکزی کنونشن کے لئے لاہور آئے تو آپ نے یہاں بھی ان سے ترانہ پیش کرنے کو کہا اور ان سے ترانہ سن کر فرمایا کہ ''آپ برادران نے پھر سارا منظر ذہن میں دوڑا دیا ہے۔''

اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ حواس پگھلا دینے والے ماحول میں آپ نہ صرف اپنے حواس کو برقرار رکھتے بلکہ آپ کا ہاتھ ہزاروں افراد کی نبضوں پر ہوتا تھا اور آپ مشکل ترین لمحات کی دھڑکنوں کو اپنی گرفت میں رکھتے تھے۔ قومی معاملات میں مذاکرات کرنے پر آتے تو بڑے بڑے بیوروکریٹس کے ذہن سن کر دیتے۔۔۔ للکارنے پہ آتے تو فولادی لوگوں کے ماتھے سے پسینے کے نالے بہاتے۔ ہر قومی سانحہ کو کربلا سے تشبیہ دیتے اور ہر کربلا میں کربلا کو زندہ کرتے اور ایسے مواقع پر فرماتے ''حسینیوں کے مشکیزوں کا یزیدیوں کے تیروں سے پرانا رشتہ ہے۔''

قائم ہے اک روایت دیرینہ ظلم کی
بازو بدل گئے، کبھی خنجر بدل گئے

تحریک کا سیاسی سفر اور سفیر انقلاب

گیارہ سال کے بعد ملک کے جسم پر لپٹی ہوئی آمریت کی چادر اتری تو تحریک جعفریہ نے دیگر سیاسی جماعتوں کی طرح جمہوریت کے استحکام کے لئے اپنا سیاسی کردار ادا کیا۔ نومبر ۱۹۸۸

کے عام انتخابات کا اعلان ہوا تو تحریک جعفریہ بھی بحیثیت ایک سیاسی جماعت میدان سیاست میں اتری۔ چونکہ حالات کے پیش نظر تحریک کا کسی جماعت سے سیاسی الحاق نہ ہوسکا اس لئے اسے اپنے پلیٹ فارم سے الیکشن لڑنا پڑا۔ تحریک نے ملک بھر کے حلقوں میں اپنے امیدوار نامزد کیے تو علی رضا آباد لاہور کے لئے ڈاکٹر صاحب کا انتخاب کیا گیا۔ آپ تحریک جعفریہ کی جانب سے ایم۔ پی۔ اے کے امیدوار ٹھہرے اور چند روز کنوینسنگ کرنے کے بعد وہاں کے نواب رضا عباس قزلباش کے حق میں دستبردار ہوگئے۔ مگر انھیں تحریک کی حمایت کے لئے آمادہ کیا۔

بعض احباب کا خیال تھا کہ سیاست دان بننا ڈاکٹر صاحب کے مزاج کا حصہ نہیں تھا اور بعض احباب کی رائے تھی کہ اگر ڈاکٹر صاحب اپنے حلقہ انتخاب میں مصروف ہوجاتے تو پھر ملک بھر کے تحریکی حلقے منصوبہ بندی سے محروم رہتے۔ بہرطور آپ نے ذات کی بجائے قوم کے مفاد کو ترجیح دی اور تحریک کے صوبائی آفس میں بیٹھ کر تمام سیاسی حلقوں کی پلاننگ کی اور بعض حلقوں میں دورہ جات کر کے مخالفین کو ناکوں چنے چبوائے۔

آپ اس بارے میں بڑے واضح تھے کہ اس وقت تحریک جعفریہ ملک میں مروجہ نظام سیاست اور انتخابات میں کسی طور پر بھی فٹ (Fit) نہیں ہے۔ اگرچہ آپ پر واضح تھا کہ تحریک اپنے نام اور علیحدہ پلیٹ فارم سے ایوان تک نہیں پہنچ سکتی تاہم سیاسی میدان میں داخل ہونے پر آپ مطمئن تھے۔ فرماتے تھے کہ انتخابات کی کامیابی سے زیادہ کامیابی یہ ہے کہ برصغیر کی تاریخ میں پہلی بار اہل تشیع کی نمائندہ جماعت اپنے پلیٹ فارم سے ملکی سیاست میں حصہ دار ہورہی ہے اور اس انتخاب میں جو تجربہ حاصل ہوگا وہ ہماری آئندہ کی سیاست پر اثرات مرتب کرے گا۔

۱۹۸۸ کے انتخابات کے بعد ملک کے حالات یکسر بدل چکے تھے۔ نہ آمریت کی سیاہ رات کا راج تھا نہ جمہوریت کے دن کا شباب۔۔۔ تحریک جعفریہ جو آمر کے عوامل کا ردعمل تھی عمل کے خاتمے کے بعد اس کا ردعمل بھی سست پڑ رہا تھا اور اس کی کوئی سمت نمایاں نہ تھی۔ سیاسی سطح پر تحریک کو آمریت کی باقیات بھی سخت مخالف جانتی تھیں اور جمہوریت کے دعویدار بھی ان سے ناخوش تھے کیونکہ تحریک ان کے ووٹ بنک کے لئے خطرہ ثابت ہوئی تھی اور وہ چند حلقوں میں

اپنی شکست کا موجب بھی تحریک کو قرار دیتے تھے۔

تحریک کے پاس اپنے شہید قائد کے قاتلوں کی گرفتاری کا مطالبہ بذات خود ایک تحریک تھی چنانچہ جون ۱۹۸۹ میں یہ خون ناحق مقتل سے نکل کر بازاروں میں بولا حکمران فضل حق قاتلوں کا سرغنہ ٹھہرا تو ملت جعفریہ کے زخموں کی ٹیس درد بن کر اٹھی اور ملک میں بھونچال برپا کر گئی۔

ایسے میں سفیر انقلاب تڑپے اور قانونی راستے سے قاتل کو کیفر کردار تک پہنچانے کی ٹھانی۔ آپ نے تحریک جعفریہ اور آئی۔ ایس۔ او پاکستان کے کارکنان کو احتجاج کا لائحہ عمل دیا۔ لاہور میں بڑے بڑے مظاہرے کروائے اور تمام مظاہروں میں شریک رہے۔

ملت جعفریہ کے دباؤ کی بدولت جب سرحد کے حکمران کو سرحد کی زمین تنگ نظر آئی تو وہ پنجاب میں نواز شریف کے پہلو میں آ بیٹھا۔ مگر یہاں بھی ڈاکٹر صاحب اور ان کے احباب کے دباؤ نے اسے کسی بل میں گھسنے نہ دیا۔ ان ایام میں ڈاکٹر صاحب کے احباب نے اس قدر جانفشانی سے کام کیا کہ انھیں فضل حق کے پل پل کی خبر موصول ہوتی رہی۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ اس وقت کے وزیر داخلہ اعتزاز احسن اور پولیس کے آئی۔ جی فضل حق کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کرتے مگر ڈاکٹر صاحب انھیں قاتل کی ہر لحہ کی نقل وحرکت سے آگاہ کرتے۔

ایک مرحلہ پر جب فضل حق کا برادر نسبتی قتل کیس کا بڑا ملزم سینٹر ہاشم بھی پناہ کے لئے لاہور آیا تو ڈاکٹر صاحب نے اس کی نقل وحرکت پر کڑی نظر رکھی جب اسے لاہور کی زمین تنگ نظر آئی تو وہ خوف کے مارے آزاد کشمیر بھاگا جہاں سے وہ سعودی عرب نکل گیا۔ مگر اس دوران میں اس کی تمام خبریں ڈاکٹر صاحب کو موصول ہوتی رہیں۔

ان ایام میں قاتلوں کو انعام واکرام دینے والا کیپٹن ماجد گیلانی ملک سے فرار تھا مگر ڈاکٹر صاحب نے بیرون ملک اپنے احباب سے روابط استوار کر کے اس کے بارے میں معلومات لینے کی بھرپور کوشش کی اور یہ خبر ملک کے بڑے اخبارات میں بھی شائع ہوئی کہ تحریک جعفریہ کے کارکنان نے بیرون ملک بھی ماجد گیلانی کو تلاش کرنا شروع کر دیا ہے۔

جب پنجاب میں نواز شریف نے چند روایتی شیعہ رہنماؤں سے نوکریوں اور پلاٹوں کے

عوض فضل حق کی حمایت میں بیان دلوائے تو ڈاکٹر صاحب پہ یہ بات گراں گزری اور آپ نے اپنے احباب کو ہدایت کی کہ وہ ان حضرات پر اپنی تشویش کا اظہار کریں۔ جب ایک مرحلہ پر حکومت پنجاب نے دو شیعہ افراد سے پریس کانفرنس کرانا چاہی تو ذرائع سے ڈاکٹر صاحب کو علم ہو گیا کہ آج حکومت پنجاب کا محکمہ اطلاعات ونشریات سرکاری اخراجات پر دو عام افراد سے فضل حق کی حمایت میں پریس کانفرنس کروا رہا ہے تو ایسے میں آپ نے ایک گروپ تشکیل دیا جس نے ہوٹل میں پہنچ کر نقلی رہنماؤں کو گریباں سے پکڑا اور گھسیٹتے ہوئے سڑک پر لے آئے۔

حکومت کی مصلحت پسندانہ کارروائیوں کے پیش نظر جب ملتان میں شہید حسینیؒ کے فرزندان نے صدر غلام اسحاق خان کی گاڑی کو احتجاجاً روکا یا اسلام آباد کے مرکزی سیکرٹریٹ کو آئی۔ایس۔او کے نوجوانوں نے گھیرے میں لیا تو ملک بھر کے صحافیوں میں کھلبلی مچ گئی اور انھوں نے ان دو بڑے واقعات کو اخبارات کی پیشانی پر لگایا۔ جب ان اقدامات کے بعد ڈاکٹر صاحب سے بات ہوئی کہ برادران نے بڑے جرأت مندانہ اور شدید اقدامات کیے ہیں تو آپ نے دوٹوک الفاظ میں فرمایا ''شہید قائد کا خون ہماری گردنوں پر قرض ہے یہ ہماری ملی عزت اور غیرت کا مسئلہ ہے اور عزت کے مسئلہ پر کبھی مصلحت نہیں ہو سکتی۔''

۱۹۹۰ میں راولپنڈی کے رضویہ ہال میں شہید حسینیؒ سیمینار منعقد ہوا جہاں ڈاکٹر صاحب کے خطاب سے قبل مجھے دعوت خطاب دی گئی۔ میں نے حالات کے پیش نظر کچھ باتوں اور حقائق کو مفصل بیان نہ کیا۔ مجھے یہ خوف تھا کہ کہیں حقائق بیان کرنے سے یہ بات ڈاکٹر صاحب کو ناگوار نہ گزرے کہ عوامی اجتماع میں اس قسم کے اظہار کا فائدہ نہیں تھا۔ مگر جونہی ڈاکٹر صاحب سٹیج پر تشریف لائے انھوں نے میری بات کا حوالہ دے کر ماجد گیلانی اور ملکی حکمرانوں کی نقاب کشائی کی اور تمام حقائق کی کڑیاں ملا کر سابق حکمرانوں کے کردار کو عریاں کیا۔ سیمینار کے اختتام پر ہماری ملاقات ہوئی تو فرمانے لگے ''ان حقائق سے برملا پردہ اٹھایا کریں اور قاتلوں کی رسوائی کے لئے کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا کریں۔''

یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ قائد شہید کے قاتلوں کی گرفتاری کے لئے چلائی جانے

والی تحریک کے پیچھے ڈاکٹر صاحب کی حکمت عملی کارفرما تھی جسے قائد کے روحانی فرزندان نے عروج تک پہنچایا اور حکمرانوں کے ہاتھوں میں زنجیریں ڈلوائیں۔

۱۹۹۰ میں تحریک جعفریہ کے سیاسی سفر میں ایک نیا موڑ اس وقت آیا جب ۶ اگست کو صدر غلام اسحاق خان نے آئین کی آٹھویں ترمیم کے تحت بے نظیر بھٹو کی حکومت کو بدعنوانی کے الزام میں تحلیل کیا اور تین ماہ کے اندر عام انتخابات کرانے کا اعلان کر دیا۔ حالات کے پیش نظر اور ضرورتوں کے تحت پیپلز پارٹی کو تحریک جعفریہ کا سہارا لینا پڑا سیاسی اتحاد کے لئے ہونے والے مذاکرات کے روز اول سے پیپلز ڈیموکریٹک الائنس (پی۔ڈی۔اے) کے قیام تک ڈاکٹر صاحب پیش پیش رہے۔ مذاکرات میں شامل احباب کا کہنا ہے کہ بے نظیر بھٹو سے ہونے والے مذاکرات کے دوران، ڈاکٹر صاحب کے دلائل اس قدر وزنی اور گفتگو اس قدر جامع ہوتی تھی کہ پی۔پی۔پی کی سربراہ کو کئی بار اعتراف کرنا پڑا اور اسے یہ کہنے کی نوبت آئی کہ ڈاکٹر صاحب آپ ہمارے ساتھ کام کر لیں۔''

جب تحریک جعفریہ، پیپلز پارٹی، تحریک استقلال اور مسلم لیگ (قاسم گروپ) کے اتحاد سے پی۔ڈی۔اے کا وجود عمل میں آیا اور انتخابات کے لئے یہ بڑا اتحاد اسلامی جمہوری اتحاد کے مقابلہ میں میدان میں اترا تو عوامی اور سیاسی حلقوں کا موضوع بن گیا۔

ایک سفر کے دوران میری ڈاکٹر صاحب سے گفتگو یوں شروع ہوئی۔

☆ ڈاکٹر صاحب یہ اتحاد کن بنیادوں پر ہوا ہے۔۔۔؟

} ضرورت کی بنیادوں پر۔

☆ کس کی ضرورت زیادہ تھی؟

} پی پی اس بار مخالف الائنس کے مقابلہ میں الائنس کے پلیٹ فارم پر انتخاب لڑنے کی خواہاں ہے جبکہ ہم بھی کسی الائنس کے بغیر سیاست نہیں کر سکتے تھے۔

☆ ہماری روحانی قیادت نے عورت کے ساتھ اتحاد کیسے کر لیا ہے یہ عورت کی حکمرانی کو تسلیم کرنے والی بات نہیں ہے؟

} یہاں سیاست اسلام کے تحت نہیں۔آئین کے تحت ہوتی ہے۔یہاں کوئی دینی جماعت اسلام کے مطابق سیاست نہیں کرسکی۔۔۔ ہماری قیادت نے عورت کو اپنا سربراہ تسلیم نہیں کیا ملک کا آئین عورت کو حکمران بننے کی اجازت دیتا ہے۔

☆ کیا یہ اتحاد دیر تک قائم رہے گا؟

} مشکل ہے۔

☆ اس کی کیا وجوہات ہیں؟

} ہمارے لئے بے نظیر کے ساتھ اور اس کا ہمارے ساتھ چلنا مشکل ہے۔ہم امریکہ کے کٹر دشمن ہیں جبکہ وہ امریکہ کی مخالفت مول نہیں لے سکتی۔۔۔وہ آزاد خیال جماعت ہے جبکہ ہم اسلامی تقاضوں کے پابند ہیں۔ہماری مذہبی مخالف جماعتیں دوسرے اتحاد میں ہیں۔پی۔پی کبھی نہیں چاہے گی کہ ہماری حمایت میں مولویوں کی مخالفت مول لے۔۔۔پی۔پی کی قیادت تحریک کو مضبوط ہوتا برداشت نہیں کرے گی کیونکہ ہماری مضبوطی ووٹ کے حوالے سے اس کی کمزوری ہوگی۔

☆ پھر ہمیں اس اتحاد میں کیا فائدہ ہے؟

} ہم فرقہ کی سطح سے اٹھ کر سیاست کی وسیع سطح پر پہنچے ہیں اور ملک کے بڑے سیاسی اتحاد میں اپنا تشخص بطور سیاسی جماعت پیش کیا ہے۔

☆ تحریک کا سیاسی مستقبل کیا ہے؟

} دوسری مذہبی جماعتوں کی طرح سیاست میں ''ان''(IN) رہے گی۔

☆ تحریک ملکی سیاست پر کیا اثرات مرتب کرسکتی ہے؟

} اگر قدآور سیاسی شخصیات اس کے پلیٹ فارم پر آجائیں تو گہرے اثرات مرتب ہوسکتے ہیں وگرنہ ووٹ بنک کے حوالہ سے اس کی اہمیت قائم رہے گی۔

☆ کس قسم کی سیاست تحریک کے حق میں رہے گی؟

} تحریک کو فرقہ یا ہنگامی بنیادوں کی سیاست چھوڑنا ہوگی ایک طویل منصوبہ بندی کے تحت منزل تک پہنچنا ہوگا۔عوامی حلقوں میں رفاعی کام کرنے ہوں گے جماعت اسلامی کی طرح اپنی سطح

پر نظریاتی شخصیات تیار کرنا ہوں گی۔ حلقوں کی منصوبہ بندی کرنا ہوگی وغیرہ وغیرہ ''Umberalla Organization'' بننا ہوگا۔

اس معرکہ میں پی۔ڈی۔اے کے پلیٹ فارم پر ڈاکٹر صاحب نے گراں قدر خدمات سرانجام دیں انھوں نے تحریک استقلال کے سربراہ اصغر خان کے انتخابی حلقہ ۹۹ لاہور میں بھرپور ساتھ دیا انھیں کارکن مہیا کیے ان کی کنوینسنگ نہایت منظم انداز میں کی۔آپ کے تنظیمی انداز، تحرک اور صلاحیتوں کو دیکھ کر اصغر خان کو آپ کی شخصیت کا معترف ہونا پڑا۔ انھوں نے سرگودھا کے ایک جلسہ میں کہا کہ ''میں نے اپنی زندگی میں ڈاکٹر محمد علی نقوی جیسے باصلاحیت افراد بہت کم دیکھے ہیں'' انھوں نے لاہور میں کہا کہ اگر میری جماعت کے پاس ڈاکٹر صاحب جیسے دو چار افراد ہوتے تو میں ملکی سیاست پر گہرے نقوش مرتب کرتا۔

پی۔ڈی۔اے کا سفر شروع ہوا۔ انتخابات ہوئے مخالف اتحاد نے کامیابی حاصل کی۔۔۔ یہاں تک کہ ۱۹۹۲ میں نواز شریف کی حکومت معزول ہوئی۔۔۔نگران حکومت قائم ہوئی تو تحریک جعفریہ کو اقتدار میں حصہ ملا۔۔۔جب ۱۹۹۲ کے انتخابات ہوئے تو گرین سگنل ملنے پر پی۔پی۔پی نے پی۔ڈی۔اے کو خدا حافظ کہا اور یوں تحریک کا سیاسی سفر ایک بار پھر جمود کا شکار ہوگیا۔

۱۹۹۲ ایک ایسا سال تھا جس میں ڈاکٹر صاحب جیسے انتھک اور وقف انسان نے اپنی زندگی کو نئے ڈگر پر ڈالا۔تقریباً چھ سال بعد آپ نے پیشہ وارانہ ملازمت کرنے کی ٹھانی اور ملک کے معروف اسپتال ''شیخ زید اسپتال اینڈ فیڈرل پوسٹ گریجوایٹ انسٹی ٹیوٹ لاہور'' میں رجسٹرار کے عہدہ پر فائز ہوگئے۔

چونکہ یہ عرصہ ڈاکٹر صاحب کی خاموشی اور تنہائی کا زمانہ کہلاتا ہے اس لئے اسے بیان نہ کیے بغیر گزر جانا تاریخ سے بددیانتی اور حقائق سے چشم پوشی ہوگی۔

تاحال یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ سفیر انقلاب جیسا متحرک فعال اور تنظیمی کارکردگیوں کا محور شخص تحریک جعفریہ کے پلیٹ فارم سے دور کیوں ہوا۔۔۔ اس کی برق رفتاری میں یخ بستگی کیسے آئی۔۔۔اس نے خود کو تحریک کی ذمہ داریوں سے لاتعلق کیوں گردانا۔۔۔اور انھوں نے اپنی

ذات کو اسپتال کی نوکری اور اپنے کلینک تک محدود کرنے کی کوشش کیوں کی؟

بعض احباب کا خیال ہے کہ ڈاکٹر صاحب جیسے دیندار انسان کو تحریک جعفریہ کے پلیٹ فارم پر قومی مفادات سے زیادہ ذاتی مفادات کو مقدم جاننے والے چند افراد سے اختلاف تھا۔ بعض کی رائے ہے کہ تحریک کے بعض لوگ ان کی شخصیت سے حسد کرتے اور انھیں مخصوص مفادات کی راہ میں پتھر سمجھتے تھے لہٰذا ان کی گروپ بندی نے ڈاکٹر صاحب کو دل برداشتہ کیا۔ بعض کا کہنا ہے کہ وہ تحریک کے موجودہ ''سیٹ اپ'' (Set up) سے مطمئن نہ تھے۔ بعض سلجھے ہوئے افراد کا خیال ہے کہ وہ وقت کے تقاضوں کے پیش نظر ''تحریک جعفریہ'' کی محدودیت اور فرقہ کی بنیادوں پر سیاست کرنے کے حق میں نہ تھے اور بعض لوگوں کا گمان ہے کہ ان کو تحریک کی قیادت سے بعض معاملات پر اختلاف تھا۔

چونکہ ڈاکٹر صاحب سمندر مزاج انسان تھے ان کی گہرائی تک پہنچنا بے حد مشکل ہوتا تھا۔ وہ رازوں کو اپنے سینے میں امانت کے طور پر رکھتے، زیادہ سوچتے اور کم بولتے تھے، وہ ہر بات کو زبان تک نہ لاتے، انھیں ہمیشہ ذات سے قوم زیادہ عزیز رہی۔۔۔ انھوں نے اپنی خاموشی کی وجہ نہ بتائی تو خبیر سے کراچی تک سوالات اور شبہات ابھرے ہر شخص نے اپنی سوچ اور استطاعت کے مطابق سوچا مگر کسی کی سوچ کو مستند نہ سمجھا گیا۔

مجھ جیسے عقیدت رکھنے والے بے تکلف احباب نے آپ سے کبھی اس موضوع پر بات کرنا بھی چاہی تو آپ نے عموماً بات کا پہلو بدلا یا کبھی کسی شخصیت کا نام لے کر اختلاف کا جائزہ لینا چاہا تو انھوں نے سختی سے ڈانٹا۔ میں نے ان کی صحبت میں چھ سال گزارنے میں یہ بات حلفیہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ان کی زبان سے کسی کی ذات کے بارے میں منفی جملہ تک نہیں سنا۔ نہ انھوں نے کسی کی غیبت کی اور نہ کسی سے حسد کی راہ اپنائی۔۔۔۔

ایک مرتبہ ہم دو چار احباب آپ کے کلینک میں بیٹھے تھے کہ آپ کے نہایت معتمد ساتھی نے ایک شخص کا نام لے کر کہا کہ وہ آپ کے بارے میں یوں کہہ رہا تھا۔ میں ذاتی طور پر اس بات کا گواہ تھا مگر آپ نے فرمایا ''عزیز دوست آپ پر بھی مجھے جھوٹ بولنے کا گمان نہیں ہے مگر ان

احباب سے بھی یہ توقع نہیں ہے۔ کیونکہ ہمارا بلڈ گروپ (Blood Group) ایک ہے۔''

یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ تحریک میں ایک گروہ نے آپ کی مخالفت کی اور تحریک کی آئی۔ ایس۔ او اور پاسبان اسلام جیسی تنظیموں میں آپ کا اثر زائل کرنے کی ہر ممکنہ سازشیں کیں۔

یہ اختلاف کن بنیادوں پر تھا اس کا جواب دو چار جملوں میں دینا شاید مشکل ہے البتہ طرفین کے کردار اور خدمات کا نقشہ سامنے رکھ کر جواب آسانی سے تلاش کیا جا سکتا ہے۔

یہ بات کہنے میں مجھے کوئی باک نہیں کہ ڈاکٹر صاحب بعض افراد کے کردار سے بے حد رنجیدہ تھے آپ نہ صرف تحریک کے گلستان کے نگہبان تھے بلکہ آپ نے اس چمن کی آبیاری کر کے اسے پروان چڑھایا تھا لہٰذا باغبان کی حیثیت سے اس کا تقدس مجروح ہونا برداشت نہیں کرتے تھے۔ آپ کو بعض روحانی حضرات کے عدم خلوص کا شکوہ تھا مگر آپ نے کسی محفل میں برملا تنقید نہ کی البتہ ایک مرتبہ دوران سفر اس قسم کے کسی موضوع پر گفتگو ہوئی تو گاڑی میں بیٹھے ہوئے چند احباب مایوس کن باتیں کرنے لگے جبکہ ڈاکٹر صاحب بڑی خاموشی اور سکون سے ڈرائیونگ میں مصروف رہے۔ باتوں باتوں میں موقع کی مناسبت سے کسی دوست نے یہ شعر پڑھا کہ

دیار مصر میں دیکھا ہے ہم نے دولت کو
ستم ظریف پیغمبر خرید لیتی ہے

یہ شعر سن کر ڈاکٹر صاحب ایسے تڑپے جیسے ان کی تمام داستان بیان کر دی گئی ہو۔ آپ کی اس درد بھری تڑپ سے یہ تاثر ملا کہ آپ پیغمبرؐ کے چند پیغام برحضرات کے بارے میں خاصے ملول تھے۔

سفیر انقلاب نے جہاں تحریک جعفریہ کو مستحکم کرنے میں قیادت کے ہاتھ بٹائے وہاں ملت جعفریہ کی خدمات میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ عزاداری سید الشہداء کے دفاع، ملت کی بقاء اور فلاح کے لئے شب و روز کام کیا۔ بڑے بڑے سانحات میں سینہ سپر ہو کر حوادث کا مقابلہ کیا فرقہ واریت کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور دشمن کے عزائم کو خاک میں ملایا۔ آپ کی حکمت عملی نے دشمن کے مذموم ارادوں کے رخ موڑے۔ ملک اور اسلام دشمن قوتوں نے اسلامیان پاکستان کو غیر ملکی

امداد کے سہارے کچلنا چاہا تو آپ ان کے آگے چٹان بن گئے اور مذہبی دہشت گردوں نے ملک کا استحکام تباہ کرنے کی کوشش کی تو آپ سوہنی دھرتی پاکستان کے محافظ ٹھہرے۔

آپ کی قومی خدمات کو قرطاس کے دامن میں سمیٹ لینا ناممکن ہے آپ نے جب سے شعور سنبھالا آپ کا ہر قدم محمد وعلیؑ کی راہ میں اٹھا، آپ کے ہاتھ خدا کی بتائی ہوئی سمت میں بڑھے ،آپ بولے تو قوم کے حقوق کے لئے بولے آپ نے سوچا تو قوم کی فلاح کے لئے سوچا، آپ چلے تو قومی امور کی تکمیل کے لئے چلے، آپ بیٹھے تو قوم کی ترقی کا نقشہ بنایا۔ گویا آپ کی زندگی کا لمحہ لمحہ قوم کی خدمت میں گزرا۔

آپ نے طویل تنظیمی سفر کیا۔۔۔ پرکٹھن راستوں اور خاروں سے اٹی ہوئی راہوں سے گزرے۔۔۔ کئی بار موت کی وادیوں میں قدم رکھا۔۔۔ شکست وریخت کے کئی مراحل سے گزرے۔۔۔ نہ کہیں ٹوٹے نہ کہیں بکھرے۔۔۔ نہ کہیں متزلزل ہوئے اور نہ نفس کو مصلحتوں کا شکار ہونے دیا۔۔۔ قدم قدم پر قربانیاں دیں جینا اور مرنا قوم کی خاطر کر دیا۔ جب تک زندہ رہے کربلا کے زخمی مسافر کی طرح بے قرار رہے اور کہتے رہے ؎

ظالموں کے ظلم کا کچھ سامنا کرنا تو ہے
زندگی پیاری سہی لیکن ہمیں مرنا تو ہے

☆☆☆☆☆

فلاحی اموراورسفیرانقلاب

ایک ایسا شخص جس کی تمام شعوری زندگی ملت کی فلاح کے لئے صرف ہوئی ہو اس کے چند فلاحی امور کا تذکرہ کر کے اگر چہ اس کی ذات کے ساتھ انصاف نہیں کیا جا سکتا تاہم اس کی نظریاتی فوج کے سپاہیوں کے لئے نقوش کھینچے جا سکتے ہیں تا کہ وہ نقش پا کی سمت سے اپنی منزل کا تعین کر سکیں۔

یہ بات دعویٰ سے کہی جا سکتی ہے کہ سفیرانقلاب نے شعور کی دہلیز پر قدم رکھنے سے لے کر شہادت کی معراج تک اپنی زندگی کا ہر لمحہ فلاح کرنے اور فلاح پانے والوں میں گزارا۔

ملت جعفریہ پاکستان کی قابل فخر طلبا تنظیم ''امامیہ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن پاکستان'' کا قیام اور اس کا استحکام آپ کا پہلا فلاحی قدم تھا جس کے وجود سے نہ صرف ملت کے نوجوانوں نے فلاح پائی بلکہ انھوں نے معاشرہ کے اندر فلاحی پیغام عام کر کے ہزاروں افراد کو فلاح کے راستہ پر گامزن کیا۔

جب آپ طالب علمی کے دائروں سے باہر آئے اور قومی پلیٹ فارم پر قدم رکھا تو آپ نے قوم کی بہبود کے لئے سوچنا شروع کیا۔ آپ کی اس سوچ کی پہلی سمت، لندن میں ملی جب آپ علامہ سید صفدر حسین نجفی مرحوم کے ہمراہ ''ورلڈ اہلبیتؑ لیگ لندن'' کے اہم اجلاس میں شریک ہوئے۔ یہاں آپ کی ملاقات دنیا کے معروف سرمایہ دار جناب مصطفی گوکل کراچی سے ہوئی۔ انھوں نے پاکستان کی تشیع اور اس کی صورت حال کے بارے میں آپ سے سوالات کیے۔ آپ نے قومی صورت حال واضح کرنے کے ساتھ ساتھ آئی۔ ایس۔ او پاکستان کے قیام اور اغراض ومقاصد کے بارے میں بھی انھیں آگاہ فرمایا۔ انھوں نے آپ کی اس تنظیم کے قیام کو بے حد سراہا اور استفسار کیا کہ

"What plan you have got for The educational development for the "Shia youth" in Pakistan"?

چونکہ ڈاکٹر صاحب اسی قسم کا کوئی پلان مرتب نہیں کر چکے تھے لہٰذا انھیں لگی لپٹی کے بغیر بتایا کہ تا حال اس سطح پر کوئی کام شروع نہیں ہوا۔ انھوں نے فرمایا کہ ''آپ کی تنظیم پڑھے لکھے افراد پر مشتمل ہے لہٰذا آپ کو چاہیے کہ قوم کو دین کی طرف راغب کرنے کے لئے انھیں تعلیم کے

زیور سے آراستہ کریں تا کہ وہ آپ کے پیغام کو آسانی سے درک کرسکیں اور ملک میں ایک تعلیم یافتہ قوم کے حوالہ سے ان کی پہچان ہو۔''

جناب گوکل صاحب نے آپ کو سمت دینے کے ساتھ ساتھ اپنے تعاون کا مکمل یقین دلایا۔ انھوں نے علامہ سید صفدر حسین نجفی سے بھی اس بارے میں بات کی تو علامہ صاحب نے فرمایا کہ ''میں قوم کو دینی علم دینے کے لئے مدارس کے قیام کا آغاز کر چکا ہوں لہٰذا دنیاوی علم سے قوم کو بہرہ مند کرنے کے لئے ڈاکٹر صاحب سے زیادہ موزوں نوجوان اور کوئی نہیں ہوسکتا۔''

آپ وطن لوٹے تو آپ نے علامہ سید صفدر حسین نجفی کے تعاون سے ملت جعفریہ پاکستان کے مکمل کوائف (Bio data) حاصل کرنے اور پھر اس کی سطح پر کام کرنے کا منصوبہ تیار کیا۔ ۱۹۸۳ میں ''شیعہ قوم کی ترقی'' کے لئے فلاحی منصوبہ پر کام کا آغاز ہوا۔

طے پایا کہ پاکستان کے چاروں صوبوں اور شمالی علاقہ جات سمیت قوم کی آبادی کا تناسب، ان کی اقتصادی، تعلیمی، سیاسی اور نظریاتی صورتحال کا جائزہ لیا جائے گا اور پھر ہر علاقہ میں وہاں کے تقاضوں اور ضروریات کے پیش نظر منصوبہ بندی کی جائے گی۔

اس جامع پلان کو ترتیب دینے اور اس کا واضح ڈھانچہ تیار کرنے میں برادر سید امجد علی کاظمی، برادر سید ثاقب نقوی، برادر احمد رضا خان اور سفیرانقلاب نے گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ جب ان نوجوان مفکرین نے اپنا یہ کام (File Work) علامہ صاحب کو دکھایا تو وہ بے حد خوش ہوئے۔

منصوبہ کی منظوری کے بعد پنجاب سے اس کام کا آغاز ہوا صوبہ بھر سے ڈاکٹر صاحب نے معتمد اور پرخلوص افراد کا انتخاب کیا اور انھیں ان سے متعلقہ علاقہ جات تفویض کیے۔ ابتدائی سالوں میں اس پر حوصلہ افزا کام ہوا مگر ۱۹۸۴ میں علامہ سید عارف حسین الحسینی کی قیادت کے بعد ملی اموراور ملکی صورتحال نے پہلو بدلا تو ترجیحات بھی بدل گئیں۔ اگرچہ اس پلان کی تکمیل نہ ہوسکی تاہم ملک کی شیعہ آبادی کے جمع شدہ گوشواروں سے قیادت نے خوب فائدہ اٹھایا۔ انھیں قومی آبادی اور ان کی صورت حال کا اندازہ لگانے میں دقت پیش نہ آئی اور اسی طرح علامہ سید

صفدر حسین نجفی کو بھی دینی مدارس کے قیام میں خاصی مدد ملی۔

شیعہ قوم کی فلاح کا یہ منصوبہ اسماعیلی فرقہ کے پیشوا ''پرنس آغا خان'' کے فلاحی منصوبوں کی طرز کا تھا اور شیعہ عمائدین اپنی ملت کے لئے اسکولز، اسپتالز، فنی ادارے اور دینی مدارس قائم کرنا چاہتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کو عمر بھر اس بڑے منصوبہ کی عدم تکمیل کا ارمان رہا ایک مرتبہ جب آپ سے پوچھا گیا کہ آخر اتنا خوبصورت منصوبہ کیوں تشنہ رہ گیا تو آپ نے فرمایا ''ضیا الحق کی حکومت، امریکہ کی ملک میں مداخلت اور قومی ذمہ داریوں نے ہمارا رخ موڑ دیا تھا اگر حالات پرسکون رہتے تو ہم اطمینان سے اس پلان کو منزل تک پہنچاتے۔ مزید فرمایا کہ ہمارے پاس وہ منصوبہ اور ڈھانچہ اب بھی موجود ہے ان شاءاللہ ہم مناسب حالات میں اس پر کام کریں گے۔''

ان ایام میں علامہ سید صفدر حسین نجفی ملک بھر میں دینی مدارس کا جال بچھانے کے لئے عازم سفر ہوئے تو ڈاکٹر صاحب ان کے ہمسفر رہے۔ شاید ہی ملک کا کوئی دینی مدرسہ ایسا ہو جو علامہ سید صفدر حسین نجفی کی محنتوں سے وجود میں آیا ہو اور سفیرانقلاب کا اس کی بنیادوں میں حصہ شامل نہ ہو۔

۸۸۔۱۹۸۷ میں جب تحریک جعفریہ کا شباب تھا ڈاکٹر صاحب نے محسوس کیا کہ قومی مشکلات میں اضافہ کا باعث ملک کی ''بیوروکریسی'' ہے۔ ایک گاؤں کے مقدمات سے لے کر ملکی معاملات تک بیوروکریٹس کی گرفت مضبوط ہے۔ چنانچہ آپ کا یہ احساس ضرورت بن کر تڑپا کہ اس ملک میں انتظامی حوالہ سے مضبوط ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اپنے باصلاحیت اور لائق نوجوانوں کو اس طرف راغب کیا جائے۔ تا کہ تحصیل، ضلع، ڈویژن، صوبہ اور مرکز تک کے انتظامی اور عدالتی معاملات احسن طریقے سے حل ہوسکیں۔

اس کے ساتھ ہی آپ نے بیرون ملک اعلیٰ تعلیم کے حصول کے خواہشمند طلبا کے لئے وظائف مقرر فرمائے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے والوں کی ہر ممکنہ مدد کی۔ اس پروجیکٹ کے تحت آپ نے بیسیوں طلبا غیر ممالک بھجوائے جو آج بھی زیر تعلیم ہے اور کچھ ملک میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

ایک مرحلہ پر آپ نے محسوس کیا کہ قوم کا تعلیمی معیار حوصلہ افزا نہیں ہے کیونکہ مقابلے کے امتحانات اور غیر ممالک میں تعلیم حاصل کرنے کے امیدوار بہت کم منظر عام پر آئے تھے۔ آپ اس نتیجہ پر پہنچے کہ قوم کے بچوں کی بنیادی تعلیمی سطح کمزور ہے۔ چنانچہ آپ نے اساس مستحکم کرنے کے لئے ''اسلامک ایجوکیشن کونسل'' کا قیام عمل میں لایا اور اس کے تحت ''المصطفیٰ ماڈل اسکولز'' کا اجرا فرمایا۔

اسکولز کے قیام کے وقت آپ کا بنیادی نظریہ تھا کہ اپنا پیغام پہنچانے کے لئے ضروری ہے کہ قوم تعلیم یافتہ ہوتا کہ وہ عہد حاضر کے تقاضوں کا صحیح ادراک کر سکے۔ آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اپنی ملت کی فلاح کے لئے ''آغا خان یا مرزائی'' جو کام کر رہے ہیں ہم ان کا عشر عشیر بھی نہیں کر پائے۔ آج آغا خان کی قوم شمالی علاقہ جات میں خوشحال ہے کراچی میں ان کا بین الاقوامی معیار کا اسپتال اور میڈیکل کالج ہے اس طرح جہاں جہاں ان کی آبادی ہے وہاں تجارتی مراکز قائم ہیں۔ مرزائیوں کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ وہ اپنی قوم کی تعلیم کے لئے اپنا بجٹ تیار کرتے ہیں جس کے استعمال کے بعد وہ خاطر خواہ نتائج حاصل کرتے ہیں جبکہ آج تک ہماری قوم کا رخ اس جانب کوئی نہیں موڑ سکا۔

محرم ۱۹۹۰ میں راقم نے ''ماہنامہ العارف'' میں گستاخ صفحہ کے عنوان سے ایک کالم لکھا جس میں قوم کے اذہان پر دستک دی کہ ''وہ عزاداری سید الشہدا پر جس قدر سالانہ بھاری بھر کم سرمایہ خرچ کرتے ہیں اور پیشہ ور ذاکرین جس بے دردی سے قومی سرمایہ لوٹتے ہیں اگر ملت جعفریہ کے یہ دونوں گروہ (بانیان وذاکرین) یہ سوچ لیں کہ قیام پاکستان کے بعد سے تا حال ان کے پاس نہ کوئی اسپتال ہے نہ کالج و یونیورسٹی ۔۔۔۔ نہ کوئی فنی ادارہ ہے اور نہ کوئی فلاحی ٹرسٹ ۔۔۔ وہ عزاداری کو جاری رکھیں اس لئے کہ اس میں ہماری بقاء ہے مگر وہ نمود ونمائش کے لئے نہیں بلکہ ثواب کے لئے مجالس منعقد کرائیں۔

دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ اگر صرف پانچ سال کے لئے قوم کے بانیان مجالس لاکھوں کے بجائے ہزاروں خرچ کریں اور ذاکرین عظام ہزاروں کی بجائے چند سینکڑوں پر گزارا کر لیں تو

ملت جعفریہ پاکستان کے پاس ملک میں وہ سب کچھ ہوگا جو دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کے پاس ہوتا ہے۔ ''جب قومیں مضبوط ہو جاتی ہیں تو پھر ملک کی حکومتیں ان کی محتاج رہتی ہیں۔''

ڈاکٹر صاحب نے جب یہ صفحہ پڑھا تو ایک ملاقات کے دوران میں داد دی اور فرمایا'' عزیز دوست یہ وہ فکر ہے جس کے لئے ہمارا دل خون رو رہا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ عزاداری کا سلسلہ اس سے بھی زیادہ مستحکم ہو مگر انداز میں تبدیلی ہونی چاہیے۔ کہنے لگے کہ آج کل معروف ذاکرین اور روایتی علامہ حضرات کے نرخ مقرر ہیں دس سے پندرہ ہزار تک مومنین ایک مجلس کا انھیں معاوضہ دیتے ہیں اور پھر تشہیر کے لئے اتنا ہی اشتہارات واخبارات میں خرچ کرتے ہیں۔ گویا ایک بڑے خطیب پر تقریباً چالیس پچاس ہزار روپیہ خرچ ہو جاتا ہے۔ اگر ہمارا عزادار بھائی ثواب حاصل کرنے کی نیت سے مجلس منعقد کرائے اور اپنے علاقہ کے اہل علم، صاحب تقویٰ عالم دین کو مدعو کرے تو شرکاء کو بھی بہت کچھ حاصل ہو جائے گا اور ہزار دو ہزار میں مجلس کے انتظامات بھی مکمل ہو جائیں۔

اسی طرح اگر ہماری قوم کی فکر بیدار ہو جائے تو ہم تعلیمی اداروں اور اسپتالوں کا جال بچھا دیں گے۔ جہاں سے قوم کے بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ملک کے اہم عہدوں پر فائز ہوں گے اور صحت کے حوالے سے بھی قوم امراض سے محفوظ رہے گی۔''

یکم جنوری ۱۹۹۳ کی شب ڈاکٹر صاحب نے ایک محفل میں فرمایا کہ ہماری قوم کو یہ اندازہ نہیں ہے کہ ملک میں ان کی آبادی کا تناسب کیا ہے اور پھر ہر سال ہماری قوم کے کتنے بچے، جوان، بوڑھے، امراض کا شکار ہو کر موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔ انھوں نے مزید فرمایا کہ میرے پاس شمالی علاقہ جات کی شیعہ آبادی کا نقشہ موجود ہے۔ میں نے وہاں یہ اخذ کیا ہے کہ ہر سال سینکڑوں افراد لقمہ اجل بن جاتے ہیں، کچھ معذور اور اپاہج ہو جاتے ہیں۔ اگر ہم لوگ اپنی قوم کے بچوں کے لئے حفاظتی ٹیکوں کا اہتمام کریں، اپنی آبادیوں میں فری اسپتالوں کا آغاز کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنی آبادی میں اضافہ کا باعث نہ بن سکیں اور ملک میں اکثریتی آبادی کے ہم پلہ نہ ہوں۔''

آپ جس گہرائی سے قوم کے بارے میں سوچتے تھے وہاں تک سوچنا بھی ہمارے حدوں سے باہر ہے۔آپ نے فرمایا میں جہاں تک کرسکتا ہوں اور جہاں تک میرے وسائل اور میرے مربین میرا ساتھ دیتے ہیں میں کرتا ہوں اور جب تک زندگی نے وفا کی آخری سانس تک قوم کی خدمت کرتا رہوں گا۔

آپ نے قوم کے تعلیمی معیار کو بلند کرنے کے لئے لاہور ،ملتان، بھوانہ جھنگ، اٹک، ماڑی انڈس میانوالی اور شمالی علاقہ جات میں اسکولز کھولے جو اس وقت تمام مسلمان بچوں بالخصوص ملت جعفریہ کے نونہالوں کو اعلیٰ تعلیم وتربیت فراہم کررہے ہیں۔آپ نے بتایا کہ شمالی علاقہ جات میں ہمارے ایک اسکول کا ''آسٹریلیا'' کے سیاحوں نے دورہ کیا تو وہ پاکستان کے ایک گاؤں میں اتنا معیاری اسکول دیکھ کر حیران رہ گئے اور انھوں نے اپنے ملک کی ایک ''فلاحی آرگنائزیشن'' کے ذریعہ اس سکول کو پانچ لاکھ روپے کا عطیہ دیا۔

شمالی علاقہ جات میں جہاں خواتین کی فلاح کے لئے حکومت کی جانب سے بھی اقدامات صفر ہیں وہاں ڈاکٹر صاحب نے لڑکیوں کے لئے اسکولز کھولے اور دستکاری سنٹر قائم کیے۔آپ نے وہاں کے عوام کے لئے ایک ٹیکنیکل کالج کے قیام کا فیصلہ کیا تھا اور اس کے لئے وسائل بھی اکٹھے کرلئے تھے مگر افسوس کہ آپ کی زندگی نے آپ کا ساتھ چھوڑ دیا اور یہ منصوبہ تشنہ رہ گیا۔

زندگی کے آخری سال میں آپ نے شمالی علاقہ جات کی تعلیم وترقی پر خصوصی توجہ دی۔ ایک روز میں آپ کو شیخ زید اسپتال ملنے گیا تو آپ اس وقت کوئی منصوبہ سوچ رہے تھے۔آپ کے ہاتھ میں پنسل اور میز پر سفید کاغذ پڑا ہوا تھا جس پر آپ لکیریں کھینچ رہے تھے۔میرے استفسار پر آپ نے پرمسرت چہرے سے فرمایا کہ ''آج بہت اچھا منصوبہ ذہن میں آیا ہے'' وہ بلتستان کی تعلیمی صورت حال کو بہتر بنانے کے لئے ہے۔آپ نے تفصیل سے بتایا کہ "Baltistan Education Support Trust" کا منصوبہ ذہن کے کینوس پر ابھرا ہے جسے ہم (BEST) کا نام دے سکتے ہیں۔

۱۹۹۴ میں تحریک جعفریہ نے شمالی علاقہ جات میں حکمران جماعت کو جس انداز میں

شکست دی اور وہاں کی بڑی جماعت کے حوالے سے تاریخی کامیابی کے پرچم گاڑے اس میں بلاشبہ وہاں کے علما اور قیادت سے عقیدت کا تعلق ہے تاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وہاں ڈاکٹر صاحب جیسے محسن ملت شخص نے گذشتہ پانچ سات سالوں سے فلاحی کام کیے ہوئے تھے جنھوں نے وہاں کے عوام کے دل جیتے اور یہ کامیابی آپ کی محنت کا ثمر ٹھہری۔

شمالی علاقہ جات میں ڈاکٹر صاحب نے درجنوں فلاحی پروجیکٹ شروع کیے جس کی چنداں وجوہات تھیں۔ایک یہ کہ وہاں نوے فیصد آبادی اہل تشیع ہے۔دوم وہاں ضیاالحق نے اپنے دور حکومت میں تعصب کی بنا پر اس کثیر آبادی کو نظرانداز کیا جبکہ اس کے برعکس وہاں کی دوسری آبادیوں کو سہولیات دے کر انھیں انتظامی امور تھمانے کی کوشش کی۔ضیا دور میں یہاں تک بھی ہوا کہ پاکستان کے تعلیمی اداروں میں شمالی علاقہ جات کے طلبا کے لئے مخصوص نشستوں پر غیر اہل تشیع کو کھپانے کی سازشیں کی گئیں اور ملازمت میں بھی انھیں ترجیح دینے پر اکتفا کیا گیا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی قیادت اور دیگر صاحب ثروت قومی افراد کے تعاون سے وہاں پر حکومت کے ہم پلہ کام کرنے کی کوشش کی۔برادر وجاہت حسین جعفری جوان کاموں میں آپ کے ہم رکاب رہے نے بہت پیارا جملہ کہا کہ ''وہ کام جو کسی ملک کی حکومت کرتی ہے ڈاکٹر صاحب جیسے ایک شخص نے سرانجام دیے۔''

قوم کے بچے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں، وہ ملک کے کلیدی عہدوں پر متمکن ہوں، ان کے ہاتھ میں ملک کے انتظامی امور کی ڈور ہو، وہ ملک کی ترقی اور اس کی سرحدوں کے مخلص محافظ ہوں اور ان پر قوم وملک نازاں ہو یہ آپ کی سوچ کا عکس ہے جس کے لئے آپ مسلسل متحرک رہے۔

آپ کا نظریہ تھا کہ قوم کے وہ بچے جو دیہاتوں سے تعلق رکھتے ہیں وہ تعلیمی سمت سے ناآشنا ہوتے ہیں۔وہ اپنا ہدف مقرر کیے بغیر، یا اپنی منزل کا تعین کیے بغیر محنت کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ بے سمت ہونے کے سبب اپنی منزل تک نہیں پہنچ پاتے۔اس حقیقت کو عملی جامہ پہنانے کے لئے آپ آئی۔ایس۔او پاکستان کے سالانہ کنونشن کے موقع پر ملک بھر سے آئے ہوئے طلبا کو ''مستقبل کی راہیں'' (FUTURE PLANNING) کے عنوان سے نہایت پرمغز

اورمعلوماتی لیکچر دیا کرتے تھے۔

اس لیکچر میں آپ کے سامنے ایک نقشہ ہوتا تھا اور آپ اس نقشہ کی مدد سے طلبا پر واضح کرتے کہ پاکستان کا تعلیمی ڈھانچہ کیا ہے۔۔۔؟ میٹرک کرنے کے بعد تعلیم کی کتنی راہیں نکلتی ہیں اوراس طرح ایف۔اے، ایف۔ایس۔سی، بی۔اے، بی۔ایس۔سی ،ایم۔اے، ایم۔ایس۔سی یا کوئی ٹیکنیکل یا پروفیشنل تعلیم حاصل کے بعد ایک طالب علم کو کیا کرنا چاہیے؟

آپ نے اپنی اس عظیم ذمہ داری کو صرف ایک سالانہ (لیکچر) تک محدود نہ رکھا بلکہ قوم کے بچوں کی رہنمائی کے لئے ''امامیہ گائیڈنس بیورو'' (Imamia Guidance Bureau) کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جو ملک بھر کے قومی بچوں کے لئے ان کی تعلیمی راہیں تشخیص کرنے میں مصروف عمل ہے۔

سفیرانقلاب نے ملت کے مستحق مگر لائق طلبا کے لئے وظائف کا سلسلہ شروع کیا جس کے تحت قوم کے ہزاروں بچے اعلیٰ تعلیم کے زیور سے آراستہ ہوئے اور آج تک یہ سلسلہ جاری ہے، اگر وظائف کا ریکارڈ دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ملت کے وہ بچے جن کا خدا کی ذات کے علاوہ کوئی سہارا نہ تھا اور وہ مالی زبوں حالی کے باعث ایک قدم آگے بڑھنے کی استطاعت بھی نہ رکھتے تھے ڈاکٹر صاحب کے تعاون سے انھوں نے ملک کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور خوشحال خاندانوں میں شامل ہوئے۔

ایک مرتبہ ایک مفلوک الحال خاندان کا بچہ ایف۔ایس۔سی میں اعلیٰ نمبروں سے پاس ہوا اور وہ میڈیکل کالج کے داخلہ کے معیار پر پورا اترا مگر اس کے والدین مجبور تھے کہ اسے جلدی اسکول ٹیچر بنائیں تاکہ گھر کی ہنڈیا چڑھتی رہے اور دیا بھی جلتا رہے، مگر ڈاکٹر صاحب نے اس بچے کے والدین سے نہ صرف بچے کے اخراجات برداشت کرنے کا وعدہ فرمایا بلکہ بچے کی تعلیم مکمل ہونے تک انھیں بھی مالی تعاون کا یقین دلایا۔

یہ بات وثوق سے کی جاسکتی ہے کہ اس وقت بھی ملت کے بیسیوں بچے ایسے ہیں جنھیں آج تک معلوم نہیں ہوسکا کہ ان کی امداد کے پیچھے کس ''خضر'' کا ہاتھ تھا۔

۱۹۸۹ کی بات ہے کہ سید اعجاز علی شاہ جو اس وقت ''جعفریہ ویلفیئر فنڈ'' کے مرکزی مسئول ہیں سے میری ملاقات ہوئی۔اسی وقت سید صاحب جعفریہ ویلفیئر فنڈ کا نظریہ لئے عوام کو قائل کررہے تھے۔تحریک کے دفتر میں ہونے والی اس ملاقات کے دوران میں نے ان سے سوالات کیے۔ایک مرحلہ پر میں نے ان سے پوچھا کہ شاہ صاحب کیا یہ ممکن ہے کہ قوم کے خمس کی رقم سے آپ سارے منصوبے چلالیں گے، میرا یہ سوال سن کر شاہ صاحب نے میز پر اپنی ہتھیلی ماری اور دعویٰ کرتے ہوئے کہا ''اگر ڈاکٹر محمد علی نقوی میرا ساتھ دے دیں تو میں اگلے پانچ سالوں میں قائد ملت جعفریہ کو اتنا فنڈ مہیا کروں گا کہ نہ کوئی مومن بھوکا سوئے گا اور نہ کسی مومن کی بچی ہاتھ پیلے کرنے کے لئے پیسوں کی محتاج رہے گی۔''

آخر وہی ہوا کہ جب ڈاکٹر صاحب نے ساتھ دینے کی حامی بھری تو قیادت نے ادارہ قائم کرنے کی اجازت دے دی اور آج ''جعفریہ ویلفیئر فنڈ'' قومی خدمت کا بے مثالی ادارہ بن چکا ہے۔جس کی حالیہ رپورٹ کے مطابق اس ادارہ نے گذشتہ تین ماہ اپریل، مئی جون ۹۵ کے عرصہ میں خطیر رقم قومی فلاح پر خرچ کی ہے۔

سید اعجاز علی شاہ صاحب کی خواہش تھی کہ ڈاکٹر صاحب ان کے ہمراہ ملک گیر دورہ کریں اور قوم کو خمس کی ادائیگی کے لئے مائل کریں۔ڈاکٹر صاحب اپنی بے پناہ مصروفیت کے باعث شاہ صاحب کی خواہش کے احترام سے قاصر رہے تاہم انھوں نے مارچ کے اواخر میں دورہ جات کی حامی بھر لی تھی۔

۲۴ فروری ۱۹۹۵ جمعۃ الوداع کے روز یوم القدس کے جلوس اور جلسہ میں مال روڈ لاہور پر میری سید اعجاز علی شاہ صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے سڑک کے دوسرے پار کھڑے ،ڈاکٹر صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مخصوص انداز میں فرمایا ''بچیا! ڈاکٹر صاحب نے دورے کرنے کا وعدہ فرمایا ہے ان شاء اللہ تم اگلے سال ''جعفریہ ویلفیئر فنڈ'' کی ترقی دیکھنا۔''

اس موقع پر شاہ صاحب نے عادتاً مخصوص شعر بھی پڑھا۔

تجسیم رسالت میں بس دو ہی تو چیزیں ہیں

سرمایہ خدیجہؑ کا اور خون ابو طالبؑ

ڈاکٹر صاحب نے اس سلسلہ میں لاہور کے ایک صاحب ثروت مومن سے ملاقات کی اور انھیں ''جعفریہ ویلفیئر فنڈ'' کی افادیت اور اہمیت سے آگاہ کیا۔ جب انھوں نے ڈاکٹر صاحب کے منصوبہ سے آگاہی حاصل کی تو انھوں نے فرمایا ''چونکہ میں نے اپنی دو صاحبزادیوں کی شادی پر چھیالیس لاکھ روپے خرچ کیے ہیں لہٰذا میں قوم کی بیٹیوں کی شادی کے لئے اتنی ہی رقم پیش کروں گا۔''

اس عظیم شخصیت کو ڈاکٹر صاحب کی ذات پر اس قدر اعتماد تھا کہ انھوں نے اپنے ذاتی امور تک آپ کے حوالے کر دیئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب قوم کی فلاح کے لئے جو منصوبہ بھی تیار کرتے وہ شخصیت مالی حوالے سے آپ کا بھرپور تعاون کرتی یہاں تک کہ انھوں نے قومی فلاح کے لئے ڈاکٹر صاحب کو چار لاکھ روپے ماہانہ دینے کا سلسلہ شروع کیا جس کے سہارے سفیر انقلاب نے قومی فلاح میں انقلاب برپا کر دیا۔

غیر ملک میں مقیم لاہور کی ایک اہم شخصیت نے آپ کو ایک کروڑ روپے سالانہ دینے کا وعدہ کیا اور انھوں نے یہ شرط عائد کی کہ آپ اپنی ملازمت ترک کر کے بقیہ تمام عمر قوم کے فلاحی امور میں صرف کریں۔ آپ نے ان سے آخری میٹنگ میں طے کیا کہ آپ اسپتال کی نوکری سے استفادے دیں گے۔ آپ نے اپنا استعفا پیش کیا تو اسپتال کے چیئرمین نے منظور نہ کیا۔ تاہم آپ نے اپنے معتمد احباب کے تعاون سے درج ذیل چار اہم امور کا آغاز کیا۔

۱۔ تعلیم۔ ۲۔ صحت۔ ۳۔ روابط ۴۔ سماجی خدمت

تعلیم کے بارے میں آپ کا نظریہ تھا کہ تعلیم سب کے لئے ہو اسے بہتر مگر بامقصد ہونا چاہیے۔ اس لئے آپ کے قائم کردہ تمام اسکولوں میں نصاب کے علاوہ قرآن مجید اور دینی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بچہ میٹرک کا امتحان دے کر معاشرے میں آتا ہے تو وہ شرعی مسائل سے بھی آگاہ ہوتا ہے۔

صحت کے بارے میں آپ کی رائے تھی کہ علاج سے زیادہ حفظ ماتقدم کو بہتر بنایا جائے تاکہ انسان کو بیماری بستر تک ہی نہ لائے۔ نہ اس کا پیسہ خرچ ہو اور نہ وقت۔۔۔ اس سلسلہ میں

آپ دیہاتوں میں طبی سنٹرز کے قیام کے خواہاں تھے۔

روابط کے شعبہ کے ذریعہ آپ ملک بھر کی شیعہ اعلیٰ شخصیات جو ملک کے انتظامی، عدالتی، تعلیمی، دفاعی اور سیاسی شعبوں سے منسلک تھیں سے مستحکم روابط کے خواہاں تھے۔ آپ کی خواہش تھی کہ ملکی نظام پر کسی نہ کسی طور گرفت رکھنے والے حضرات سے تعلقات کی زنجیریں مضبوط ہوں تاکہ وطن عزیز میں ہونے والے حالات سے مکمل آگاہی رہے اور اس کی بابت میں اپنا لائحہ عمل ترتیت دیا جا سکے۔

سماجی امور کے شعبہ کے ذمہ آپ نے یہ ذمہ داری تفویض کی کہ وہ ملک بھر میں سماجی امور پر کام کرنے والے بڑے بڑے اداروں کا دورہ کریں ان کے طریقہ کار کو سمجھیں ہر شعبہ کی اچھی اچھی کارکردگیوں کو مجتمع کریں اور ان کی روشنی میں بھرپور طریقے سے قومی و سماجی امور کو انجام دیں۔ اس سلسلہ میں آپ نے اس شعبہ کے مسئولین کو تاکید فرمائی کہ وہ نئے اداروں کے قیام سے قبل قوم کے ان اداروں کو تقویت پہنچائیں جو پہلے سے اس شعبہ میں مصروف کار ہیں۔ چنانچہ آپ نے ملک کے کئی ایک قومی اداروں کو لاکھوں روپے دیے اور ان شعبوں کو فعال بنایا۔

آپ نے اسی شعبہ کے تحت ''امداد فاؤنڈیشن'' کا قیام عمل میں لایا جو تاحال طلباء کو وظائف بیوگان، مستحقین کی مدد اور یتیم و نادار لڑکیوں کی شادی بیاہ کے اخراجات میں تعاون کر رہا ہے۔

تمام فلاحی منصوبوں میں سفیر انقلاب کا ترجیحی منصوبہ تعلیم تھا اور اس کی مسئولیت بھی آپ کے ذمہ تھی۔ ایک روز آپ نے فرمایا کہ میری دلی خواہش ہے کہ ہماری مجالس میں جب کوئی خطیب منبر پر آئے تو وہ اپنے خطبہ کے بعد یہ کہے کہ ''مومنو! تعلیم بہت ضروری ہے'' آپ کا نظریہ تھا کہ تعلیم دینی ہو یا دنیاوی ہر حال میں ملت جعفریہ ایک باعلم قوم ہو۔ آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ''باب العلم کے ماننے والوں کا تشخص بھی علم ہونا چاہیے۔'' یہی وجہ تھی کہ آپ نے دنیاوی تعلیم کے لئے اسکولز، اکیڈمیاں اور انسٹی ٹیوٹ کھولے جبکہ دینی تعلیم کے لئے علامہ سید صفدر حسین نجفی مرحوم کا بھرپور ساتھ دیا اور ان کی رحلت کے بعد ان کے قائم کردہ کئی ایک دینی مدارس کی ممکنہ

حدتک مدد کرتے رہے مگر کبھی اپنا نام استعمال نہ کیا بلکہ خطوط یا امدادی چیک پر ''امداد فاؤنڈیشن'' کے ایک ملازم کا نام لکھا کرتے تھے۔

ایک دفعہ آپ احباب کے ساتھ کراچی جارہے تھے روہڑی اسٹیشن پر پہنچے تو خیال آیا کہ مولانا صفدر حسین صاحب نے یہاں دینی مدرسہ کا افتتاح کیا تھا چنانچہ آپ روہڑی اسٹیشن پر اترے اور مدرسہ دیکھنے چلے گئے۔ آپ نے مدرسہ کا جائزہ لیا اور پھر دوسری ٹرین کے ذریعہ کراچی پہنچے۔ کراچی کے اجلاس سے فارغ ہوئے تو بلوچستان کے کسی بیابان علاقہ میں قائم ہونے والے مدرسہ کی رپورٹ لینے چلے گئے۔

آپ واپس لوٹے تو فرمایا کہ اگر وہاں مدرسہ قائم ہوگیا تو دس سے بیس طلبا داخل ہوں گے۔ آپ کی یہ بات سن کر کسی دوست نے کہا دس بیس طلبا کے علاقہ میں لاکھوں روپیہ خرچ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ نے جواباً کہا۔

''عزیز دوست! اندھیرے میں جگنو کی روشنی کی بھی اہمیت ہوتی ہے۔ ایسا علاقہ جہاں لوگ اپنے شرعی مسائل سے بھی نابلد ہیں وہاں مدرسہ کا قیام ایک الٰہی شمع کے مترادف ہے۔''

آپ کی دلی خواہش تھی کہ ملت جعفریہ کی ایک ایسی یونیورسٹی ہونی چاہیے جس میں بچوں کو دینی اور دنیاوی تعلیم میسر ہو۔ اس سلسلہ میں جب آپ نے پروفیسر طاہرالقادری کے ادارہ ''منہاج القرآن'' لاہور کا دورہ کیا تو آپ نے اس پروجیکٹ کو سراہتے ہوئے فرمایا کہ ہمارے علمائے کرام کو بھی اس قسم کے اداروں کا اجراء کرنا چاہیے تاکہ کالجز، یونیورسٹیز اور دینی مدارس کے طلبا کے درمیان آج تک جو فاصلے قائم ہیں وہ دور ہوں۔

فلاحی اداروں کا قیام اور ان کا استحکام آپ کی دلی خواہش تھی اس سلسلہ میں آپ نے نہ صرف ادارے تشکیل دیے بلکہ کئی ایک کمزور اداروں کو مستحکم کیا۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ انسان کو یا تو خود کام کرنا چاہیے یا کام کرنے والوں کا ہم کار ہونا چاہیے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ فلاحی کام کرنے والے حضرات کی بے حد حوصلہ افزائی فرماتے۔

آپ کی عادت تھی کہ جو بڑا کام کرنے لگتے اس کے آغاز سے قبل گردوپیش، ماضی وحال پر

خوب غور کرتے۔ آپ نے فلاحی میدان میں قدم رکھا تو اندرون اور بیرون ملک تمام فلاحی اداروں سے روابط استوار کیے۔ آپ نے بیت المال پنجاب اور اسلام آباد میں سے این۔جی۔اوز (Non Goverment Organization) کے پتہ جات لئے اور دنیا بھر میں ان سے رابطہ کرکے ان پر واضح کیا کہ ''امداد فاؤنڈیشن'' پاکستان کا ایک فلاحی ادارہ ہے جو دیگر فلاحی اداروں کا تعاون کرنے کی خواہش رکھتا ہے۔ آپ کے خط کے جواب میں بیسیوں این۔جی۔اوز نے آپ کے جذبات کو سراہا اور آپ سے مربوط رہے۔

سفیرانقلاب اسماعیلی فرقہ کے پیشوا آغا خان کے فلاحی پروگرام ''آغا خان رورل سپورٹ پروگرام'' (Agha Khan Rural Support Progran) سے بے حد متاثر تھے۔ آپ نے اس پروگرام پر مرتب ایک ویڈیو فلم ''First Harvest'' دیکھی تو بے ساختہ تڑپ اٹھے اور کئی مقامات پر اس کا تذکرہ کیا کہ ایک چھوٹا سا فرقہ کس قدر تیزی سے اپنے افراد کی فلاح کے لئے کوشاں ہے۔

اس فلاحی پروگرام کے طریقہ کار کو جانچنے کے لئے آپ نے پنجاب یونیورسٹی لاہور کے فارغ التحصیل ایک نوجوان کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ آغا خان کے پروجیکٹ میں رضا کارانہ کام کرکے اس کا انداز (Way of Work) اور ان کے روابط کا جائزہ لے، اس طرح کئی ایک ایسے فلاحی ادارے تھے جن میں نوجوان رضا کارانہ طور پر کام کرکے ان کی گہرائی کا جائزہ لیتے اور ان کی خصوصیات اور کامیابی کے رازوں کو ڈاکٹر صاحب تک پہنچاتے جن کی روشنی میں آپ اپنی قوم کی فلاح کے لئے منصوبہ سازی کرتے۔

شمالی علاقہ جات میں جہاں شیعہ آبادی زیادہ ہے وہاں پر غربت بھی نسبتاً زیادہ ہے۔ آپ جہاں ان کی فلاح کے لئے اقدامات کررہے تھے وہاں اس بات پر بھی گہری نظر رکھے ہوئے تھے کہ کوئی ملکی یا غیر ملکی ادارہ یہاں فلاح کے بہانے مذموم مقاصد میں کامیاب نہ ہونے پائے۔

آپ نہ صرف اندرون ملک قومی خدمات کرنے والوں کا مالی اور فکری تعاون فرماتے بلکہ بیرون ملک بھی چند ایک حضرات کو سپورٹ کرتے۔

ایک مرتبہ برادرسجادحسین میکن زیارات کے لئے عراق جانے لگے تو آپ نے انھیں ایک خط اور رقم کا لفافہ تھمایا اور کہنے لگے کہ نماز عصر کے وقت حرم حضرت علی علیہ السلام پر فلاں خدوخال کا ایک نوجوان عالم دین نماز پڑھانے آئے گا اسے یہ خط اور لفافہ دے دینا۔ جب برادر موصوف نجف پہنچے تو خدوخال کے تعارف پر اس شخصیت تک جا پہنچے۔ برادر نے عراقی نسل کے اس نوجوان کو جب خط دیا تو وہ بے حد خوش ہوئے ڈاکٹر صاحب اور علامہ سید عارف حسین الحسینی کی خیریت دریافت کی اور کہنے لگے کہ میں کل سے ان شخصیات کو یاد کر رہا ہوں مجھے رقم کی اشد ضرورت تھی۔ جب برادر موصوف نے واپسی پر ڈاکٹر صاحب سے استفسار کیا تو آپ نے فرمایا کہ ''وہ عبدخدا قوم کے لئے ایک بہت بڑا فلاحی کام کر رہا ہے'' (غالباً وہ تحریری سطح پر قوم کی خدمت میں مصروف تھے)۔

۱۹۸۵ میں آئی۔ایس۔او پاکستان کا سالانہ پروگرام ترتیب دیا جانے لگا تو آپ نے احباب سے فرمایا کہ یوں تو آپ کے تمام کام قوم کی فلاح کے لئے ہیں مگر آپ کو بالخصوص ان دیہاتوں میں عوامی خدمت کرنی چاہیے جہاں لوگ صحت کی بنیادی ضرورتوں سے محروم ہیں۔ اس سلسلہ میں آئی۔ایس۔او کے مختلف ڈویژن میں طبی کیمپ منعقد ہوئے جن کی آپ نے ڈاکٹروں اور دوائیوں کے ذریعہ بھرپور مدد کی آپ خود بھی ان کیمپوں میں تشریف لے گئے۔ حسب استطاعت خدمت کی اور برادران کی بے حد حوصلہ افزائی فرمائی۔

عاشور کے روز امام عالی مقام کے سجدہ آخر کو خراج عقیدت پیش کرنے اور جلوس عزاداری میں نماز باجماعت ادا کرنے کا عظیم کارنامہ سفیر انقلاب کی روحانی اور نظریاتی فکر کا رہین احسان ہے۔ آپ کا خیال تھا کہ ہم امامؑ کے جس سجدہ کو یاد کر کے نوحہ و ماتم کرتے ہیں وہ ہم سے قضا نہیں ہونا چاہیے۔ چنانچہ آپ نے آئی۔ایس۔او پاکستان کے کارکنان کے ذریعہ ملک بھر کے جلوس ہائے عزاداری کے دوران میں نماز باجماعت ادا کرنے کا تاریخی فیصلہ کیا۔ جہاں ملک بھر میں آپ کے فیصلہ کو عملی جامہ پہنچایا گیا وہاں آپ نے ۹ محرم الحرام کو لاہور کے مرکزی جلوس میں نماز کی ادائیگی کو آخری شکل دی۔ آپ کا یہ پروگرام انتظامیہ کو ناگوار گزرا اور اسلام پورہ لاہور میں

آپ کے ساتھیوں پر لاٹھی چارج کیا گیا۔

انتظامیہ کے تشدد کے باوجود آپ نے میدان نہ چھوڑا بلکہ وہاں پر موجود کمشنر لاہور عمر آفریدی کو للکارتے ہوئے کہا ''تم نے نمازیوں پر لاٹھی چارج کروا کر اسلام دشمنوں کی یاد تازہ کی۔''

آپ کی جرات اور آپ کے نوجوان ساتھیوں کے جذبات دیکھ کر دوسرے روز کمشنر نے آپ کو اپنے دفتر بلایا اور عاشور کے جلوس میں نماز نہ پڑھنے کی اپیل کی مگر آپ نے اس کی اس تجویز کو نہ صرف مسترد کیا بلکہ فرمایا ''مجھے یہ سن کر دلی دکھ ہو رہا ہے کہ ایک مسلمان افسر اسلامی ملک میں نماز کا اہتمام کرنے کی بجائے رکاوٹ ڈال رہا ہے۔ ہم اسلام کے معاملات میں مصلحت کو اپنی ذلت سمجھتے ہیں۔''

۱۹۹۰ میں محرم الحرام کی مجلس سننے آپ لٹن روڈ لاہور گئے جہاں امام بارگاہ کے گیٹ کے سامنے ''حسین بلڈ ڈونرز'' ''Hussain Blood Doners'' کے زیر اہتمام خون اکٹھا کرنے کا کیمپ لگایا گیا تھا۔ آپ کافی دیر تک ان کے ساتھ کھڑے مختلف فلاحی کاموں پر گفتگو کرتے رہے۔ مجلس کے اختتام پر آپ ایک ''بک سٹال کے قریب کھڑے ہوئے تو بہت سے نوجوان آپ کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ آپ نے باری باری تمام برادران سے خیریت دریافت کی اور فرمانے لگے کہ جن برادران نے یوم عاشور زنجیر زنی نہیں کرنی انھیں چاہیے کہ وہ امام حسین علیہ السلام کی راہ میں خون کا نذرانہ ضرور دیں۔ آپ نے تاکید فرمائی کہ نیکی میں پہل کرنے کے لئے آپ احباب ''بلڈ کیمپ'' میں جائیں اور انھیں خون دیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کا خون کسی انسان کی زندگی کو بچانے کا سبب بنے گا اور خداوند کریم بصدقہ حسین علیہ السلام آپ کو اجر عطا فرمائے گا۔''

یہاں ایک دوست نے آپ سے دریافت کیا کہ ''کیا حسین بلڈ ڈونرز'' والے خون کے عطیات صرف شیعوں کو دیتے ہیں۔۔۔؟ تو آپ نے فرمایا ''انسانیت کی بات کریں خود کو شیعیت کے دائرے میں محدود نہ کریں۔ ہمارے امام عالی مقامؑ شہید انسانیت ہیں شہید شیعیت نہیں''

آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اپنی قوم سے محبت اور ان کی خدمت کا جذبہ ایک فطری عمل ہے اور فطرت سے انکار کرنا جھوٹ ہوتا ہے مگر ہم کسی فرقہ سے نفرت نہیں کرتے ہمیں صرف

مسلمانوں کے دکھ درد میں شریک ہونے تک بھی محدود نہیں رہنا چاہیے بلکہ ہمیں تو اس غیر مسلم انسان کی بھی خدمت کرنی چاہیے جو بے یارومددگار غم کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہو۔ ہمیں انسانیت کے لئے کام کرنے کا جذبہ پیدا کرنا چاہیے۔''

اگرچہ آپ ملت جعفریہ کے ایک عظیم فرزند ہونے کے ناطے اپنی ملت کی خدمت میں مصروف عمل رہے تاہم زندگی بھر آپ نے کسی دوسرے مسلمان سے تعصب نہ کیا۔ آپ کی زیر نگرانی چلنے والے اسکولز میں بیسیوں بچے اہل سنت ہیں۔ میں نے بذات خود چار ماہ تک آپ کے ایک اسکول میں بچوں کو تعلیم دی ہے۔ آپ جب بھی اسکول آتے تمام اساتذہ کو تاکید کرتے کہ آپ اسکول میں خود کو استاد کی حیثیت سے متعارف کرائیں، آپ کی ذمہ داریاں ایک عظیم معلم کی ہونی چاہئیں۔ آپ کے کسی قول یا فعل سے تفرقہ کی بو تک نہیں آنی چاہیے۔ ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ آپ کے کسی جملے سے دیگر مسلمان بچوں کے شفاف ذہنوں پر کوئی خراش تک آئے۔

آپ کے اسکولز میں شیعہ سنی ٹیچرز موجود ہیں ایک مرتبہ آپ کی خدمت میں ایک نوجوان آیا اور اس نے مدرس کے لئے آپ کو درخواست دی اور ساتھ اظہار کیا کہ وہ شیعہ ہے۔ آپؒ نے جواباً فرمایا ''میرے عزیز! میرے اسکولز کی تعلیم میں شیعہ سنی کا قائل نہیں ہوں۔ مجھے زیر تعلیم سینکڑوں بچوں کا مفاد عزیز ہے۔ مجھے اس سلسلہ میں ماہر مدرس کی ضرورت ہے۔ بے شک اس کا تعلق کسی فرقہ سے ہی کیوں نہ ہو۔ تعلیم کسی فرقہ کی محتاج نہیں بلکہ ہمارے امام اولؑ کا فرمان ہے کہ ''علم مومن کی گمشدہ میراث ہے جہاں سے ملے اسے حاصل کرو۔''

آپ کے کلینک پر دو ملازمین اہل سنت تھے اور آپ ان کا دیگر نوجوانوں سے زیادہ خیال رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ آپؒ نے ملک کے معروف اسپتال میں ایک بے روزگار ڈسپنسر کو خط دے کر بھیجا اور وہاں پر تعینات شیعہ افسر سے اس کی ملازمت کی سفارش کی اور تاکید کی کہ یہ اہل سنت بھائی ہے اس کا کام ضرور کر دیں۔

اپنے ہم مسلک ایک سابق وزیر سے ایک سنی نوجوان کی ملازمت کی سفارش کی تو اس نے حیرانی سے اپنے دوسرے دوست سے کہا کہ'' میں یہ سوچتا بھی نہ تھا کہ ڈاکٹر نقوی اپنے دیگر

مسلمان بھائیوں پر بھی اس قدر مہربان ہے۔ اسی طرح آپ نے بیسیوں اہل سنت نوجوانوں کے روزگار میں معاونت کی۔ آپؒ فرمایا کرتے تھے کہ'' یہ ہمارے مسلمان بھائی ہیں ان کا بے روزگار رہنا معاشرے کے لئے بہتر نہیں ہے۔ معاشرہ میں جتنی بیماریاں پیدا ہوئی ہیں ان میں بے روزگاری سرفہرست ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ معاشرہ میں امن کے قیام کے لئے بلاتفریق مذہب و مسلک خدمات سرانجام دینی چاہیں۔''

ایک مرتبہ لاہور میں آپؒ کی زیر نگرانی چلنے والے اسکول میں ایک عیسائی طالب علم نے داخلہ لیا جس پر بعض اساتذہ کو اعتراض تھا مگر آپؒ نے فرمایا'' وہ پاکستان کا شہری ہے اور رب کریم کا خلق شدہ انسان ہے۔ لہٰذا تعلیم حاصل کرنا اس کا حق ہے اور اس سے یہ حق چھیننا ظلم ہے'' آپ نے تاکید فرمائی کہ اس سے دیگر بچوں کی طرح سلوک کیا جائے اور کسی مقام پر انسانیت کی تذلیل نہ ہونے پائے۔''

آپ کی شہادت کے دوسرے روز ہنجر وال لاہور جہاں آپ کا ذاتی اسپتال ہے کے معززین آپؒ کی تعزیت کے لئے آئے تو کہنے لگے کہ ہمیں کل پتہ چلا ہے کہ ڈاکٹر صاحب شیعہ رہنما تھے۔ وہ تو خدا ترس انسان تھے، ہماری آبادی کے غریب لوگوں سے فیس تک نہ لیتے بلکہ مدد بھی فرماتے تھے۔ وہاں آپ نے اہل سنت کے بیسیوں بچوں کے وظائف جاری کیے اور کئی یتیم بچیوں کے لئے جہیز تک کی مدد کی۔

آپ کے پڑوسی اہل سنت گھرانوں نے اس بات کی تصدیق کی کہ ڈاکٹر صاحب ان کے بچوں کو ماہانہ پانچ سو روپے تک وظیفہ دیتے تھے اور ڈاکٹر صاحب کی امداد کی وجہ سے ان کے بچے اچھے اسکولوں میں زیر تعلیم ہیں۔

برملا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ سفیر انقلاب کو خلوص اور قومی درد نے آرام سے نہ بیٹھنے دیا۔ انھوں نے تمام عمر انتہائی سادہ لباس پہنا، بہت کم کھایا اور بہت کم سوئے۔ چشم بینا رکھنے والے افراد آج بھی شاہد ہیں کہ انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو دوسروں کے جسم ڈھانپنے، دوسروں کے پیٹ بھرنے اور دوسروں کو آرام بخشنے کی کوشش میں مصروف پایا۔ یہ ان کے خلوص کا نتیجہ تھا کہ صاحب

ثروت لوگ ان کی ہتھیلی پر کروڑوں روپے رکھتے، ان کے نام کو اعتماد کی علامت سمجھتے اور خدا کی ایک عظیم نعمت سمجھ کر ان کا احترام کرتے۔

آپ کی شہادت کے چند روز بعد قوم کی فلاحی کمیٹی کے لئے کروڑوں روپے دینے والے محسن ملت جب عرب امارات سے لاہور تعزیت کے لئے تشریف لائے تو انھوں نے فرمایا کہ ''میری نظر میں اس وقت ملک بھر میں کوئی انسان ایسا نہیں ہے جسے میں ڈاکٹر محمد علی نقوی شہیدؒ کے خلوص، قومی درد، تقویٰ اور خدا پرستی کا نعم البدل قرار دوں''

اس موقع پر ایک سینئر تنظیمی ساتھی نے واقعہ سنایا کہ ڈاکٹر صاحب نے انھیں قومی سروے کرنے کے لئے لاہور اسٹیشن سے روانہ کیا تو خدا حافظ کہتے وقت فرمایا ''عزیز دوست یہ رقم جو آپ کے اخراجات کے لئے دی گئی ہے میری ذاتی نہیں یہ مال امامؑ اور ایک محسن ملت کا ایثار ہے۔ دوران سفر میں کھانا ایسا نہ کھانا جو معمول سے ہٹ کر ہو، ہوٹلوں کے قیام سے حتی المقدر گریز کرنا، وقت خدا کی بہت بڑی نعمت ہے اس کے استعمال کے ساتھ انصاف کرنا، مقاصد کے حصول کے لئے رقم کے خرچ میں کنجوسی نہ کرنا۔۔۔۔''

سفیرانقلاب چونکہ گوشت پوست کے انسان تھے اور زمانہ میں رہتے تھے اس لئے زمانے والوں نے ان پر الزامات لگائے۔ پیغمبروں کے کردار پر اٹھنے والی انگلیاں ان پر بھی اٹھیں۔۔۔ بہتانوں کے سنگ ان کے سر پر بھی پھینکے گئے مگر وہ ان قباحتوں سے بے نیاز اپنے سفر میں مصروف رہے اور اکثر فرمایا کرتے تھے کہ (TRUTH NEEDS NO PROOF) ''سچائی کو ثبوت کی ضرورت نہیں ہوتی۔''

ہزار تہمتیں دنیا نے بخش دیں اس کو
وہ آدمی تھا مگر چپ رہا خدا کی طرح

سفیرانقلاب اورافرادسازی

یہ بات دعویٰ سے کی جاسکتی ہے کہ اگر وطن عزیز پاکستان کے کونہ کونہ میں ملت جعفریہ سے تعلق رکھنے والے باصلاحیت اور باکردار نوجوانوں کا رشتہ تلاش کیا جائے تو بالواسطہ یا بلاواسطہ ان کے معمار ڈاکٹر محمد علی نقویؒ ہی نظر آتے ہیں۔ آئی۔ایس۔او کا بنیادی رکن ہو یا کوئی مرکزی رہنما۔۔۔گمنام ہو یا نامور شخصیت، ہر ایک سے سفیرانقلاب کی شخصیت کا اثر جھلکتا ہے۔ ۲۳ سالہ اس تنظیم کے جتنے اہم رہنما تحریک جعفریہ کے ماتھے کا جھومر ہیں یا ملت کی آبادی میں بہت بلند نظر آتے ہیں وہ تمام کے تمام سفیرانقلاب کے زخمی ہاتھوں کے تعمیر کردہ ہیں۔

یہ ایک آفاقی حقیقت ہے کہ کوئی انسان اپنے جیسے انسان پر مثبت اثرات اس وقت مرتب کرتا ہے جب اس کے افعال اس کے اقوال کی تفسیر بنتے ہیں۔ دلوں پر حکمرانی اس وقت قائم ہوتی ہے جب کوئی انسان خود کو پیغمبروں اور آئمہ اطہارؑ کی سیرت کے قالب میں ڈھالتا ہے اور افراد سازی کا شرف بھی اسے حاصل ہوتا ہے جو خودسازی کی منزلیں طے کرتا ہے۔

اگر کسی اہل فکر ونظر کے ذہن میں یہ سوال انگڑائی لے کہ ڈاکٹر محمد علی نقوی شہید بظاہر ایک عام انسان تھے۔ وہ فقیہ تھے نہ مجتہد۔۔۔۔وہ روحانی پیر تھے نہ حکمران۔۔۔۔مگر آپ کی شخصیت کا طلسم باشعور نوجوانوں پر بھلا کیسے طاری ہے۔۔۔۔؟ تو اس کا جواب بڑا سادہ ہے کہ سفیرانقلاب نے نوجوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے سے شہادت کی معراج تک خود کو سیرت معصومینؑ کے سانچے میں ڈھالا، اسلام آپکا اوڑھنا بچھونا ٹھہرا، وآل محمدؐ کی تعلیمات آپ کے خون کے ایک ایک ذرہ میں اس قدر شامل ہوئیں کہ آپ کے جسم کے ہر مسام سے خلوص اور دینداری کی خوشبو محسوس ہوئی۔ خدا کا دین آپ کا آئین اور محمد وآل محمدؐ کی شریعت آپ کا دستور سمجھی جاتی تھی۔

اگرچہ آپ عالم دین نہ تھے مگر کئی علمائے کرام کو اس حقیقت کا ادراک تھا کہ ڈاکٹر صاحب

اللہ کی عظیم نعمت ہیں جس کی ہمیں قدر کرنی چاہیے۔آپ پیروکار تھے مگر بڑے بڑے پیرآپ کی پیشانی چومتے تھے۔۔۔آپ عوام سے تھے مگر ملک کے حکمران آپ سے مذاکرات کے دوران انگلیاں منہ میں دبائے آپ کی ذہانت پر متحیر رہتے تھے۔

سفیرانقلاب جس غیر معمولی مقام پر پہنچ کر اپنوں کے لئے قابل تقلید اور دشمنوں کی آنکھوں کا کانٹا بنے وہ مقام انھوں نے طویل ریاضت کے بعد حاصل کیا۔انھوں نے ۲۳ سالہ تنظیمی مسافت میں پیٹ پر پتھر باندھ کر اپنا سفر جاری رکھا ان کے جسم پر ملبوس تھکن ان کے سفر میں حائل ہوئی نہ آبلہ پائی نے ان کی رفتار کو متاثر کیا۔انھوں نے سفر کے آغاز میں جس جنبش سے پہلا قدم بڑھایا زندگی کے اختتام تک اس میں شدت پیدا کی۔آپ جس عزم سے عازم سفر ہوئے اسے پختگی کے ساتھ انجام تک پہنچایا۔یہی وجہ ہے کہ آج بھی آپ کے قدموں کے نشان سلامت ہیں اور آپ کی انتھک جدوجہد زندہ جاوید بن چکی ہے۔

ماضی کی تاریخ کی ورق گردانی کی جائے یا بزرگوں سے عظیم لوگوں کے حالات سنے جائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر دور میں عظیم لوگ موجود رہے ہیں۔جن کا تقویٰ اور جدوجہد زماں ومکاں کے حوالے سے مثالی تھا۔یہاں تک کہ بعض روحانی شخصیات نے اس قدر تقویٰ اپنایا کہ وہ ''متقی'' معروف ہوگئے۔مجھے یہ بات لکھنے میں قطعاً کوئی عار نہیں کہ میں نے جہاں تک سنا، تاریخ سے حاصل کیا یا اپنی آنکھوں سے دیکھا، مجھے پاکستان کی تاریخ میں ملت جعفریہ کا کوئی غیر عالم شخص ڈاکٹر محمد علی نقوی شہید کے پایہ کا نظر نہیں آیا۔کسی غیر عالم کے لئے اس سے بڑا اعزاز کیا ہوسکتا ہے کہ

آپ کی مجلس ترحیم سے خطاب کرتے ہوئے چند علما نے برملا کہا کہ ''ڈاکٹر نقوی کئی علما سے بہتر تھے۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت سے ایسے لوگ ہوں گے جنھوں نے خودسازی کے تمام مراحل طے کیے ہوں گے مگر خودسازی کے ساتھ ساتھ افرادسازی کا شرف اگر کسی مجاہد کو حاصل ہے تو وہ سفیرانقلاب کی ذات ہے۔

یہ بات بڑی واضح ہے کہ آپ نے تنظیم کے دائرے میں عام نوجوانوں کی طرح جذباتی

قدم نہیں رکھا بلکہ آپ روز اول سے اپنے نظریہ میں واضح تھے۔تاریخ بتاتی ہے کہ آپ کو تنظیم میں شمولیت کی دعوت نہیں دی گئی بلکہ آپؒ دعوت دینے والوں سے ملتے ہی اسی گروہ میں شامل ہوگئے۔

ابتدائی ایام میں جب آئی۔ایس۔او کے بانیان صرف امامیہ طلباء کو اپنے پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے میں مصروف عمل تھے اس وقت ڈاکٹر محمد علی نقویؒ واحد نوجوان تھے جو اپنے مکتب تک محدود نہ تھے بلکہ اسلام اور اس کے تقاضوں پر سیر حاصل بحث کرتے تھے۔یہ وہ زمانہ تھا جب درسگاہوں میں سوشلزم کا خاصا چرچا تھا اور طلبا اسلام سے بیزار دکھائی دیتے تھے، ایسے میں ڈاکٹر صاحب اسلام کے آفاقی نظریہ سے آگاہ فرماتے تھے اور اسلام اور سوشلزم کے بنیادی اختلافات پر دلائل سے گفتگو کرتے تھے۔

یہ شرف بھی سفیرانقلاب کی ذات کو حاصل تھا کہ آپؒ آئی۔ایس۔او کے پہلے نوجوان تھے جو باریش اور عالم زادے تھے۔آپؒ کا گھرانہ کٹر مذہبی تھا۔آپ کی گھریلو تربیت میں والدین کے علاوہ آپؒ کی پھوپھیوں کا گہرا عمل دخل تھا۔آپ کی پھوپھیاں گھر میں دیگر تمام افراد سے زیادہ متقی اور پرہیزگار تھیں۔چنانچہ آپ ایک ایسے ماحول کے پروردہ تھے جو اسلام سے شعوری وابستگی رکھتا تھا۔یہی وجہ تھی کہ آپ اپنے نظریہ، ہدف، یا مقصد پر زندگی کے آخری لمحہ تک قائم رہے۔

چونکہ آپ کا تعلق ایک عالم گھرانے سے تھا اس لئے آپؒ نے آئی۔ایس۔او کو نہ صرف علما کے قریب لایا بلکہ اسے علما کی سرپرستی میں چلایا۔آپ کا نظریہ تھا کہ جس طرح اسپتال کے لئے ڈاکٹرز کا ہونا ضروری ہے اسی طرح اسلامی تنظیم یا تحریک کے لئے علما کا میر کارواں ہونا ضروری ہے۔آپؒ نے اپنی اس فطری سوچ وفکر کے پیش نظر تنظیم کے ہر پروگرام میں علما کو موٹر سائیکل پر لے آتے اور طلبا کی کردارسازی کرتے۔آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اساس جس قدر مستحکم ہوگی عمارت اس قدر دیرپا ہوگی، جسم ایک عمارت کی مانند ہے اور اس کی اساس سوچ ہے۔جو طالب علم بنیادی طور پر اپنے اہداف میں واضح اور زندگی کی حقیقت سے آشنا ہوگا وہ زیادہ دیر تک تنظیم سے مربوط اور ملک وملت کے لئے سودمند ثابت ہوگا۔''

آپؒ اپنے احباب کو ہمیشہ تاکید کرتے تھے کہ وہ نئے طلبا کو تنظیم میں دعوت دیتے وقت

جذباتی گفتگو یا جذباتی تاریخی واقعات کا سہارا نہ لیں بلکہ قرآن مجید یا فرمودات آئمہؑ کی روشنی میں ان پر اپنے اغراض ومقاصد واضح کریں۔ جب آپ سے سوال کیا جاتا تھا کہ آخر وہ کون سی وجوہات ہیں جن کی بنا پر آئی۔ایس۔او کے بانی یا سینئر برادران تنظیم سے مربوط نہیں ہیں تو آپ مختصر جواب دیتے کہ ''نظریہ کی عدم پختگی اور روابط کا عدم تسلسل اس کی بنیادی وجوہات ہیں۔''

ایک محفل سے خطاب کرتے ہوئے آپؒ نے فرمایا کہ جذباتی طور پر تنظیم میں شامل ہونے والے احباب کی مثال طوفان کی طرح ہے جیسے وہ زوردار انداز میں اٹھتا ہے اور حالات کو زیروزبر کرنے کے فوراً بعد ختم ہوجاتا ہے۔اس طرح تنظیمی احباب کربلا، عزاداری اور دیگر چند زاویوں سے متاثر ہوکر تنظیم میں وارد ہوتے ہیں۔ بے پناہ خدمات سرانجام دینے کے بعد یوں بچھڑتے ہیں کہ ان کے سابقہ تعلق کا گمان تک نہیں ہوتا۔ جب کہ اس کے برعکس چند ساتھی نہایت دھیرے انداز میں تنظیم میں آتے ہیں اور وہ اس کے بنیادی مقاصد اور تقاضوں سے واقفیت کے بعد اس بادل کی طرح چھا جاتے ہیں جو کئی روز تک مسلسل برستا رہتا ہے۔لہٰذا تنظیم کو طوفان کے بجائے چھا جانے والے بادلوں کی ضرورت ہوتی ہے۔''

ایک مرتبہ آئی۔ایس۔او کی مجلس عاملہ کے پروگرام ''مرکزی صدور طلبا کے حضور'' میں آپ نے احباب پر واضح کیا کہ آج آپ کے سامنے آدھے سے زائد سابق صدور غیر حاضر ہیں جس کا مجھے افسوس ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ کم از کم سال میں ایک مرتبہ تو یہ برادران اکٹھے مل بیٹھتے۔ یہاں آپؒ نے حقیقت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ''بعض برادران اپنے عہدہ کا حلف لیتے وقت اس بات پر قطعاً غور نہیں کرتے کہ وہ کن کن ہستیوں کو حاضر وناظر جان کر اقرار کر رہے ہیں۔ جب ایک سال گزر جاتا ہے تو یہ برادران اپنے اقرار سے روگردانی شروع کر دیتے ہیں۔ان کا نظریہ ہوتا ہے کہ خدا و معصومینؑ کے روبرو اٹھایا جانے والا حلف، عہدہ تک ہی قائم رہتا ہے۔ جب کہ ان کی یہ سوچ غلط ہے، حلف کا تعلق زندگی سے ہوتا ہے عہدہ کی مدت سے نہیں۔پس وہ برادران جو شعوری طور پر حلف اٹھاتے ہیں وہ آخری دم تک اس پر قائم رہنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ ہماری ذمہ داری بنتی ہے کہ کسی ساتھی کو عہدیدار بنانے سے قبل اس کا شعور بیدار کیا جائے

تاکہ وہ زندگی کو عمل کی لطافتیں بخش سکے اور وہ تنظیم کے نصب العین کے مطابق مومن بن کر عہد حاضر کی تاریکیوں، فتنہ پردازیوں اور چیرہ دستیوں کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو۔''

افرادسازی کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ ''تنظیم دائمی ہے جب کہ اس کے ارکان عارضی ہیں لہٰذا اس کے استحکام کے لئے ضروری ہے کہ ہر ساتھی جب ایک مرحلہ سے دوسرے مرحلہ تک پہنچے تو وہ پہلے مرحلہ پر اپنا نعم البدل ضرور چھوڑے۔ یہ نہ ہونے پائے کہ ایک ساتھی خود تو یونٹ سے مرکز تک پہنچ جائے جب کہ تنظیمی سفر میں اس کا خلا باقی رہے۔مجلس عاملہ میں ڈویژنز کی کارکردگی رپورٹس سننے کے بعد آپ نے واضح کیا کہ ایک ڈویژن میں کام نوے فیصد ہوتا ہے جب کہ ایک سال بعد نئے ساتھیوں کی تنظیمی تربیت یا افرادسازی تیس فیصد ہے۔تو اس ڈویژن سے وہ ڈویژن زیادہ موثر اور فعال ہے جس میں کام ستر فیصد ہوتا ہے جبکہ وہاں ایک سال کے بعد افرادسازی پچاس فیصد ہوتی ہے۔

مجھے یاد ہے کہ ۱۹۹۱ میں جب میں نے ''ماہنامہ العارف'' کی ایڈیٹر شپ سے استعفاد یا تو اس مسئلہ پر ڈاکٹر صاحب نے پہلی بار مجھ سے آئی۔ایس۔او پاکستان کے نشتر میڈیکل کالج ملتان میں ہونے والے مرکزی کنونشن کے موقع پر یوں گفتگو کی۔

☆ حضرت تسلیم (آپ کا مخصوص انداز تھا حضرت یا میاں کہتے)۔۔۔ العارف کے بارے میں کیا سوچا ہے؟

} ڈاکٹر صاحب! وہی جو کیا ہے۔

☆ جو کچھ تم نے کیا ہے تمھاری دینداری کے مطابق درست ہے؟

} دینداری کے مطابق تو درست نہیں۔

☆ اس کا مطلب ہوا کہ پھر تمھاری ذات کے مطابق درست ہے؟

} تقریباً ایسا ہی ہے۔

☆ دس سال تنظیم میں کام کرنے اور کئی بار خدا اور امام زمانہؑ کے روبرو حلف اٹھانے کے بعد ابھی تک تم یہ طے نہیں پا سکے کہ تمھارے اقدامات دین کے لئے ہونے چاہیں یا ذات کے لئے۔۔۔؟

} ڈاکٹر صاحب عزت نفس بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔

☆ تمھیں عزت نفس زیادہ عزیز ہے یا عزت تنظیم۔۔۔؟

} عزت تنظیم

☆ کہہ کچھ اور رہے ہو اور کر کچھ اور۔۔۔؟

} ڈاکٹر صاحب آپ کا فرمان بجا، مگر مجھے ایک آدھ بزرگوں کے رویہ سے شدید صدمہ پہنچا ہے۔

☆ بندۂ خدا۔۔۔! کسی بزرگ کے لئے کام کر رہے ہو یا خدا کی رضا کے لئے۔۔۔؟

} ڈاکٹر صاحب کے دل سے نکلنے والے جملے سن کر میرے پاس کوئی جواب نہ تھا میرا ضمیر مجھے جھنجوڑ رہا تھا کہ تم نفس پرستی کی دلدل میں اترتے جا رہے ہو اور ساتھ ہی میرا خیال بار بار مجھے دعوت دے رہا تھا کہ دیکھو ڈاکٹر صاحب تنظیم کے ایک مجلہ کے لئے کس قدر فکرمند اور پر درد ہیں۔

جب میں آپؒ کے سامنے ندامت سے سر جھکائے خاموش ہوا تو سفیرانقلاب نے یہاں ایک ایسا درد بھرا جملہ کہا (جسے میں یہاں لکھنے سے قاصر ہوں) آپ کی اپنی آواز بھی بھر آئی اور میں بھی ضبط نہ کر سکا۔ ہم کالج کے گیٹ سے ہاسٹل غالباً ''رازی ہال'' کی طرف بڑھے ڈاکٹر صاحب چند احباب کے ساتھ دو چار قدم آگے تھے جب کہ میں آپ کا بریف کیس اٹھائے اپنے ضبط پر قابو پانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ حالت کچھ یوں تھی

آنکھوں کی خامشی میں سمندر کا شور تھا
لکنت سی پڑ گئی تھی ہماری زبان میں

جب ہم ہاسٹل پہنچے تو وضو کرنے کے دوران آپؒ نے مجھے تاکید فرمائی کہ ''عزیز دوست الٰہی تنظیم کی جس ذمہ داری پر بھی کام کرو خدا کی ذات کے لئے کرو اس وقت تک اس ذمہ داری سے انحراف نہ کرو جب تک تمھارا کوئی نعم البدل میسر نہ ہو۔ افراد پیدا کرنے کی کوشش کرو، خود آگے بڑھو مگر زنجیر کی طرح۔۔۔ تنظیم کے امور میں سلسلہ قائم رکھو اگر کہیں بھی یہ سلسلہ منقطع ہوا تو آپ دوستوں کو روز محشر حساب دینا ہوگا''

مجھے آپ کی قربت حاصل کیے کم عرصہ گزرا تھا اور یہ میری زندگی کا پہلا موقع تھا جب میں

نے محسوس کیا کہ یہ عظیم انسان نہ صرف مذہب وملت کے لئے وقف ہے بلکہ قوم کے لئے بھی دل میں درد کے سمندر رکھتا ہے۔ اپنے ہر فعل کو تنظیم کے حلف سے مربوط رکھتا ہے۔ اس کی نظر آج بھی اپنے ماضی کے اقرار اور مستقبل کے لاریب انجام پر مرکوز ہے۔

ایک مرتبہ چند احباب نے آپ کے سامنے تجویز پیش کی کہ پندرہ روزہ یا ماہانہ اجلاس میں ساتھیوں کا احتساب ہونا چاہیے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔۔۔ آپؒ نے فرمایا ''انسان کو اپنا احتساب پندرہ روز یا مہینہ بعد نہیں کرنا چاہیے بلکہ اسے اپنا احتساب ہر قدم پر کرنا چاہیے یا کم از کم رات کو سونے سے قبل اسے دن بھر کے امور کا احتساب کر لینا چاہیے کہ اس نے کیا کھویا کیا پایا ہے؟ مولا علی علیہ السلام کا فرمان ہے کہ جس کا آج اس کے کل سے بہتر ہے وہ کامیاب ہے۔ اس موقع پر آپؒ نے وضاحت کی کہ ہر تنظیمی دوست پر لازم ہے کہ وہ اس بات پر فکر کرے کہ وہ خود کتنا آگے بڑھ رہا ہے اور پیچھے کیا چھوڑ رہا ہے۔ خود کیا حاصل کر رہا ہے اور تنظیم کو کیا دے رہا ہے۔۔۔؟''

۱۹۸۵ میں ملتان کی مجلس عمومی کے موقع پر کچھ برادران نے نئے ڈویژنل صدر کے چناؤ اور چند دوسرے امور پر ہنگامہ برپا کر دیا۔ آپؒ نے انتہائی صبر وتحمل سے معاملات کو نمٹایا اور غیر متوقع حالات کو معمول پر لا کر صورتحال کا نقشہ بدل دیا۔ جب آپ سے چند دیگر ڈویژنل صدور کی بات ہوئی تو آپؒ نے فرمایا کہ ''اختلافات تنظیموں کا حسن ہوتے ہیں اختلافات وہاں جنم لیتے ہیں جہاں کام ہو رہا ہوتا ہے اور زیادہ سے زیادہ افراد شریک کار ہوتے ہیں۔ تنظیم کے اختلافات تعمیر کی طرف رہنمائی کرتے ہیں البتہ بعض مقامات پر چند افراد کے رویہ کو دیکھ کر خاصا دکھ ہوتا ہے کہ وہ تنظیم میں رہنے کے باوجود بھی اپنے دائروں میں محدود ہوتے ہیں۔ ان کے اقدامات ذاتیات کی نشاندہی کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں خودسازی کا فقدان ہے وہاں کے سینئر برادران افرادسازی نہیں کر سکے۔''

آپؒ نے مزید فرمایا کہ افرادسازی صرف تنظیم کی ضرورت ہی نہیں بلکہ اسلامی معاشرہ کے قیام کا تقاضا بھی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آج ڈاکٹر محمد علی نقوی شہیدؒ ہزاروں نوجوانوں کے آئیڈیل (IDEAL) ہیں اور ان کی ذات کو ملت جعفریہ میں افراد ساز کارخانہ کی حیثیت حاصل ہے۔ آخر انھوں نے ملت پر اتنا بڑا احسان کس انداز میں کیا اور کن کن مراحل سے گزرے۔۔۔؟

اس کا جواب اگرچہ خاصا طولانی ہے تاہم مختصر انداز میں اتنا کہا جاسکتا ہے کہ افراد سازی کے لئے انھوں نے بیش بہا پروگرام ترتیب دیئے۔ بڑے بڑے تربیتی کیمپس منعقد کرائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نوجوان تربیتی پروگراموں سے متاثر ہوئے لیکن آپ کی ذات ہمیشہ تربیت کا محور رہی۔ جس شخص نے بھی آپ کی قربت میں چند لمحے گزارے اس نے آپؒ کے ساتھ برسوں صرف کرنے کا تہیہ کرلیا۔ یہاں تک کہ بعض احباب کی خواہش رہی کہ خدا انہیں شہادت بھی ڈاکٹر نقویؒ کے ساتھ عطا فرمائے۔

اگرچہ میں بذات خود آپ کی ذات سے خاصا متعارف تھا مگر حقیقی معنوں میں آپ کا عرفان اپنے محبوب بھائی سید راشد عباس نقوی کے ذریعہ ہوا۔ برادر راشد نقوی کی بات کسی اور کے لئے ہو نہ ہو میرے لئے سند کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایک شب انھوں نے سفیر انقلاب کے بارے میں مجھے بتایا کہ ''یہ ایک ایسا انسان ہے جس کی قربت میں جتنا جائیں اتنی ہی لذت نصیب ہوتی ہے'' انھوں نے وضاحت کی کہ انسانی فطرت میں ہے کہ انسان جب کسی دوسرے انسان کے قریب جاتا ہے یا اس کی گہرائی کا اندازہ لگاتا ہے تو اس سے کئی راز کھلتے ہیں جو عام طور پر اس کے ظاہر سے متصادم یا مختلف ہوتے ہیں۔ مگر ڈاکٹر صاحب ایک ایسی شخصیت ہیں جن کا ظاہر باطن سے بال برابر مختلف نہیں اور آپؒ کی ذات حضرت علی علیہ السلام کی مومن کے لئے بتائی گئی تمام نشانیوں پر کماحقہ پوری اترتی ہے'' رفتہ رفتہ مجھے جب آپ کی قربت نصیب ہوئی تو بے ساختہ ماننا پڑا کہ آپؒ واقعاً کامل انسان ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے ہاتھوں کسی نوجوان کی تربیت کرانے کے کئی مراحل ہوتے تھے۔ پہلا مرحلہ آپ سے ملاقات اور گفتگو کا ہوتا تھا۔ جو نوجوان بھی آپ سے ملتا آپ کا ہوجاتا تھا۔ جو بھی آپ کی گفتگو سنتا آپ کا عقیدت مند بن جاتا تھا۔ خدا نے آپ کی شخصیت میں اتنی جاذبیت رکھی

تھی کہ نوجوان آپ سے بچھڑنا نہیں چاہتے تھے بقول ؎

وہ خوش کلام تھا اتنا کہ اس کے پاس ہمیں
طویل رہنا بھی لگتا تھا مختصر رہنا

ڈاکٹر صاحب کے ہاتھوں تربیت کا دوسرا مرحلہ آپ کے ساتھ چند روز گزارنے کا ہوتا تھا۔ جو نوجوان سفر و حضر میں آپ کی صحبت میں چند ایام گزار لیتا تھا وہ آپ سے جدائی کا تصور بھی نہ کرتا تھا۔ یہاں تک کہ بعض احباب کے والدین نے ڈاکٹر صاحب سے پیار بھرے انداز میں شکوہ بھی کیا کہ ان کے بچے جب بھی گھر آتے ہیں وہ سارا سارا دن آپ کے تذکرے کرتے ہیں اور والدین کے ساتھ زیادہ رہنے کی بجائے آپ کے ساتھ رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

اس بات کا اظہار ڈاکٹر صاحب نے خود زندگی کی آخری عید کے دن اس وقت کیا جب آپؒ احباب سے ان کے گھر عید ملنے گئے تو وہ عید کے روز آپ کے ساتھ روانہ ہوگئے۔ اس موقع پر ڈاکٹر صاحب نے احباب کے والدین کو ان کے شکوہ کا جواب دیا کہ میں آج ان کو لینے نہیں آیا یہ اپنی مرضی سے جارہے ہیں بلکہ آپ نے خوشاب اور سرگودھا کے چند احباب کو سختی سے کہا کہ وہ اپنے گھروں میں والدین کے پاس رہیں۔

زندگی کے آخری ایام میں آپ نے اپنے ساتھ رہنے والے ایک نوجوان کے والدین کے بارے میں سنا کہ وہ بیمار ہیں، آپؒ نے اپنے رفیق سے کہا کہ وہ گھر جائیں اور والدین کی خدمت کریں۔ جب نوجوان نے یہ کہہ کر ٹالنے کی کوشش کی کہ ان کے والدین بیمار نہیں ہیں تو آپ اس کے گھر گئے اس کے والد صاحب کی عیادت کی ان سے ملے اور نوجوان کو گھر چھوڑ آئے۔ واپسی پر آپ نے اس ساتھی سے چابیاں وغیرہ لیں اور اسے سختی سے کہا کہ وہ والدین کو ایسی حالت میں چھوڑ کر لاہور قطعاً نہ آئے۔

وہ دوست آج بتاتے ہیں کہ جب ڈاکٹر صاحب نے ان سے مکان کی چابیاں لیں اور والدین کے علاج کے لئے رقم دی تو انھیں ایسے لگا جیسے وہ آج سے انھیں خود سے جدا کررہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اپنے جانثار کو چھوڑ کر روانہ ہوئے تو اس باوفا ساتھی کی آنکھیں چھلک پڑیں

اورانھوں نے آپؒ سے بھیگی آنکھوں کے ساتھ عرض کی ؎

تیرے بنا ہے کڑی دھوپ کا سفر درپیش
تو اپنی چھاؤں میں پل بھر مجھے ٹھہرنے دے

جہاں تک ہم نے محسوس کیا ہے کہ سفیرانقلاب کی رفاقتوں کے کئی حلقے تھے۔آپؒ اپنے چاہنے والے نوجوانوں کوان کے مزاج اورصلاحیت کے مطابق مخصوص حلقے میں رکھتے تھے۔جس طرح اسکول میں جماعتیں ہوتی ہیں اورطالب علم مرحلہ وارترقی کرتا ہے۔بالکل ایسے ہی سفیر انقلاب ایک اسکول کے مانند تھے ان کی اپنی جماعتیں تھیں جن کا دائرہ نرسری سے پوسٹ گریجوایٹ تک تھا۔البتہ فرق اتنا تھا کہ اس ادارہ کی نرسری گریجوایٹ طلباء سے شروع ہوئی تھی۔

آپ مومن تھے اورحدیث نبویؐ کے مطابق خدا کے نورسے دیکھتے تھے۔آپؒ کے دل کی حکمت جب لبوں پرآتی تھی تو سننے والوں کے دل میں اتر جاتی تھی جبکہ آپ کی آنکھوں کی چمک اور ہاتھوں کی لمس ملنے والوں پر جادو کا اثر رکھتی تھی۔

ایک مرتبہ آپ کے کلینک پر ایرانی طالب علم آیا۔علاج ومشورہ کے بعد وہ واپس جانے لگا تو اس نے باہر بیٹھے ہوئے آپ کے رفقا سے کہا کہ آپ کا رفیق ڈاکٹر جلد شہید ہوجائے گا۔جب وجہ پوچھی گئی تو اس نے بتایا کہ وہ ایران عراق جنگ کے دوران میں کئی ماہ تک محاذ پر رہا اوراس کے سامنے جتنے مجاہد شہید ہوئے ان کی آنکھوں کی چمک اور ہاتھوں کا لمس بالکل اس ڈاکٹر جیسا تھا۔

آپؒ نوجوانوں کی تربیت کسی خشک زاہد یا ناصح کی طرح نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے عمل سے تبلیغ کرکے دیکھنے والوں کو گرویدہ کرلیتے تھے۔آپ کی تربیت کی اس سے بڑی دلیل اورکیا ہوسکتی ہے کہ آپ کی زیرتربیت پروان چڑھنے والے آئی۔ایس۔او پاکستان کے تمام مرکزی صدور تاحال تنظیم سے نہ صرف مربوط ہیں بلکہ تقریباً وقف ہیں۔جبکہ آپ سے پہلے کے مرکزی صدور کا تنظیم سے رابطہ نہ ہونے کے برابر ہے۔

آپؒ کے تربیت یافتہ نوجوان عالم بھی ہیں اورمجاہد بھی۔۔۔مقرر بھی ہیں اورلکھاری بھی۔۔۔متقی بھی ہیں اور پاکباز بھی۔۔۔اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی ہیں اور بڑے بڑے عہدوں پر فائز

بھی۔۔۔مومن بھی ہیں اورہمدرد بھی۔۔۔محرک بھی اور پاسبان بھی۔۔۔تحریک جعفریہ اورآئی۔ایس۔او کی ریڑھ کی ہڈی بھی ہیں اورملت جعفریہ کا مضبوط سہارا بھی۔۔۔اسلام کے داعی بھی ہیں اورملک کے بےلوث محافظ بھی۔۔۔

آپ نے آغاز میں نوجوانوں کے درمیان تقویٰ کو متعارف کرایا اورنماز شب کی ترغیب دی۔آپ باقاعدگی سے نماز پڑھتے تھے۔آپ کی عبادت کا منظر دیکھنے والے گواہی دیتے ہیں کہ آپ مصلیٰ عبادت پرآتے تو آپ کی آنکھیں ساون کے بادل کی طرح برستیں،جسم موم اور بدن میں کپکپی طاری ہوجاتی تھی۔

آپ انفرادی عبادت سے آگے بڑھے تو اجتماعی عبادات کے فروغ کی ٹھانی۔عزاداری کی محافل کے اہتمام تک محدود طلباء کو الٰہی دائرے میں لانے کی کوشش کی۔آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ہمیں خدا کا بندہ بننا چاہیے۔آپؒ قرآن مجید کے پارہ ۳ سورہ آل عمران کی اس آیت کی تفسیر تھے جس میں ارشاد خداوندی ہے کہ ''اے رسول۔۔۔میرے بندے تو وہ ہیں جو صبر کرتے ہیں ،سچے ہیں،قناعت پسند ہیں،میری راہ میں خرچ کرتے ہیں اوررات کے پچھلے پہر استغفار کرتے ہیں۔''

چونکہ میرے پاس ڈاکٹر صاحب کے بنیادی دروس کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں اس لئے میں ان سے کوئی چیز منسوب کرنا نہیں چاہتا البتہ آپ کے احباب کہتے ہیں کہ سفیرانقلاب واحد نوجوان تھے جو ضمیروں کو جھنجوڑنے والی باتیں کرتے تھے۔وہ دور جب ہماری ملت میں عبادت صرف علما تک محدود تھی۔آپ نوجوانوں کو قلبی درد سے ایسے پردرد دروس دیتے تھے کہ طلبا خدا کی طرف راغب ہوجاتے تھے۔

آپؒ نوجوانوں کو تقویٰ کی طرف مائل کرہی رہے تھے کہ ایران میں اسلامی انقلاب کا سورج طلوع ہوگیا۔اس کی کرنیں جب پاکستان پہنچیں تو ڈاکٹر صاحب نے شاہ ایران کی تاریکیوں کے بعد امام خمینیؒ کے منور ایران کو دیکھنے کا ارادہ فرمایا۔جب آپ نے ایران کا نقشہ،مزاج اور ماحول بدلا دیکھا تو آپ نے آئی۔ایس۔او پاکستان کا قافلہ تشکیل دیا اورانھیں

روحانی ماحول میں بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ آپ کے طے شدہ پروگرام کے مطابق نوجوانوں کو وہاں کی علمی شخصیات، فقیہان، مجاہدین اور شہداء کے ورثاء سے ملوایا گیا۔ امام زمانہ علیہ السلام کے ملک میں امامؑ کے فرزند کی اسلامی حکومت امام رضا علیہ السلام اور معصومہ قم کے مزارات کی زیارت، فقیہان کے دروس، مجاہدین کے جذبے اور شہداء کے ورثاء کے تاثرات نے پاکستانی طلباء کی زندگیوں میں انقلاب برپا کر دیا۔ جب پہلا قافلہ واپس لوٹا تو ان کے اندر پیدا شدہ نمایاں تبدیلی نے ڈاکٹر صاحب کو دلی مسرت بخشی۔ جس کے بعد آپ نے نوجوانوں کے بیسیوں قافلے بھیجے اور پاکستان کے امامیہ طلبا کی روحانی طاقت میں اضافہ فرمایا۔

نوجوانوں پر انقلاب کے اثرات کا جائزہ لے کر آپ نے اپنے چند احباب کو اکٹھا کیا اور فرمایا کہ ''اسلامی انقلاب اسلامی ایران نے دنیا بھر میں بالعموم اور پاکستان میں بالخصوص جو اثرات مرتب کیے ہیں اور ہمارے تنظیمی برادران میں جو روحانی تبدیلیاں رونما ہوئی ہے یہ اس بات کی متقاضی ہیں کہ ہم بھی وہاں جیسا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ علمائے کرام سے استعفادہ کریں اور پاکستان میں اسلامی انقلاب کے لئے تیاری شروع کر دیں۔''

جب احباب نے آپ کی تائید کی تو آپ نے کربلا گامے شاہ لاہور میں ''دعائے کمیل'' کا آغاز کر دیا۔ چونکہ یہاں کے لوگ دعائے کمیل کی اہمیت اور حقیقت سے تقریباً نا آشنا تھے۔ اس لئے آغاز میں صرف تنظیمی برادران نے شرکت کی اور ڈاکٹر صاحب نے دعائے کمیل پڑھانا شروع کر دی۔ سفیر انقلاب نے دعائے کمیل کو اتنے پر درد انداز میں پیش کیا کہ نوجوان خوف خدا میں دھاڑیں مار کر روئے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ روحانی محفل اس قدر جاذب ہوگئی کہ ہر شب جمعہ، خوف خدا میں گریہ کرنے والوں کے اجتماع میں اضافہ ہوتا گیا۔ چند ماہ بعد نوبت یہاں تک پہنچی کہ لاہور شہر کے سینکڑوں بندگان خدا کے علاوہ مضافات کے لوگ بسوں اور ویگنوں کے ذریعہ قافلہ در قافلہ اس روح پرور اجتماع میں شرکت کرنے لگے۔

ایک روز سفیر انقلاب نے یہاں امام خمینیؒ اور ایران کے روحانی ماحول کا تعارف کراتے

ہوئے اس اجتماع کو امام خمینیؒ کا خطاب سنایا تو یاد خدا سے مسرور لوگوں کے دلوں میں جذبہ شہادت نے انگڑائی لی۔ جب سفیر انقلاب نے دعا کے دوران میں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اپنے رب سے شہادت کی دعا طلب کی تو ماحول کی کیفیت بدل گئی اور رقت انگیز ماحول میں نوجوان تڑپ تڑپ کر امام زمانہؑ کے ظہور اور اپنی شہادت کی دعا مانگنے لگے۔

قائد ملت اسلامیہ شہید مظلوم حضرت علامہ عارف حسین الحسینی رضوان اللہ علیہ، جب قیادت کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد پہلی بار لاہور تشریف لائے تو شب جمعہ کو انھوں نے کربلا گامے شاہ میں سفیر انقلاب کی خواہش پر دعائے کمیل پڑھائی۔ اس شام ہجوم اس قدر زیادہ تھا کہ تل دھرنے کو جگہ نہ ملتی تھی۔ اس ہجوم میں دعائے کمیل کے مستقل قاری بھی تھے، قائد کے عقیدت مند بھی اور وہ لوگ بھی شامل تھے جو دو قیادتوں کے درمیان تذبذب کا شکار تھے۔ برادر سید مشتاق کاظمی چنیوٹ کے بقول کہ وہ ان لوگوں کے قریب کھڑے تھے جنھوں نے علامہ عارف حسین الحسینیؒ کی قیادت کو تا حال تسلیم نہیں کیا تھا۔ جب قائد محبوب نے دعائے کمیل پڑھائی اور خدا سے مناجات کے دوران پنجتن پاکؑ کو وسیلہ بناتے ہوئے یا زہراؑ یا زہراؑ کی صدا بلند کی تو ماحول میں کہرام برپا ہوگیا۔ آپؒ کی درد بھری آواز سن کر لوگوں نے بے اختیار کہا کہ سید نے آج کربلا کے استغاثہ کی یاد تازہ کر دی ہے۔ کاظمی صاحب نے کہا کہ یہ منظر دیکھ کر قیادت کو تسلیم نہ کرنے والے لوگوں نے پنجابی زبان میں بے ساختہ کہا ''سید اسی تینوں من گئے آں کہ توں ہی بتولؑ دا پتر ایں'' (سید ہم تمھیں مان گئے ہیں کہ آپ ہی بتول سلام اللہ علیہا کے فرزند ہیں)

جب لاہور میں دعائے کمیل کے ماحول نے انقلاب پیدا کیا تو سفیر انقلاب نے آئی۔ ایس۔ او کے نوجوانوں کے ذریعہ ہر ڈویژن میں ایسے ہی روحانی پروگرام منعقد کرنے کی تجویز پیش کی۔ بعض ڈویژنز میں خود جا کر دعائے کمیل کے اجتماع کا آغاز کرایا اور ان روح پرور اجتماعات سے نوجوانوں کی کردار سازی میں تیزی پیدا کی۔

نوجوانوں کی بڑھتی ہوئی خود سازی نے جب تنظیم کو استحکام بخشا تو ڈاکٹر صاحب بے حد خوش ہوئے اور فرمایا کہ ''اب ہم ان مقاصد کے حصول میں کامیاب ہو رہے ہیں جو تنظیم کی اساس

تھے اور جن کا، ہمارا نصب العین متقاضی تھا''

افراد سازی کے دوسرے مرحلہ میں آپ نے ہفتہ وار دروس کا سلسلہ شروع کیا اور لاہور کی سطح پر اپنے ہفتہ کے تمام ایام کو دروس اور پروگرام کے لئے وقف کر دیا۔ ہفتہ وار دروس میں آپ نے تجویز فرمایا کہ آئی۔ایس۔او یا تحریک جعفریہ سے مربوط نوجوانوں کو جہاں علما کرام کی قربت کا شرف حاصل ہے وہ ان سے مستفید ہوں۔ جہاں سینئر تنظیمی ساتھی موجود ہوں وہ اپنے حلقہ میں نئے طلبا کی کردار سازی کریں اور جہاں یہ دونوں صورتیں میسر نہیں ہیں وہاں ڈویژنل عہدیدار دروس کو جاری رکھیں۔

میں گذشتہ چند سالوں سے خود بھی ایسے پروگراموں سے خاصا مستفید ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا طریقہ کار کچھ یوں تھا کہ آپ تمام برادران کو اگلی نشست کے لئے عنوان دیا کرتے تھے جس کے لئے ہفتہ بھر ہم تیاری کرتے اور بعد میں اس پر مفصل بحث ہوتی تھی۔ آپؒ کی جانب سے دیے گئے عنوانات میں عقائد، فلسفہ، نظریہ، ملکی و بین الاقوامی حالات شامل ہوتے تھے۔ ان محافل میں بعض اوقات بیٹھے بیٹھے ڈاکٹر صاحب کوئی عنوان یا منصوبہ چھیڑ دیتے تھے اور کم وقت میں زیادہ آرا لینے کے ساتھ ساتھ برادران کی ذہنی صلاحیتوں کا جائزہ لیتے تھے۔

یہ پروگرام ان سینئر برادران پر مشتمل تھا جو تنظیم کا بنیادی سفر کامیابی سے طے کر چکے تھے اور ڈاکٹر صاحب کی ان افراد سے امیدیں وابستہ تھیں۔ آپؒ کی خواہش تھی کہ ہر ڈویژن میں ایسے چند افراد کو تیار کر کے آئی۔ایس۔او کے برادران کی تربیت اور تحریک جعفریہ کو مضبوط شخصیات فراہم کی جاسکیں۔

جیسا کہ گذشتہ صفحات میں تذکرہ ہو چکا ہے کہ سفیر انقلاب کی تربیت کے کئی مدارج تھے اور وہ مرحلہ وار افراد کو آگے لاتے تھے۔ کتاب بینی اور مباحثے کی محفل سے آگے ایک اور حلقہ تھا جہاں ملت کے مسائل، تنظیمی مشکلات اور تنظیمی سفر کا جائزہ لیا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ اس محفل میں ''تحریک جعفریہ نے کیا کھویا کیا پایا۔۔۔؟'' زیر بحث تھا۔ تحریک کو جماعت اسلامی کے تقابل میں دیکھا جا رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی جمعیت علما اسلام کا سیاسی سفر بھی زیر غور تھا۔ ایسے

میں ڈاکٹر صاحب نے ہماری طرف دیکھا اور جماعت اسلامی کے تنظیمی ڈھانچہ کے بارے میں سوالات کئے تو ہم آپ کو مطمئن نہ کر سکے۔ آپ نے تعجب سے پوچھا کہ آپ لوگوں نے ابھی تک ملک کی اسلامی جماعتوں کے دستور یا منشور نہیں پڑھے۔۔۔ پھر خود چند اہم نکات پر گفتگو کرنے کے بعد تاکید فرمائی کہ آپ لوگ پہلی فرصت میں ملک کی مذہبی اور سیاسی جماعتوں کے دستور کا مطالعہ کریں۔ اس محفل میں آپ نے ایم۔کیو۔ایم کی افرادی طاقت پر بھی بحث کی اور وہاں پر موجود افراد کو ان نکات پر بحث کرنے کی دعوت دی جن کی بنا پر مہاجر قوم ایک طاقت بن کر ملک کے نظام میں دخیل کار ہوئی ہے۔

یہاں آپ نے ملک کے تمام اداروں کی اہمیت اور افادیت پر بھی غور کیا اور پھر اس موضوع پر جامع بحث ہوئی کہ کون کون سا ادارہ ملک کے نظام پر زیادہ اثر انداز ہے اور اس ادارے میں ہماری نمائندگی کیا ہے۔۔۔؟ ہمارے ساتھ یہ آپ کی زندگی کی آخری نشست تھی اس کے بعد عید کی چھٹیوں میں سلسلہ تعطل کا شکار ہوا اور پھر ہم نہیں مل سکے۔ یہ احساس تمام عمر زندہ رہے گا کہ ڈاکٹر صاحب جس معیار پر سوچتے تھے اور ان کی دور اندیش نگاہیں جہاں مرکوز تھیں وہاں تک ان کی قوت بازو یا قوت بینائی بننا وقت طلب تھا۔ آپ لمحوں میں برسوں کی اور برسوں میں صدیوں کی سوچا کرتے تھے۔

آپ نے نوجوانوں کی تربیت کے لئے مرکزی سطح پر تربیتی ورکشاپس کا سلسلہ شروع کیا۔ اگرچہ یہ ورکشاپس آئی۔ایس۔او کے زیر اہتمام ہوتی تھیں مگر درحقیقت ان کے روح رواں سفیر انقلاب ہی تھے۔ پاکستان بھر کے سینکڑوں طلبا کو ایک مقام پر اکٹھا کر کے ان کی اخلاقی، تعلیمی اور روحانی تربیت کرنا آپ کے اولین مقاصد میں شامل تھا۔ ایسی ورکشاپس میں آپ کئی کئی روز نوجوانوں کے درمیان رہتے اور ان کی صلاحیتوں کو جلا بخشنے کے ساتھ ان کے حوصلوں کو توانا بناتے۔

ایسے پروگراموں میں آپ علما کرام اور ماہرین تعلیم سے خود رابطے کرتے ان سے شرکت کی اپیل کر کے شرکت کو یقینی بناتے۔ بہتر کارکردگی کے حامل طلبا کی انعامات سے حوصلہ افزائی

فرماتے۔

ایک تربیتی نشست میں آپ نے فرمایا کہ ''اگر یہاں ایک سوافراد جمع ہیں اور وہ کسی عالم دین، ماہر تعلیم یا سینئر ساتھی سے ایک گھنٹہ کا درس لیتے ہیں تو انھیں یہ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ ان کا ایک گھنٹہ صرف نہیں ہوا بلکہ ایک سوایک گھنٹہ صرف ہوا ہے۔ یعنی ایک گھنٹہ درس دینے والے کا ایک سوگھنٹہ کا نتیجہ بھی وقت کے مطابق دیں۔۔۔کوشش فرمائیں کہ آپ کا ہر قدم خدا کی رضا کے لئے اٹھے اور آپ کی ہر سوچ ملک وملت کے لئے ہو۔''

آئی۔ایس۔او کے طلبا کے علاوہ آپ نے تحریک جعفریہ اور پاسبان اسلام کے نوجوانوں کی بھی روحانی تربیت کی اور انھیں نظریاتی سطح پر پختگی بخشی۔

افرادسازی میں آپ اس قدر مخلص تھے کہ تمام ذاتی مصروفیات ترک کر کے پروگرام میں ضرور پہنچتے۔ جعفریہ کالونی لاہور میں ہفتہ وار درس ہوتا تھا جہاں آپ وہاں کے سینئر تنظیمی برادران کو اہم موضوعات پر درس دیتے تھے۔ ایک روز جس شام آپ کا پروگرام تھا اس روز آپ کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہو گیا۔ آپ دن بھر تجہیز وتکفین میں مصروف رہے۔ شام ہوئی تو آپ پروگرام کے مطابق مقام مقررہ پر پہنچ گئے اور ساتھیوں کو حیران کر دیا۔ آپ کی اس شرکت کا اتنا اثر ہوا کہ پھر برادران نے درس میں کبھی ناغہ نہ کیا۔

دروس اور ورکشاپس کے علاوہ آپؒ نے بہت سے نوجوانوں کی ذاتی سطح پر بھی تربیت کی اور یہ تربیت خالصتاً آپ کی صحبت اور قربت کے نتیجہ میں ہوئی۔ جو شخص آپ کی قربت میں جتنی دیر رہا وہ اس قدر باشعور ہوا کہ اس نے ملت کی بھرپور خدمت کی۔

آپ اپنے ساتھیوں کو وعظ ونصیحت کم کرتے تھے جب کہ آپ کا عمل ایک بہت بڑی تبلیغ ہوتا تھا۔ آپ اپنے احباب سے بے حد محبت اور ان کی خدمت کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ کی محبت اور خدمت کو دیکھ کر بعض اوقات احباب کی پلکیں بھیک جاتی تھیں۔ ایک مرتبہ آئی۔ایس۔او کے ایک رکن حادثہ میں شدید زخمی ہوئے تو ڈاکٹر صاحب نے علاج معالجہ کے علاوہ انھیں نہلانے، کپڑے پہنانے اور بیت الخلا میں لے جانے تک کی خدمت کی۔

ایک دفعہ آپ تربیتی ورکشاپ میں تشریف لے گئے۔ آپ رات کو کمرہ سے باہر نکلے تو آپ کی نظر کھانے کی استعمال شدہ پلیٹوں پر پڑی۔ آپ نے چپکے سے سوڈیڑھ سو پلیٹیں اٹھائیں

اورانھیں ٹھنڈے پانی سے دیر تک صاف کیا۔ جب صبح کسی دیکھنے والے کی زبانی آپ کی تکلیف کا علم ہوا تو کارکنان بے حد متاثر ہوئے اور انھوں نے اپنا ہر کام خود کرنے کا عزم کیا۔

آپ اپنے بیٹوں سے زیادہ رفقا سے محبت کرتے تھے۔ آج بھی آپ کے فرزند سلمان نقوی اور دانش نقوی بتاتے ہیں کہ ''اگر بعض اوقات جب ابو ہماری بات نہ مانتے تھے تو ہم انکل کے ذریعے اپنی بات منواتے۔''

آپؒ اپنے رفقا پر اس قدر شفیق تھے کہ ان کے تمام غم خود لینے اور اپنی تمام خوشیاں انھیں دینے کی کوشش میں رہتے تھے۔ آپ اس قدر احتیاط کرتے تھے کہ بعض اوقات احباب کے درمیان کھانے کی قلت کو محسوس کرتے ہوئے ہاتھ کھینچ لیتے تھے تاکہ آپ کے ساتھی بھوکے نہ رہیں۔ آپ کے رفقا کے گھروں میں کوئی پریشانی سر اٹھاتی یا مسائل جنم لیتے تو آپ ایک گھر کے سربراہ کی حیثیت سے تمام مشکلات کو حل کرتے۔ بعض اوقات اگر کوئی تنظیمی ساتھی علاقائی مشکلات کی بدولت آپ کے ہاں آتا تو آپؒ اس کے سر کا سایہ بن جاتے۔

آپؒ کا معمول تھا کہ قریبی رفقا کو مسائل سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ مسائل کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ دیتے رہتے۔ آپ کی زندگی بھر کوشش رہی کہ ہر مصیبت میں پہلے خود قدم رکھتے۔ روایتی رہنماؤں کی طرح عقیدت مندوں یا ساتھیوں کو مصائب کی آگ میں نہ جھونکتے۔

ایک مرتبہ آپ نے اپنے ساتھیوں کو اس وقت حوصلہ بخشا جب حکومتی کمانڈوز نے برادر سید تصور حسین نقوی کو اغوا کیا جب ڈاکٹر صاحب کو اطلاع ملی کہ تصور نقوی سی۔ آئی۔ اے ہیڈ کوارٹر میں ہیں تو آپ سیدھا ایس۔ پی کے پاس گئے اور گرجدار انداز میں للکارتے ہوئے کہا ''اگر قومی معاملات میں گرفتار کرنا ہے تو میں حاضر ہوں آپ ہمارے بچوں کو اغوا اور تشدد کا نشانہ نہ بنائیں۔'' آپ کی للکار کا برا مناتے ہوئے۔ ایس۔ پی نے جواب دیا ''جب آپ کو گرفتار کرنے کا وقت آئے گا گرفتار بھی کرلیں گے اور آپ سے تفتیش بھی کریں گے۔''

جب برادر تصور نقوی کو پولیس مزید ریمانڈ کے لئے عدالت میں لائی تو ڈاکٹر صاحب دوڑ کر اپنے ساتھی کے پاس گئے اور ان سے خیریت دریافت کی۔ جب تصور بھائی نے کہا کہ ڈاکٹر

صاحب ان لوگوں نے مجھ پر بے پناہ تشدد کیا ہے تو آپ نے بے ساختہ کہا ''ذہنی طور پر پھر تیار ہوجاؤ یہ اور بھی ماریں گے۔ یہ وقت حوصلے سنبھالنے کا ہے حوصلے ہارنے کا نہیں۔''

یاد رہے کہ برادر تصور نقوی ۲ مئی ۱۹۸۵ کو انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور کے ہاسٹل میں ہونے والے بم دھماکہ میں شدید زخمی ہوئے تھے جبکہ دو امامیہ برادران سید تنصیر حیدر اور راجہ محمد اقبال نے جام شہادت نوش کیا تھا۔ یہ بم دھماکہ اس وقت ہوا تھا کہ جب آئی۔ایس۔او کے برادران لٹن روڈ لاہور پر امام خمینیؒ کے عرب نمائندہ سید مہدی الحکیم (جنھیں سوڈان ہوٹل میں شہید کر دیا گیا) کا خطاب سن کر اپنے کمروں میں واپس لوٹے تھے۔ امامیہ برادران نماز ادا کر رہے تھے کہ ایک نامعلوم شخص نے دروازہ کھول کر دستی بم پھینکا تھا۔

یہ بات ملک کے حساس اداروں کے ذہن میں ٹھونس دی گئی تھی کہ ملت جعفریہ کے نوجوانوں کی کردار سازی ڈاکٹر محمد علی نقوی کرتے ہیں اور وہ ایک ایسا ذہن ہے جو انقلاب کی راہیں تراشتا ہے۔ مارشل لا دور یا اس کے بعد کے ظالمانہ دور میں جب بھی پولیس نے ملت جعفریہ کے نوجوانوں کو تشدد کا نشانہ بنایا انھوں نے طلبا سے ڈاکٹر محمد علی نقوی کے بارے میں ضرور پوچھا۔

ایک مرتبہ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے طلبہ گرفتار ہوئے تو پولیس نے ان سے ڈاکٹر صاحب کی سرگرمیوں کے بارے میں سوالات کیے جب یہ نوجوان تحریک جعفریہ کے دفتر لوٹے تو ڈاکٹر صاحب بالائی منزل پر بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے جب رہا شدہ برادران کی خیریت دریافت کی تو انھوں نے پورا ماجرا سنایا کہ پولیس آپ کے بارے میں تفتیش کرتی تھی'' یہ سن کر ڈاکٹر صاحب قدرے طیش میں آئے اور فرمایا ''بدبختوں کی حالت دیکھو میرے بارے میں اگر کچھ معلوم کرنا ہے تو مجھ سے کریں دوسروں سے معلوم کرنے سے انھیں کیا ملے گا۔ یہ لوگ جرأت سے خالی ہیں خواہ مخواہ ہمارے معصوم طلبا کو ہراساں کرتے ہیں۔''

آپ روایتی رہنماؤں کی طرح اپنے عقیدت مند نوجوانوں کو مصائب میں تنہا نہیں

چھوڑتے تھے بلکہ ان کی ایک ایک پل کی خبر لیتے تھے۔ نوجوانوں کی تعلیم اور روزگار میں مثالی تعاون کرتے تھے۔ تعلیمی میدان میں کوئی سر اٹھاتا تو آپ اس کے حل تک چین سے نہ بیٹھتے اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کو روزگار کے مسائل آڑے آتے تو آپ حتی المقدور اس کی ملازمت کا بندوبست کرتے۔ ایک عام ملازمت سے اعلیٰ ملازمت تک کے حصول کے لئے آپ نوجوانوں کی بھرپور مدد کرتے۔ آپ کے دفتر میں بے روزگار نوجوانوں کے کاغذات موجود رہتے تھے جہاں بھی آپ کا بس چلتا اور جہاں تک چلتا آپ سعی فرماتے۔ ایک مرتبہ آپ نے لاہور کے پرائیویٹ اداروں کے شیعہ اعلیٰ افسران کو مقامی ہوٹل میں دعوت دی۔ جس میں مختلف فیکٹریوں کے بارہ منتظم اور سربراہ شامل ہوئے آپ نے انھیں اپنی قوم کی بے روزگاری سے آگاہ کیا۔ جس کے بعد ان افسران نے تقریباً دو سو افراد کو روزگار فراہم کیا۔

مجھے یاد ہے کہ جب مجھے لاہور میں نوکری کے حصول کے لئے ایک فوجی افسر کی سفارش درکار ہوئی تو ڈاکٹر صاحب نے ایک صبح مجھے ملٹری اسپتال بھیجا جہاں مجھے ایک بریگیڈیئر سے ملنا تھا۔ جونہی میں نے ان کے آفس میں چٹ بھیجی تو انھوں نے مجھے اندر بلا لیا پرتپاک طریقہ سے ملے اور کہنے لگے کہ آپ نے تاخیر کی ہے میں ایک گھنٹہ سے آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔ تم ایک ایسے شخص کے عزیز ہو جس کے کام میں سستی کرنا گناہ ہے۔''

میری ملازمت کا دوسرا دور شیخ زید اسپتال لاہور تھا جہاں مجھے ڈاکٹر صاحب انگلی پکڑ کر لے گئے تھے۔ انھوں نے اپنے ہاتھوں سے میرے کاغذات جمع کرائے اور میں ان کی عنایات کی بدولت دو سال تک یہاں کام کرتا رہا۔ یہاں ایک مرحلہ ایسا بھی آیا کہ کچھ عناصر ہمارے پیچھے پڑ گئے جب میں نے ڈاکٹر صاحب پر صورت حال واضح کی تو انھوں نے مجھے بتائے بغیر ان عناصر تک رسائی حاصل کی اور ان سے دبنگ طریقہ سے کہا کہ'' وہ ہمارے بھائی کے خلاف اپنی سازشیں سمیٹ لیں۔''

آپ بے روزگار نوجوانوں کو دیکھ کر مغموم ہوجاتے اور اکثر فرماتے کہ ''ان کا وقت ضائع ہو رہا ہے'' ایک مرتبہ آئی۔ایس۔او کے مرکزی دفتر میں آئے تو آٹھ دس نوجوان چادریں تانے سو

رہے تھے۔آپ نے اپنے ساتھی سے کہا کہ انھیں جگادیں۔جب تمام برادران جاگ بیٹھے تو آپ نے مزاح کیا کہ ''نکمے سوئے ہوئے ہواٹھو کام کرو۔'' آپ نے ان نوجوانوں کی خیریت دریافت کی اور تعلیمی صورت حال کے بارے میں بھی استفسار کیا۔جب آپ کو معلوم ہوا کہ تقریباً تمام کے تمام بے روزگار ہیں تو آپ خاصے رنجیدہ ہوئے۔کمرے سے باہر نکلے تو اپنے ساتھی سے کہا کہ ان تمام احباب کے کاغذات دفتر لے آئیں آپ نے اس مسئلہ کو نہایت سنجیدگی سے لیا اور ان برادران کو مختلف ملازمتوں میں کھپادیا۔

بہت سے احباب ایسے بھی ہوتے تھے جو معمولی ملازمتوں کو انا کا مسئلہ بنالیتے تھے مگر آپ فرماتے ''بہتر میں رہ کر بہترین کی کوشش کریں'' بے روزگاری میں وقت ضائع ہوتا ہے جبکہ آپ کسی ادارہ میں رہ کر بہت کچھ سیکھ لیتے ہیں ایک دوست بار بار آپ پر واضح کرتا تھا کہ اس کی ملازمت اس کے معیار اور تعلیم کے مطابق نہیں ہے جس سے اس کی عزت نفس مجروح ہوتی ہے آپ نے فرمایا ''عزیز دوست عزت اتنی سستی نہیں ہے جسے آپ ناک پر رکھ کر پھرتے رہیں۔'' آپ کے بقول جو آج آپ کی انا مجروح ہورہی ہے یہ بھی زندگی کے تجربات کا حصہ ہے۔انا کو جتنا ختم کروگے اتنا آگے بڑھوگے۔''

ایک مرتبہ جھنگ کا ایک نوجوان آپ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ ''ڈاکٹر صاحب میرے حالات ناسازگار ہیں اگر آپ مجھے رہائش مفت دلوادیں تو میں مزدوری کرکے یہاں گزارہ کرلوں گا'' آپ نے ایک دوست کا مکان اسے دلوایا اور ایک روز اس کی موجودگی میں چند احباب سے کہا کہ میرے زیر تعمیر کلینک کی دیواروں پر پانی ڈالنے اور دروازے وغیرہ رنگ کرنے کے لئے مزدور کی ضرورت ہے۔آپ کی بات سن کر اس نوجوان نے حامی بھرلی جب آپ دوسری صبح کلینک پہنچے تو اس نوجوان کو کام میں مصروف پایا۔آپ اسے دیکھ کر ایک لمحہ کے لئے حیران ہوئے اور تھوڑی دیر بعد اسے شاباش دی اور ساتھ ہی اپنے رفقاء کو بتایا کہ ''یہ نوجوان ترقی کرے گا۔یہ پڑھا لکھا ہے اور سادات گھرانے سے تعلق رکھتا ہے لیکن اس نے مزدوری کو انا کا مسئلہ نہیں بنایا بلکہ اپنے جد کی سنت پر عمل کرکے ہمیں درس دیا ہے۔''

اس واقعہ کے بعد آپ خاصے متاثر ہوئے اور پھر ہر بے روزگار نوجوان کو یہ واقعہ سنا کر کام کرنے کی ترغیب دیتے رہے۔آپ کا معمول تھا کہ آپ دور دراز علاقوں سے لاہور آئے ہوئے نوجوانوں کو رہائش اور جیب خرچ تک دیتے مگر ان پر واضح کرتے کہ وہ یہاں ٹیوشن پڑھائیں یا ملازمت تلاش کریں البتہ گھروں کو واپس نہ لوٹ جائیں کیونکہ وہاں وہ ہر طرح سے ناکارہ ہوجائیں گے۔

آپ نے نوجوانوں کی ہر سطح پر مدد کی، اخلاقی اور مالی امداد کے علاوہ آپ نے شادیاں تک کرائیں۔آج بیسوں افراد ایسے ہیں جو لاہور میں سفیر انقلاب کی شفقت کی بدولت برسر روزگار اور صاحب خانہ ہیں۔

مردم شناسی کا فن بھی خدا نے آپ کو حیران کن حد تک بخشا تھا۔آپ چہرے کے تیور پڑھ کر دلوں کے معاملات کا اندازہ لگالیتے تھے۔آپ اپنے رفقا کی صلاحیتوں، مزاج، فطرت اور توکل سے کماحقہ واقف تھے۔آپ ہر شخص کو اس کی استطاعت اور فطری مزاج کے مطابق کام بتاتے البتہ افراد سازی میں آپ ہر نوجوان کو مرحلہ وار تیار کرکے کامیابیوں کے مدارج میں لاتے۔آپ ایسے نوجوانوں کو بھی تنظیمی محفلوں میں لے آتے جو بالکل خاموش بیٹھے رہتے تھے مگر آپ ان کے بارے میں فرماتے اگر یہ نوجوان رہنمائی نہیں کررہے تو کم از کم سن تو رہے ہیں کہ ترقی کے راستے کونسے ہیں۔حیات کا مقصد کیا ہے۔زمانہ کہاں سے کہاں تک پہنچ گیا اور ہماری قومی ذمہ داریاں کیا ہیں۔۔۔؟

آپ کی خواہش تھی کہ آپ کے تنظیمی رفقاء ہر لحاظ سے جامع شخصیت ہوں۔آپ نوجوانوں کے والدین سے کہیں زیادہ سرپرستی فرماتے تھے۔یہاں تک کہ آپ گفتگو کے انداز تک کا جائزہ لیتے۔ایک دفعہ لاہور میں ایک مرکزی رہنما نوجوان نے طلبا کو درس دیا جس میں ڈاکٹر صاحب بھی موجود تھے۔درس کے اختتام پر آپ نے خطاب کرنے والے رفیق کی گفتگو پر علیحدگی میں عدم اطمینان کا اظہار فرمایا۔رفیق سے کہنے لگے کہ ''آپ گھنٹہ بھر کی گفتگو کا نتیجہ نہیں نکال سکے'' آئندہ اپنی گفتگو کو نتیجہ خیز بنانے کی کوشش کریں۔''

آپ کے بتائے گئے چند اصولوں پر عمل کرتے ہوئے جب اس نوجوان نے کئی ایک

مقامات پر موثر گفتگو کی تو آپ نے نہ صرف اس کی حوصلہ افزائی فرمائی بلکہ بعض محافل میں ان کے خطاب کو سراہا۔

ایک دفعہ خانہ فرہنگ ایران لاہور میں ایران کے وزیر تعلیم اور ان کے ساتھ اعلیٰ وفد پاکستان کے دورے پر آیا تو آپ نے ان سے ملاقات کا پروگرام ترتیب دیا۔ آپ اپنے ساتھ طلبا کا اہم وفد لے کر ان کے ہاں پہنچے۔ کئی گھنٹوں تک ان سے مختلف تعلیمی موضوعات اور نظام تعلیم پر گفتگو ہوئی۔ آئی۔ ایس۔ او کے سابق مرکزی صدر برادر ڈاکٹر عامر رضا دستی نے انگریزی میں بڑے اعتماد اور روانی سے گفتگو کی تو ڈاکٹر صاحب بہت خوش ہوئے۔ واپسی پر راستہ میں ان کی بھرپور حوصلہ افزائی فرمائی اور ساتھ ہی ہمیں تاکید بھی کی کہ آئندہ سے آپ لوگ انگریزی اخبارات کا مطالعہ کریں۔

آپ کی خواہش ہوا کرتی تھی کہ تنظیمی نوجوان اپنے سے بہتر افراد کے ساتھ زندگی گزاریں اور بہتر ماحول میں پروان چڑھیں۔ آپ کی ''وصیت'' میں بھی یہی تاثر آپ کے فکر کی عکاسی کرتا ہے آپ مسلسل اس جہد میں رہے کہ قوم کے سپوت خوش بخت بنیں اور وہ کردار اور معیار کے حوالہ سے دیگر نوجوانوں سے ممتاز ہوں۔

آپ کا معمول تھا کہ آپ تنظیم کے چند معتمد نوجوانوں کو بڑی بڑی شخصیات سے ملاقات کے لئے اپنے ساتھ لے جاتے۔ کئی بار ہمیں بھی آپ کے ساتھ ملکی و غیر ملکی انتہائی اعلیٰ شخصیات سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ بعض دفعہ ہم گفتگو سے محظوظ بھی ہوئے اور بعض اوقات بوریت کا شکار بھی۔۔۔ مگر آہستہ آہستہ ہم پر یہ عقدہ کھلتا گیا کہ ڈاکٹر صاحب ہمارے معیار کو بلند اور ہماری برین واشنگ (Brain Washing) کر رہے ہیں۔

ایک دفعہ لاہور کے معروف معالج ڈاکٹر سہیل صاحب نے ماڈل ٹاؤن میں اپنی رہائش گاہ پر پولیس کے اعلیٰ حکام بھاری بھرکم سیاسی شخصیات اور صحافی حضرات کو عشائیہ دیا جس میں سفیر انقلاب کے ایک تربیت یافتہ نوجوان نے بھی اپنے ایک صحافی دوست کے ہمراہ شرکت کی۔ ان ایام میں ''فرقہ واریت'' پولیس اور حساس اداروں میں خاصی تشویشناک تھی اس لئے وہاں بیٹھے

بیٹھے یہ عنوان موضوع گفتگو بن گیا۔ ڈی۔ آئی۔ جی اسپیشل برانچ تنویر حمید مرحوم بڑے دلائل کے ساتھ تحریک جعفریہ اور مخالف تنظیم کی کارکردگیوں پر بات کر رہے تھے جبکہ کچھ لوگ لاعلمی اور بعض افراد خوشامدانہ لہجے میں ''جناب بجا فرما رہے ہیں'' کہہ رہے تھے کہ ایک مرحلہ پر جب سفیر انقلاب کے رفیق کو بات کرنے کا موقع ملا تو انھوں نے تحمل اور دلائل کے ساتھ اس قدر وزنی گفتگو کی کہ وہاں پر موجود شخصیات نوجوان کا منہ تکنے لگیں۔ اس برادر نے اپنی گفتگو کے دوران کئی بار معترض افراد سے اپنے موقف کا اعتراف کرایا اور بے ساختہ داد حاصل کی۔ کھانے کے اختتام پر جب ڈی۔ آئی۔ جی نے نوجوان کا تعارف چاہا تو وہاں پر موجود تحریک جعفریہ کے مخالف، نام نہاد شیعہ مذہبی رہنما نے کہا یہ آئی۔ ایس۔ او کا چھوکرا اور ڈاکٹر نقوی کا چیلہ ہے'' محفل برخاست ہونے لگی تو تنویر حمید نے نوجوان کی صلاحیتوں کو سراہتے ہوئے اس سے دوبارہ ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ جبکہ ڈاکٹر سہیل صاحب نے اپنے ایک دوست سے کہا کہ میری زندگی کا یہ پہلا نوجوان تھا جو بھاری بھرکم شخصیات کے درمیان، انتہائی ادب، تحمل اور احتیاط کے ساتھ بولا۔ اس نے کم وقت میں نظریہ اور دہشت گردی۔۔۔ حقائق اور سازشوں کا آئینہ دکھا کر ہمیں متحیر کر دیا ہے۔''

سفیر انقلاب کے نظریاتی برادران جہاں جہاں بھی موجود ہیں اپنے کردار، افعال اور ذہنی معیار کا ایک وزن رکھتے ہیں۔ بہت سے افراد اس بات سے آگاہ تھے اور ہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے ایک فوج تیار کی ہے جو اسلامی نظریات کی سلطنت کی محافظ ہے یہی وجہ ہے کہ آج کسی کو بھی اس سلطنت پر جارحیت کرنے کی جرات نہیں ہے۔

ملک بھر میں پھیلے ہوئے باشعور اور حق پرست نوجوان کسی لمحہ کی پیداوار نہیں بلکہ ان پر ڈاکٹر صاحب کے ماہ و سال صرف ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی میں ہر نوجوان کو کئی مراحل سے گزار کر نکھارا ہے۔ نوجوان خود اس بات کے شاہد ہیں کہ سفیر انقلاب نے انھیں جست یا پیتل سے سونا اور سونے کو کندن بنایا ہے۔

آپ کا معمول تھا کہ ہر نوجوان سے اس کے معیار کے مطابق گفتگو کرتے اور غیر محسوس انداز میں اسے تیار کرتے۔ آپ کی کوشش ہوتی تھی کہ ملت کا ہر نوجوان زیادہ سے زیادہ علم حاصل

کرے اور اپنے ذہنی معیار کو بلند کرے، ایک مرتبہ آپ کے دفتر میں کام کرنے والے ایک ساتھی نے آپ کے ساتھ شہید قائد کی برسی پر ''پیواڑ'' پارا چنار جانے کی خواہش ظاہر کی تو آپ نے مشروط طور پر لے جانے کا وعدہ کیا۔ آپ نے شرط یہ عائد کی کہ وہ نوجوان وہاں پر موجود تمام تنظیمی برادران کو ''کمپیوٹر'' کے بارے میں مکمل معلومات فراہم کرے گا۔

شرط پر رضامندی کے بعد اس ساتھی نے دو تین روز میں کمپیوٹر کے متعلق خوب تیاری کی ان کا کہنا ہے کہ اس نے دو تین دنوں میں ایسی ایسی معلومات اکٹھی کیں جو ایم۔ایس۔سی تک اسے حاصل نہ تھیں۔ دورانِ سفر ڈاکٹر صاحب نے اس ساتھی سے گاڑی میں موجود احباب کو لکچر دلوایا اور ''پیواڑ'' جا کر بھی اعادہ کرایا۔

آپ عموماً تنہا سفر کرنے سے گریز کرتے تھے آپ کی خواہش ہوتی تھی کہ کوئی نوجوان آپ کا ہمسفر رہے۔ بعض اوقات سفر پر روانگی سے قبل آپ اپنے ساتھی پر واضح کرتے کہ وہ دورانِ سفر آپ کو ''فلاں'' عنوان پر لکچر دے اس طرح آپ کا ہمسفر خود بھی مطالعہ کرتا اور آپ کی معلومات میں بھی اضافہ کا باعث بنتا ہے۔

آپ کی گاڑی میں بھی ایک آدھ کتاب ضرور پڑی رہتی تھی آپ گاڑی چلاتے تو ساتھ والے دوست سے کتاب پڑھ کر سنانے کی خواہش کرتے۔ چونکہ آپ پیشہ وارانہ طور پر ماہر نفسیات بھی تھے اس لئے آپ ایک پل کے لئے بھی ہمسفر کو اکتانے نہ دیتے۔ خوب مزاح کرتے ہنستے اور ہنساتے مگر تہذیب کا دامن کبھی بھی آپ کے ہاتھوں سے نہ چھوٹ پاتا۔ آپ کی ہر ادا ایک پیغام اور ہر بات ایک درس ہوا کرتی تھی۔

آپ کا دستور تھا کہ آپ انگریزی اخبار یا کسی لٹریچر میں کوئی معلوماتی مضمون پڑھتے تو اس کی فوٹو کاپی یا کٹنگ لے لیتے اور اسے متعلقہ نوجوانوں تک پہنچاتے۔ آج بھی کئی نوجوانوں کے پاس آپ کے دیئے ہوئے تراشے موجود ہیں آپ حضرت علی علیہ السلام کے فرمان کو اکثر دہرایا کرتے تھے کہ ''علم ہماری میراث ہے جہاں سے ملے حاصل کرو'' ایک مرتبہ آپ نے مجھے انگریزی اخبارات ہفت روزہ تکبیر، ہفت روزہ زندگی پڑھنے کی تاکید فرمائی تو میں نے واضح کیا کہ ''

ڈاکٹر صاحب اتنا وقت اور پیسہ نہیں ہے۔'' آپ نے فرمایا ''وقت آپ نکالیں لٹریچر کے اخراجات ہم برداشت کریں گے'' مگر اس شرط کے ساتھ کہ آپ نے Out Put دینا ہے۔ یہاں انھوں نے حوصلہ دیتے ہوئے فرمایا ''یاد رکھو! کہ میدان صحافت کے نامور بزرگ صحافی جن کا آج ملک میں طوطی بولتا ہے تمھاری عمر میں اتنے اچھے لکھاری نہ تھے۔ انھوں نے محنت کی ہے۔ آپ لوگ محنت کریں ہمیں اپنی قوم میں مشاہد حسین، صلاح الدین، مجیب الرحمن شامی اور ارشاد حقانی وغیرہ چاہئیں۔''

ایک دفعہ میں آپ کے ساتھ راولپنڈی جا رہا تھا۔ دورانِ سفر آپ نے اپنے بریف کیس سے ہفت روزہ ''زندگی'' لاہور نکالا اور اس میں رؤف طاہر کی لکھی ہوئی ایک رپورٹ دکھائی جو سانحہ پنجاب یونیورسٹی (جو آئی۔ایس۔او اور اسلامی جمعیت طلبہ کے درمیان رونما) ہوا کے بارے میں تھی جس میں آئی۔ایس۔او پر خاصی تنقید کی گئی تھی۔ آپ نے فرمایا کہ اس صحافی نے نہایت احتیاط کے ساتھ اپنا موقف بیان کیا ہے اور ہم پر جامع تنقید کی ہے۔ آپ اس کے انداز پر غور کریں اور اسی انداز میں اپنا موقف اپنے رسائل میں پیش کریں۔

بعض اوقات ملکی اخبارات میں کام کرنے والے چند احباب کے بارے میں آپ کا دل کڑھتا تھا آپ فرماتے تھے کہ یہ لوگ صرف اپنا پیٹ پال رہے ہیں۔ آج تک ادارتی صفحات، میگزین وغیرہ میں ان کے مضامین کبھی شائع نہیں ہوئے نہ انھوں نے اپنے قلم سے مسلمانوں تک اپنی فکر پہنچائی ہے۔

آپ بریفنگ دینے اور لینے کو خاصی اہمیت دیتے تھے۔ آپ کہتے تھے کہ علم تقسیم (Knowledge Share) کرنے سے انسان ترقی کی منزل طے کرتا ہے۔ آپ فطرتاً "Maximum Gain And Minimum loss" (زیادہ سے زیادہ حصول اور تھوڑے سے تھوڑا ضیاع) کی پالیسی پر عمل پیرا تھے۔ آپ اپنے ذہن میں جتنا بڑا منصوبہ تیار کر کے بیٹھے ہوتے تھے پھر بھی معتمد رفقا سے مشورہ ضرور کرتے۔ آپ حضرت امام حسن علیہ السلام کے فرمان ''بے صبری سے زیادہ نقصان دہ اور مشاورت سے زیادہ فائدہ مند کوئی چیز نہیں ہوتی'' کی اطاعت کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کا سینہ معلومات کا خزینہ تھا۔ آپ پیشہ وارانہ طور پر

ڈاکٹر تھے مگر زندگی کے ہر شعبہ کے بارے میں آپ کو خاصی معلومات حاصل تھیں۔

آپ کی خواہش تھی کہ تحریک جعفریہ پاکستان اپنا ایک سیکرٹریٹ بنائے جس میں تمام شعبہ ہائے زندگی کے ماہرین موجود ہوں اور ان سے استفادہ کیا جائے۔

آپ کو یہ شکوہ بھی رہا کہ تحریک جعفریہ افراد پیدا نہیں کر رہی آپ کہا کرتے تھے کہ آئی۔ایس۔او۔ نے ہزاروں نوجوان تیار کیے ہیں مگر شومئی قسمت کہ وہ تحفظ کی چھتری نہ ملنے کے باعث معاشرہ میں تقریباً بے سمت زندگی گزار رہے ہیں۔ جبکہ اس کے برعکس جماعت اسلامی نے اسلامی جمعیت طلبہ کے تربیت یافتہ نوجوان جذب کیے ہیں۔ جو اس وقت جماعت کے روح رواں ہیں۔ آپ دعویٰ کیا کرتے تھے کہ ''ہم باب العلم'' کے پیروکار ہیں ہمارا ذہنی معیار دیگر تمام مکاتب فکر سے بلند ہے مگر ہمارے نوجوان تنظیم "Set Up" نہ ہونے کی وجہ سے آج دو دو تین تین ہزار کے لئے اپنی صلاحیتیں زنگ آلود کر رہے ہیں۔ ہمارے نوجوان کے ذہن سے معاشرے کا عام تاجر تو فائدہ حاصل کر رہا ہے مگر ہماری قوم محروم ہے۔

جنوری ۱۹۹۴ میں سفیر انقلاب نے معتمد نوجوانوں کے ایک گروہ کو اکٹھا کیا اور ان سے اس خواہش کا اظہار فرمایا کہ ''وہ قومی فلاح بالخصوص تعلیم کے میدان میں کام کریں، اسکول اور ادارے سنبھالیں، کم از کم ہر تحصیل میں اسکول قائم کریں اور سرکاری ملازمتوں کا خیال ترک کر دیں۔'' اسلامک ایجوکیشن کونسل'' انھیں سرکاری اداروں سے زیادہ مراعات دینے کو تیار ہے۔'' گفتگو کے دوران میں ایک دوست نے سرکاری ملازمت کی پنشن کا ذکر کیا تو آپ نے جواباً کہا کہ اسلامک ایجوکیشن کونسل نہ صرف آپ کو پنشن دے گی بلکہ آپ کی بیمہ پالیسی کا اجرا بھی کرے گی تاکہ کسی بھی حادثاتی موڑ پر آپ کے پسماندگان کو معقول رقم مل سکے۔''

آپ کے قومی درد اور خلوص کی بنا پر تمام احباب قومی فلاح کے لئے کام کرنے پر آمادہ تھے مگر ہر شخص یا تو یہ سمجھتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب پانی کے سینے پر تیرتا ہوا ایک بلبلہ ہیں جن کے بعد انھیں سہارا دینے والا کوئی نہ ہوگا۔

آج بھی تحریک جعفریہ اور امداد فاؤنڈیشن کے مرکزی دفاتر میں آپ کے ہاتھوں سے

بنے ہوئے قومی اداروں کے نقشے، فلاحی شعبے، انتظامی ڈھانچے اور ملازمین کے تنخواہ اسکیل وغیرہ موجود ہیں جو اس بات کا احساس دلاتے ہیں کہ ایک شخص اپنی قوم کے لئے دل میں درد کا طوفان رکھتا تھا، وہ تنہا حکومتوں جتنے کام کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنی ذات میں کائنات تھا اس کا نظریہ تھا۔

ڈوبتے ڈوبتے کشتی کو اچھالا دے دوں
میں نہیں کوئی تو ساحل پہ اتر جائے گا

یوں تو آپ اپنی قوم کے ہر نوجوان سے محبت کرتے تھے مگر متقی اور ذہین نوجوانوں سے آپ کو عشق تھا۔ جب بھی تنظیمی عہدہ کے لئے کسی متقی نوجوان کا انتخاب ہوتا تو آپ بے حد خوش ہوتے اور فرماتے الٰہی تنظیم کے لئے خدا سے محبت کرنے والے افراد کا چناؤ خوش آئند ہے۔ فطرت کے میلان کے باعث آپ کو آئی۔ایس۔او کے سابق مرکزی عہدیداران جو دین کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے ایران میں زیر تعلیم ہیں سے بے حد محبت تھی یہاں تک کہ یہ برادران جب بھی کسی محفل میں آتے تو ڈاکٹر صاحب ان کا اٹھ کر استقبال کرتے۔ ان برادران کے ایران سے جب ڈاکٹر صاحب کو خطوط آتے تو آپ یہاں دروس کی محفلوں میں وعظ پڑھ کر سناتے اور نہایت پرمسرت انداز میں برادران کی تعریف کرتے۔

ایک مرتبہ ایران سے برادران کا ایک خط آیا جس میں چند برادران کے درس خارج میں پہنچنے کا تذکرہ تھا۔ آپ یہ خط پڑھ کر بے حد خوش ہوئے اور کئی مقامات پر تذکرہ فرمایا اور دعا دی۔ آپ کے ان تاثرات سے یوں لگتا تھا جیسے آپ طویل مسافت کے بعد منزل کے قریب پہنچ گئے ہیں۔

بڑے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ سفیر انقلاب بیک وقت نوجوانوں کے بھائی، مہربان اور والدین جیسے مشفق تھے۔ انھوں نے نوجوانوں کو خدا کی سمت جانے والے راستوں سے آگاہ کیا، انھوں نے محمدؐ و آل محمد علیہم السلام کی شفاعت کی راہوں کی رہنمائی کی۔ انھوں نے کسی تنظیمی بھائی کے شباب کو بے لگام نہ چھوڑا، انھوں نے نوجوانوں کو پستیوں سے اٹھا کر بلندیوں پر سوار کیا، آپ تعلیم و تربیت میں کئی نوجوانوں کا سہارا بنے اور آپ نے کئی پردیسی نوجوانوں کی کفالت کی۔

لاہور میں مجھ سمیت کئی برادران ایسے ہیں جنھوں نے اپنے آشیانے ڈاکٹر صاحب کی

شفقت اور سرپرستی کے سہارے آپ کے گھر کے قریب بنائے ہوئے ہیں۔

بارہویں جماعت کے نصاب میں انگریزی کی ایک کہانی ''سمندری بگلے کی پہلی اڑان''

(First Flight of Sea-Gull) کا خاکہ اگر کسی قاری کے ذہن میں ہے تو وہ میری اس بات کو گہرائی تک سمجھ سکتا ہے کہ سفیرانقلاب نے بہت سے نوجوانوں کو پہلی پرواز دی، انھیں فضا میں اڑایا، انھیں اعتماد دیا، ان کے سینے میں اڑان کا درد اور پرواز میں فتح کی چھنکار بخشی۔ یہی وجہ ہے کہ آج ملک کی فضاؤں میں سفیرانقلاب کے نوجوانوں کی اڑان کا شور موجود ہے۔

سفیرانقلاب نے کئی افراد کو اپنے زخمی ہاتھوں سے اتنا بلند تعمیر کیا کہ اگر وہ نیچے اپنے نقطہ اساس کو دیکھیں تو ان کے حواس پگھلنے لگتے ہیں۔ بہت سے احباب کا خیال ہے کہ ماں نے انھیں انسان جنا۔۔۔ تنظیم نے انھیں انسان بنایا۔۔۔ اور ڈاکٹر صاحب نے انھیں انسانیت اور تہذیب سکھائی۔۔۔۔

انسانی فطرت ہے کہ وہ دنیاوی مشکل حالات کا سامنا کرنے کے لئے سرمایہ اکٹھا کرتا ہے، اپنے بچوں کے لئے جائیدادیں بنانے کی کوشش میں رہتا ہے، اپنے بڑھاپے کے سہارے کے لئے پونجی بچاتا ہے مگر سفیرانقلاب نے اپنی زندگی میں دو اثاثے جمع کیے ہیں ایک ''اعمال'' جو وہ اپنے ساتھ لے گئے ہیں دوسرے ''نوجوان'' جنھیں وہ قوم کے لئے چھوڑ گئے ہیں۔ شاید آپ نظریاتی فوج کو دیکھ کر یقین سے کہا کرتے تھے۔

ہمیں خبر ہے کہ ہم ہیں چراغ آخر شب
ہمارے بعد اندھیرا نہیں اجالا ہے

☆☆☆☆☆

سفیر انقلاب اور سامراج

۱۴ اگست ۱۹۴۷ کو برصغیر کی کوکھ سے جنم لینے والے معصوم پاکستان کو جو پہلی بیماری لاحق ہوئی وہ امریکی مداخلت کا سرطان تھا جو غیر محسوس انداز میں "Blood Cancer" کی شکل اختیار کر گیا۔ اگرچہ بانی پاکستان حضرت محمد علی جناحؒ اور ان کے چند ساتھیوں نے ملک کی قوت مدافعت بڑھانے اور فوری مرض سے بچنے کے لئے جتن کیے مگر لیاقت علی خان کے قتل کے بعد ملکی وجود ضعف کا شکار ہوا اور موذی مرض غالب آ گیا یہاں تک کہ وہ رفتہ رفتہ ناسور بن گیا۔

۲۴ سال بعد ملک کے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے اپنی حکمت عملی کے تحت اس سرطان کا علاج کرنے میں بڑے بڑے پاپڑ بیلے مگر وہ نہ صرف ناکام رہے بلکہ خود بھی اس بیماری کی زد میں آ کر اپنی جان بھی گنوا بیٹھے۔

۵ جولائی ۱۹۷۷ کو بھٹو کی معزولی اور پھر پھانسی کے بعد امریکی مداخلت پاکستان کی روح بن گئی جسے چھیڑنا ملکی بقاء کے خطرے کے مترادف ٹھہرا۔ اس دوران میں پاکستان امریکی ریاست کے روپ میں آیا اور یہاں امریکی سفیر نے بطور وائسرائے حکومت کی جس کا سلسلہ تاحال جاری ہے۔ بدقسمتی سے اس زمانہ میں امریکہ نے پاکستان کو اپنی چھاؤنی کے طور پر استعمال کر کے روس سے ٹکر لی اور افغانستان اور روس کی جنگ کو تاریخ کے دامن میں پھینکا۔ جس کی

وجہ سے افغانستان کے لاکھوں مسلمانوں کا خون بہا، ملک کا شیرازہ بکھرا اور پاکستان کا جمہوری وسیاسی استحکام تباہ ہوا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب پاکستان کے عوام ملک پر طاری مارشل لا کے اندھیروں میں سسک رہے تھے انھیں دور دور تک روشنی کی کوئی کرن نظر نہ آتی تھی جبکہ امریکی اس تاریکی سے مزید فائدہ اٹھاتے ہوئے ملکی نظام کی بنیادیں کھوکھلی کرنے میں مصروف تھا۔ اس صورتحال کا جائزہ لیتے ہوئے حریت پسند شاعر جناب حبیب جالب مرحوم نے لکھا تھا۔

کوئی تو پرچم لے کر نکلے چاک گریباں کا جالب
چاروں طرف سناٹا ہے دیوانے یاد آتے ہیں

یقیناً ایسے ماحول میں جہاں جینا مرنے سے زیادہ مشکل تھا کوئی دیوانہ ہی آگے آ سکتا تھا یا اگر ملک کا کوئی حقیقی مخلص اور ہمدرد آگے بڑھتا تو اسے دیوانہ ہی سمجھا جاتا۔۔۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ عین اسی دوران میں پاکستان کے پڑوس میں انقلاب اسلامی کی تحریک کامیاب ہوئی۔ شہنشاہ اپنا صد سالہ تاج عوام کے قدموں میں چھوڑ کر بھاگا۔۔۔ ایران کے غیور عوام نے شہنشاہیت کے تاج اتارے اور تخت اچھالے۔۔۔۔ سلاسل کی سلاخیں ٹوٹیں تو آزادی کا علم تھامے، ایک درویش منش اور بوریا نشین انسان، امریکی تخت وتاج کو تاراج کرنے کے لئے آگے بڑھا۔۔۔ نور نے صدیوں پر محیط ظلمتوں کی تاریکیوں کا سینہ چیرا۔۔۔ شفق کے رنگ بکھرے۔۔۔ صنم کدوں میں اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہوئیں تو ہوا کے دوش پر نور کی کرنیں اور تکبیر کی گونجیں، پاکستان پہنچیں۔

یہاں کے ہر شخص اور ہر جماعت نے اپنے اپنے ادراک کے مطابق انقلاب اسلامی ایران کا جائزہ لیا۔ البتہ آئی۔ایس۔او پاکستان نے انقلاب اور روح انقلاب کو خوش آمدید کہنے کے لئے استقبالی جلوس نکالا جس میں پہلی بار ملک کی شاہراہوں پر ''مردہ باد امریکہ'' کا نعرہ گونجا۔ اسلامی جذبوں سے سرشار ان نوجوانوں کے جلوس دو طرح سے جرات مندانہ تھے۔ ایک یہ کہ مارشل لاء کے شباب میں کسی کو اونچا سانس لینے کی اجازت نہ تھی دوم یہ کہ پاکستان کی تاریخ میں

پہلی مرتبہ ''مردہ باد امریکہ'' کا نعرہ حکومت اور امریکہ کے لئے خطرے کا الارم تھا۔

عاشقان امام خمینیؒ پیغام امام خمینیؒ لے کر سڑکوں پر نکلے تو ان پر لاٹھیاں برسیں۔۔۔سر زخمی ہوئے۔۔۔خون پھوٹا تو ہر قطرہ سے ''مردہ باد امریکہ'' کی صدا آئی۔۔۔ یہاں تک کہ ظلم بڑھ کر اختتام کی جانب رواں ہوا۔ جبکہ خون ٹپک کر دائمی بنتا گیا۔ ایسے میں سفیر انقلاب جو میر کارواں تھے کی صدا گونجی دوستو!

ظلم پھر ظلم ہے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے
خون پھر خون ہے ٹپکے گا تو جم جائے گا

آغاز میں ''مردہ باد امریکہ'' کا نعرہ نہ صرف امریکہ اور حکومت کے لئے تکلیف دہ تھا بلکہ خود ملت جعفریہ کے عوام اور زعماء کے لئے بھی حیران اور پریشان کن تھا۔ حکومت اور امریکہ تو اس کی گہرائی کا علم رکھتے تھے۔ مگر ملت مسلمہ پاکستان کو تا حال اس حقیقت کا ادراک نہ تھا۔ جب امام خمینیؒ نے فرمایا کہ ''مسلمانوں کی تمام تر مصیبتوں کا ذمہ دار امریکہ ہے۔ اس لئے مرگ بر امریکہ کے نعرہ کو فراموش نہیں کرنا چاہیے'' تب جا کر بہت سے لوگوں پر یہ عقیدہ کھلا۔

امریکہ کے سابق صدر جارج بش کا پاکستان میں سرکاری دورے کا اعلان ہوا تو سفیر انقلاب نے اپنے احباب کو اکٹھا کیا اور یہ بات ان کے گوش گزار کی کہ ''اسلام کا دشمن ہمارے ملک میں قدم رکھنے کا خواہشمند ہے لہٰذا یہ ہماری ذمہ داری بنتی ہے کہ اس کے کانوں تک "Down with U.S.A" (مردہ باد امریکہ) کی صدا پہنچا دیں۔ نوجوانوں نے جب آپ کی بات سے اتفاق کیا تو آپ نے ان پر واضح کیا کہ ''ایسا کرنے میں مار بھی پڑے گی۔۔۔جیل بھی جانا پڑے گا اور تکلیفیں بھی برداشت کرنا پڑیں گی۔'' احباب ذہنی طور پر تیار ہوئے تو آپ انھیں لاہور ایئرپورٹ پر لے گئے جہاں پہلے سے کرائے کے استقبالی مزدور، سرکاری دفاتر کے ملازمین اور پولیس کے اہلکار موجود تھے۔

سفیر انقلاب نے اپنے پروگرام کے مطابق احباب کو قطاروں میں کھڑا کر دیا اور پولیس کے اہلکاروں سے نظریں بچاتے ہوئے مزدوروں کی قطاروں میں جا گھسے۔۔۔آپ کے ساتھیوں

نے "Down with U.S.A" کا بڑا بینر بغل میں دبایا ہوا تھا جبکہ آپ کے ہاتھ میں امریکی پرچم تھا۔ طے یہ پایا تھا کہ جونہی جارج بش اور ضیا الحق کی گاڑی عوام تک پہنچے اس کے سامنے بینر کھولنا اور امریکی پرچم نذر آتش کرنا ہوگا۔

پس جونہی مہمان اور میزبان کی گاڑی ایئرپورٹ سے عوام تک پہنچی، امام خمینیؒ کے عاشقوں نے جارج بش کے سامنے ''مردہ باد امریکہ'' کا بینر کھولا اور بلند آواز میں "Down with U.S.A" کے نعرے لگانا شروع کر دیئے۔ جس کے باعث جارج بش کے چہرے پر زردی اور ضیا الحق کے چہرے پر موت کی کیفیت طاری ہوگئی۔

یہاں ایک دلچسپ صورت حال اس وقت پیدا ہوئی جب سفیر انقلاب نے امریکی پرچم جلانے کے لئے اپنی پتلون کی جیب سے پٹرول کی بوتل نکالی تو وہ ڈھکنا کھلنے کے باعث خالی ہو چکی تھی یوں آپ اپنے فعل کو انجام دینے میں ناکام رہے۔

ابتدائی چند لمحوں میں نعروں کا شور سن کر پولیس اہلکاروں اور کمانڈوز کو بھی کچھ سمجھ نہ آیا کیونکہ انھیں اس قسم کی توقع تک نہ تھی تاہم جلدی سے انھوں نے ایکشن لیا۔ تمام نعرے لگانے والوں کو خاصی مار پڑی۔ سفیر انقلاب کے احباب مشخص ہونے کے باعث گرفتار کر لئے گئے جبکہ سفیر انقلاب پولیس کو چکمہ دے گئے۔ شاید آپ کی داڑھی اور بال بڑھے ہوئے تھے اس لئے وہاں پر موجود ایس پی آپ کے احباب سے بار بار استفسار کرتا رہا کہ وہ ''بے حجامتا'' کہاں گیا ہے۔۔۔؟

اس واقعہ کو بعض اپنے افراد نے تنقید کا نشانہ بنایا جس پر گرفتار ہونے والے ایک ساتھی نے علامہ سید عارف حسین الحسینی کی خدمت میں ایک خط ارسال کیا اور اپنے خط میں اس فعل پر آپ کی رائے چاہی اس خط کا جواب ''سفیر نور'' نے اپنے مقدس ہاتھوں سے لکھا جس میں درج تھا کہ ''امریکہ مردہ باد کا نعرہ بلند کرنا آپ کی اور ہماری ذمہ داری ہی نہیں بلکہ یہ ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے۔''

کمانڈوز ایکشن کے باعث معاملہ رفع دفع ہو گیا مگر کئی روز تک گرفتار نوجوانوں سے تفتیش

ہوتی رہی اس واقعہ کے بعد نہ صرف وفاقی حکومت کو تشویش ہوئی بلکہ امریکہ نے بھی پاکستانی حکومت سے نوٹس لیا۔

اس واقعہ سے قبل اگرچہ پاکستان کے عوام امریکہ سے متنفر تھے تاہم کسی جماعت نے اتنا بڑا قدم کبھی نہیں اٹھایا تھا۔ اس کامیابی پر سفیر انقلاب بے پناہ خوش ہوئے اور اپنے نظریاتی احباب کو ان کی جرأت پر داد دی۔ آپ نے احباب پر واضح کیا کہ یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ جس طرح امریکہ نے ایران پر جنگ مسلط کر کے شہداء پرور قوم کا چین تباہ کیا ہے اس طرح ہم بھی اسے سکون کی نیند نہیں سونے دیں گے۔''

وقت جوں جوں گزرتا گیا سفیر انقلاب کے ذہن میں امریکہ دشمنی شدت اختیار کرتی گئی۔ یہاں تک کہ ایک مرحلہ ایسا بھی آیا جب آپ کا مقصد حیات سامراج دشمنی ٹھہرا۔ آپ اٹھتے، بیٹھتے، سوتے، جاگتے امریکہ کے خلاف سوچتے اور اس کے مفادات کو زک پہنچانے کی ٹوہ میں رہتے۔

آپ کی فکر کو حقیقی تقویت علامہ سید عارف حسین الحسینی شہید کی قیادت کے بعد ملی۔ چونکہ علامہ صاحب جوان عالم دین، امام خمینیؒ کے عقیدت مند اور انقلاب اسلامی ایران کی تحریک کے سرگرم رکن تھے۔ اس لئے ان کی فکر کا محور امام خمینیؒ کی ذات تھی۔

قیادت کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد انھوں نے اپنی تحریک کو اپنے ملک کے حکمران سے ٹکر تک محدود نہ رکھا بلکہ بعد میں انھوں نے ان اہداف میں وسعت پیدا کر کے اسے بین الاقوامی تقاضوں سے مربوط کر دیا۔ انھوں نے اپنے ابتدائی دورہ جات میں ''امریکہ مردہ باد'' کے نعرہ کو تقویت دی اور پاکستان کے مسلمانوں کی مصیبتوں کا ذمہ دار بھی امریکہ کو قرار دیا۔

چونکہ سفیر انقلاب ڈاکٹر محمد علی نقوی اور سفیر نور علامہ سید عارف الحسینی امام خمینیؒ کے پرستار تھے، اس لئے آغاز ہی سے یہ دونوں ملکوتی انسان ایک دوسرے میں ضم ہو گئے۔

علامہ سید عارف حسین الحسینی نے خود کو امام خمینیؒ کی ذات میں اس قدر ضم کیا جس قدر وہ اسلام میں ضم تھے۔ ایک موقع پر آپ نے پشاور کے احباب سے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ ''اگر امام خمینیؒ یہ کہیں کہ رات کا وقت ہے جبکہ وہ دن ہو تو میں یہی تصور کروں گا کہ واقعاً رات

ہو چکی ہے جبکہ میری آنکھیں صحیح کام نہیں کر رہیں۔'' انھوں نے اپنی تحریک کو انقلاب اسلامی ایران سے مربوط کیا اور برملا فرمایا ''انقلاب اسلامی جس سمت مڑتا جائے گا ہم اپنا رخ اسی سمت کرتے جائیں گے۔''

یہی صورتحال سفیر انقلاب کی تھی کہ جب آپ پاکستانی نوجوان کا دوسرا وفد ایران لے گئے تو امام رضا علیہ السلام کی زیارت گاہ پر پہنچتے ہی جونہی نوجوانوں نے امام کی مرقد پر ہاتھ رکھے تو ڈاکٹر صاحب نے با آواز بلند نعرہ لگوایا۔

ایران ہے لہو لہو اسلام کے لئے
ہم جان دیں گے نائب امام کے لئے

جب واپس لوٹے تو معروف باطل شکن نعرہ ''تکبیر'' لے کر آئے۔ آتے ہی آپ نے ملک کی تمام امام بارگاہوں، مساجد اور عوامی اجتماعات میں یہ نعرہ لگوانا شروع کر دیا۔

اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ خمینیؒ رہبر
مرگ بر امریکہ۔ مرگ بر روسیہ
مرگ بر اسرائیل۔ مرگ بر دشمن ولایت فقیہ

آغاز میں تو اپنے لوگ اس نعرہ سے متحیر ہوئے کیونکہ اس سے قبل ہمارے پروگراموں میں روایتی نعرہ بازی ہوا کرتی تھی تاہم آہستہ آہستہ عوام اس سے متفق ہو گئے۔ ایسے میں سامراج کی بے چینی بڑھتی گئی۔ اسے نہ صرف ''مردہ باد'' کا نعرہ نشتر محسوس ہونے لگا بلکہ وہ بہت دور کی سوچ کر اس کا دفاع کرنے لگا۔

سامراج بالخصوص امریکہ اس نعرہ سے سخت الرجک تھا۔ اور وہ ''آگ کا جلا جگنو کی روشنی سے بھی خوفزدہ ہوتا ہے'' کا مصداق تھا۔ اسے اس نعرہ کی حقیقت اور پس منظر کا اندازہ تھا۔ اسے وہ دن بھی یاد تھا جب عاشور کے روز امام خمینیؒ نے اپنے عوام کے ایک اجتماع سے فرمایا تھا کہ ''آج مظلوم کی حمایت اور ظالم سے نفرت کا روز ہے، آج حسینیت کی اطاعت اور یزیدیت سے ٹکر لینے کا دن ہے۔ لہٰذا امریکہ عصر حاضر کا بڑا ظالم اور یزید ہے۔ جس کے خاتمہ کے لئے حسینیت تقاضا

کرتی ہے۔''

امام کا یہ اعلان سن کر عوام نے مرگ برامریکہ کا نعرہ بلند کیا تھا جو گلی کوچوں سے بلند ہوتا ہوا بازاروں اور ایوانوں تک جا پہنچا۔ یہاں تک کہ ایران کے ہر فرد کی زبان پر یہ نعرہ ورد کا روپ

اختیار کر گیا۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جب اس نعرہ کی صدائیں واشنگٹن پہنچیں اور وائٹ ہاؤس میں مدہوش قوتوں کی نیندیں حرام ہونے لگیں۔

سفیرانقلاب اکثر فرمایا کرتے تھے کہ انقلاب اسلامی ایران کا پہلا درس ''مرگ برامریکہ، مرگ براسرائیل، کا نعرہ تھا۔ جیسے کلمہ پڑھتے وقت مسلمان پہلے انکار کرتا ہے اور پھر اقرار کرتا ہے۔(لاالہ نہیں کوئی۔۔۔الااللہ مگر اللہ کے سوا۔۔۔)اس طرح اسلامی نظام کے قیام کی جدوجہد سے قبل ''مردہ بادامریکہ'' کا نعرہ لگانا ضروری ہوگا۔

پاکستان کے در و دیوار پر ''مردہ بادامریکہ'' لکھنے کی ریت سفیرانقلاب نے ڈالی جب یہ نعرہ ملک کے طول وعرض میں دکھائی دینے لگا اور اس نعرہ کا شور فضاؤں میں پھیلا تو یہاں بھی سامراج کے پاؤں تلے زمین نکل گئی اور اس نے خفیہ اداروں اور چند شیعہ روایتی رہنماؤں کے ذریعہ اسے بند کرانے کی حتیٰ المقدور کوشش کی۔

پاکستان میں مردہ بادامریکہ کا نعرہ حکومت کے لئے رسوائی کا باعث تھا اس لئے حکمران درباری اور روایتی رہنماؤں پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ وہ اس نعرہ کا سدباب کریں۔ چنانچہ سدبہار رہنما، مجالس ومحافل میں یہ تاثر دینے کی کوشش میں تھے کہ اس نعرہ سے ملت جعفریہ پاکستان کی مشکلات میں بے پناہ اضافہ ہوجائے گا۔ ایسے میں سفیرانقلاب، مخالفتیں اور طرح طرح کے الزامات مول لیتے ہوئے آگے بڑھے اور رہنماؤں کو گرجدار آواز میں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

خواب گاہوں سے نکلتے ہوئے ڈرتے کیوں ہو
دھوپ اتنی تو نہیں ہے کہ پگھل جاؤ گے

ڈاکٹر صاحب اکثر یہ واقعہ سنا کر رگوں میں خون کی حرکت کو تیز کرتے تھے کہ جب ایک موقع پر شہنشاہِ ایران نے کرفیو کا اعلان کیا کہ ''آج گھروں سے نکلنا منع ہے'' تو یہ اعلان سن کر

امام خمینیؒ نے جواباً فرمایا ''آج عوام کے لئے گھروں میں رہنا حرام ہے۔'' جب یہ دونوں اعلانات عوام کے کانوں سے ٹکرائے تو عوام خمینیؒ کے حکم کی اطاعت کرتے ہوئے ''مرگ برشاہ'' کے نعرے بلند کرتے ہوئے گھروں سے نکل آئے۔ عورتیں اپنے بچوں کو ہاتھوں میں لئے سڑکوں پر آ گئیں۔ جبکہ ایسے میں دونوں ٹانگوں سے معذور ایک شخص نے اپنے گھر والوں سے عرض کی کہ وہ اسے وھیل چیر کے سہارے گھر سے باہر نکال دیں تا کہ امام کے فرمان کی تعمیل میں گستاخی نہ ہو۔

سفیر انقلاب کو کئی بار لوگوں کو قائل کرنا پڑا کہ یہ نعرہ سیاسی نہیں ہے بلکہ حسینیت کے تقاضے پورے کرتا ہے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ اگر ''امریکہ مردہ باد'' سیاست ہے تو پھر ''یزیدیت مردہ باد'' بھی سیاست ہے۔ اگر آج کسی ظالم حکمران کے خلاف تحریک یا کسی ایسی سپر طاقت جو اسلام کے خاتمہ پر تلی ہوئی ہو، کے خلاف قیام کرنا سیاست ہے تو پھر تحریک کربلا بھی سیاست تھی اور ایسی ہی سیاست ہمارے دین میں جائز ہے۔

ڈاکٹر صاحب ان ایام میں اپنے دروس میں یہ بات تکرار کے ساتھ کرتے تھے کہ جب شداد کا زمانہ تھا تو لوگ اسے برا نہیں کہتے تھے لیکن جب وہ مر گیا تو تمام لوگوں نے اسے برا بھلا ٹھہرایا۔ موسیٰ کے زمانہ کے لوگ شدّاد کو مطعون کرتے تھے مگر فرعون کے خلاف زبان نہ کھولتے تھے جب وہ مر گیا تو لوگ اس کے خلاف بھی باتیں کرتے کرتے تھکتے نہ تھے۔ اسی طرح یزید کے زمانہ کے لوگ شدّاد اور فرعون کو ملامت کرتے تھے مگر یزید کے بارے میں کچھ نہ کہتے تھے آخر جب وہ چلا گیا تو لوگ اس پر لعنتیں بھیجتے تھے۔ آپ فرماتے کہ آج وہی صورتحال ہے کہ لوگ شدّاد، فرعون اور یزید کو جن خصائل کی بنا پر برا سمجھتے ہیں اس کردار کے حامل امریکہ کے خلاف آواز بلند نہیں کرتے۔

یہ بات دعویٰ سے کی جاسکتی ہے کہ پاکستان میں پہلی بار تحریک جعفریہ کے پلیٹ فارم سے ''مردہ باد امریکہ'' کا نعرہ منظم انداز میں گونجا اور پہلا نعرہ لگانے کا شرف ڈاکٹر محمد علی نقوی کی ذات کو حاصل ہوا۔

انھوں نے یہ نعرہ اس وقت بلند کیا جب تحریک جعفریہ کے کئی رہنما بھی اس کے بارے

میں زیادہ واضح اور حمایتی نہ تھے مگر علامہ سید عارف حسین الحسینی کی قیادت کے بعد اس نعرہ کو تائید حاصل ہوگئی۔

امریکہ کے خلاف سفیر انقلاب اور ان کے احباب کو کھل کر تحریک چلانے کا موقع اس وقت میسر آیا جب حضرت امام خمینیؒ نے مسلمانان عالم سے رمضان المبارک کے آخری جمعہ ''جمعۃ الوداع'' کو یوم القدس منانے کی درخواست کی۔ امام خمینیؒ نے فرمایا تھا کہ ''اسرائیل امریکہ کے بل بوتے پر ہمارے قبلہ اول پر قابض ہے لہٰذا مسلمانان عالم کو چاہیے کہ متحد ہو کر اسرائیل کو صفحہ ہستی سے مٹا دیں۔''

پاکستان میں پہلی بار یوم القدس کا جلوس علما کرام کی قیادت میں برآمد ہوا جس کی منصوبہ بندی سفیر انقلاب نے کی تھی۔ آپ کی منصوبہ بندی اور جلوس کے تیور دیکھ کر علامہ سید عارف حسین الحسینی شہید نے بھی ایک موقع پر شرکت فرمائی تھی۔

سفیر انقلاب نے اس پروگرام کو کامیاب بنانے کے لئے ملک بھر کے دورہ جات کیے اور عوام کو ضلعی سطح پر یوم القدس منانے کی اپیل کی۔ لاہور میں آپ نے بیت المقدس (قبلہ اول) کا ایک ماڈل بنوایا جسے مظاہرین کندھوں پر رکھ کر شاہراہ پر نکلتے تھے اور اسرائیل و امریکہ کے خلاف دل کا غبار نکالتے تھے۔ پاکستان میں امریکی اور اسرائیلی پرچم اور وہاں کے حکمرانوں کے پتلے جلانے کا رواج سفیر انقلاب نے رائج کیا۔ یہ آپ کی منصوبہ بندی کا نتیجہ تھا کہ ملک میں کئی مواقع پر امریکی پرچم نذر آتش ہوئے۔ بلکہ نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ آئی۔ ایس۔ او کے نوجوان کسی بھی قومی حادثہ کے رونما ہونے پر امریکہ کا پرچم ضرور جلاتے۔ یہ صورت حال دیکھ کر حکومت پاکستان نے غیر ملکی پرچم جلانے کے خلاف آرڈیننس جاری کیا اور یہ آرڈیننس خالصتاً تحریک جعفریہ اور آئی۔ ایس۔ او کے کارکنان کے لئے تھا جو اس وقت باقاعدگی سے امریکی پرچم جلایا کرتے تھے۔

۱۹۸۶ میں آپ اپنے محبوب قائد علامہ سید عارف حسین الحسینی کی خدمت میں پشاور حاضر ہوئے اور انھیں پروگرام پیش کیا کہ ''یوم القدس'' کو خالصتاً اسرائیل کے خلاف استعمال کیا جائے جبکہ

۱۶ مئی کو یوم مردہ باد امریکہ کا انعقاد کیا جائے۔ کیونکہ اس روز امریکہ نے اس اسرائیل کو جنم دیا تھا۔

قائد کو آپ کی تجویز پسند آئی اور انھوں نے ''یوم مردہ باد امریکہ'' کی منظوری دے دی۔

قائد کی اجازت کے بعد قائد کے محبوب سپاہی نے ملک بھر میں اس یوم کے منانے کو اہمیت دی اور پہلے سال ہی ملک کے تمام اضلاع میں ''یوم مردہ باد امریکہ'' منا کر ملک کے ایوانوں اور وائٹ

ہاؤس کے مکینوں کی نیندیں حرام کر دیں۔

۱۹۸۶ میں ''یوم مردہ باد امریکہ'' کے مظاہرے کے بعد آپ گرفتار کر لئے گئے پولیس آپ کو تھانہ گوال منڈی لاہور کے تفتیشی سنٹر میں لے گئی جہاں آپ سے ایک گھنٹے تک تفتیش ہوتی رہی اور اس موقع پر پولیس نے آپ کو مختلف انداز میں بٹھا کر بہت سی تصاویر لیں۔

اس موقع پر ملک میں ہزاروں امریکی پرچم نذر آتش ہوئے، ملک کے در و دیوار پر امریکہ کے خلاف وال چاکنگ ہوئی اور گھر گھر مردہ باد امریکہ کا پیغام پہنچا۔

یہ سلسلہ تین سال تک جاری رہا مگر علامہ عارف حسین الحسینی کی شہادت کے بعد حالات کے پیش نظر یہ یوم پھر نہ منایا گیا۔ جس کا سفیر انقلاب کو خاصا دکھ رہا۔

باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا کہ جب ۱۹۸۷ میں یوم مردہ باد امریکہ منایا جانے لگا تو امریکی حکومت نے پاکستانی سفیر سے استفسار کیا کہ ۱۶ مئی کو پاکستان میں کون سا یوم منایا جاتا ہے۔ امریکہ نے اس موقع پر اپنی تشویش کا اظہار کیا جس کا پاکستان حکومت نے نوٹس لیا۔

سفیر انقلاب کا عقیدہ تھا کہ کسی محفل یا پروگرام کو مردہ باد امریکہ کے نعرہ کے بغیر شروع یا اختتام پذیر نہیں ہونا چاہیے۔ آپ فرمایا کرتے تھے جس طرح ہماری مجالس میں ''نعرہ حیدری'' عبادت سمجھ کر لگایا جاتا ہے اس طرح ''مردہ باد امریکہ'' بھی عبادت کے طور پر لگایا جائے۔ چونکہ قرآن مجید میں یہود و نصاریٰ کی مذمت کا واضح حکم موجود ہے۔ اس لئے قرآن کی اطاعت عبادت ہے۔'' چنانچہ آپ اپنے عقیدہ کے پیش نظر کوئی پروگرام یا موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔

۱۰ اپریل ۱۹۸۶ کو بے نظیر بھٹو نے دس سالہ جلاوطنی کے بعد پہلی مرتبہ لاہور میں جلسہ کرنا چاہا تو اس کی بازگشت دنیا بھر میں سنی گئی اور پیپلز پارٹی کے کارکنان نے جلسہ کی کامیابی کے

لئے دن رات ایک کر دیے۔

جلسہ سے ایک دو روز قبل تحریک جعفریہ کے دفتر میں اس جلسہ کے بارے میں قیاس آرائیاں ہوئیں تو ڈاکٹر صاحب نے احباب سے فرمایا'' یہ جلسہ پاکستان کی تاریخ کا بہت بڑا جلسہ ہوگا لہٰذا اس سے کوئی فائدہ حاصل کرنا چاہیے۔'' چنانچہ آپ کی حکمت عملی سے اس جلسہ میں امریکہ کے خلاف لٹریچر تقسیم ہوا، مردہ باد امریکہ کے نعرے بلند ہوئے اور بیسیوں کی تعداد میں امریکی پرچم نذر آتش کیے گئے ہیں۔

امریکہ کے خلاف عوامی رخ دیکھ کر پیپلز پارٹی کی قیادت کو سٹیج پر اظہار کرنا پڑا کہ'' امریکی پرچم نذر آتش کرنے اور امریکہ کے خلاف نعرہ بازی کرنے والوں کا ہم سے کوئی تعلق نہیں۔''

یہ اعلان سن کر آپ نے فرمایا'' بیٹی باپ کے خون کا سودا کر چکی ہے اور امریکہ اس کے ذریعہ عوام میں اپنی جڑیں پھیلانا چاہتا ہے۔ لہٰذا اب پی۔پی کا دور بھی سامراج پٹھو حکومت کا دور ہوگا اور یہ زہر اہلیانِ پاکستان کی رگوں میں غیر محسوس انداز میں پھیلے گا۔''

امریکہ سے آپ کی نفرت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۹۸۷ میں جب سعودی عرب میں ایرانی حجاج پر'' برآت از مشرکین'' کا مظاہرہ کرنے کے جرم میں گولی چلی تو آپ نے ملک بھر میں اپنے قائد کے حکم پر'' حج سیمینار'' منعقد کرائے اور تنظیمی پلیٹ فارم کو استعمال کرتے ہوئے ملک کے اہم شہروں میں احتجاجی مظاہرے تشکیل دیے۔

سفیرانقلاب نے سعودی حکومت کے ظلم کے خلاف ۲۴ جون ۱۹۸۸ کو'' فلیٹیز ہوٹل'' لاہور میں ایک بہت بڑا'' حج سیمینار'' کرایا۔ جس میں ملک کی معروف سیاسی و مذہبی شخصیات نے شرکت کی۔ اس سیمینار کو کامیاب بنانے کے لئے آپ نے مقررہ تاریخ سے ایک ہفتہ قبل ہوٹل میں کمرہ بک کرا لیا تھا جہاں دن رات آپ مصروفِ کار رہتے تھے یہاں تک کہ آپ نے ان ایام میں گھر آنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

سیمینار کی درمیانی شب مشاعرہ بعنوان'' کعبہ سب کو پیارا ہے'' منعقد ہوا جو انتہائی کامیاب رہا۔ شعراء کرام نے کعبہ سے عقیدت اور مسلط شاہی خاندان سے نفرت کا اظہار کیا اس

پر سفیرانقلاب بے حد خوش ہوئے۔ اگلے روز'' سیمینار'' ہوا جو ہر حوالہ سے کامیاب رہا۔

یہ سیمینار شہید مظلوم علامہ سید عارف حسین الحسینی کی زندگی کا آخری سیمینار تھا۔ جس میں انھوں نے انتہائی پر درد اور منفرد لہجہ میں خطاب فرمایا تھا۔ آپ کا یہ خطاب سننے والے اس وقت بھی قیاس آرائیاں کرتے رہے کہ اس لہجہ میں بولنے والا شخص اس سرزمین پر زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ وہ زیرک لوگ اپنے وطن کے دستور سے آگاہ تھے اور اکثر کہا کرتے تھے۔

نثار تیری گلیوں پہ اے وطن کے جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے

ملت اسلامیہ کے محبوب قائد کے خطاب کے دوران سفیرانقلاب ڈاکٹر محمد علی نقوی ہال کے دروازہ پر کھڑے رہے اور وقفہ وقفہ سے پر جوش نعرے بلند کرتے رہے۔ اس روز کا منظر دیکھنے والے گواہ ہیں کہ شہید قائد اور شہید ڈاکٹر اتنے پر جوش تھے جیسے وہ کسی کربلا سے آئے ہیں اور جلد ہی لوٹ جانا چاہتے ہیں۔

سامراج پر یہ'' حج سیمینار'' اس قدر گراں گزرے کہ امریکی حکام اور سعودی شہزادوں نے پاکستانی سفیروں کو اپنی تشویش سے آگاہ کیا اور علامہ سید عارف حسین الحسینی کی سرگرمیاں محدود کرنے کا مطالبہ کیا۔

اس سلسلہ میں ایران میں بین الاقوامی سطح پر'' حج سیمینار'' منعقد ہوا جس میں پاکستان سے علامہ سید عارف حسین الحسینی نے بطور نمائندہ امام خمینیؒ اپنے شیعہ سنی مسلمان بھائیوں کے ساتھ شرکت فرمائی۔ وہاں یہ سوال پیدا ہوا کہ سعودی عرب کی پابندیوں کی وجہ سے اگلے سال ایرانی عازمین حج شرکت نہیں کر سکیں گے تو بھلا'' برأت از مشرکین'' کے مظاہرے کا علم کون تھامے گا۔۔۔؟ اس پر تحریک جعفریہ پاکستان کے قائد نے حامی بھر لی اور فرمایا'' ان شاء اللہ اس بار پاکستانی مسلمان حج کے موقع پر امریکہ، اسرائیل اور روس سے برأت کا اعلان کر کے فلسفہ حج کی تکمیل کریں گے۔''

۱۹۸۸ میں سفیرانقلاب اپنے قائد کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اپنے مخصوص احباب کے

ہمراہ حقیقی حج ادا کرنے کے لئے سعودی عرب پہنچے۔ مناسک حج شروع ہوئے تو آپ نے منصوبہ بندی کے تحت امریکہ اور اسرائیل کے خلاف مسلمانان عالم تک اپنا پیغام پہنچانا شروع کر دیا۔

پہلے مرحلہ میں آپ نے لاکھوں کی تعداد میں حجاج کے درمیان وہ پرچیاں بکھیریں جن پر ''مرگ برامریکہ'' لکھا ہوا تھا۔ آپ کا طریقہ کار کچھ یوں تھا کہ آپ اپنی پنڈلی کے ساتھ

پرچیاں ''ربڑ بینڈ'' سے باندھتے اور پھر جہاں مناسب سمجھتے ٹانگ زمین پر زور سے مارتے تو ربڑ بینڈ کے کھل جانے سے پرچیاں حجاج کے درمیان بکھر جاتیں اور حجاج ان کو اٹھا کر ''برأت از مشرکین'' کا پیغام پڑھتے۔ دوسرے مرحلے میں آپ نے مختلف اجتماعات یا محفلوں میں پمفلٹ تقسیم کیے جن پر قرآن مجید کی روشنی میں حج کا فلسفہ تحریر ہوتا تھا۔ تیسرے مرحلہ میں آپ نے ایک پل پر ''مرگ برامریکہ، برگ براسرائیل'' کا بینر لگایا جس کے بعد وہاں کی ایجنسیاں متحرک ہوئیں۔ آخری مرحلہ پر جب حجاج کرام شیطان کو کنکریاں مارنے لگے تو آپ کے احباب نے وہاں پیغام پہنچایا کہ ''اے مسلمانو! تم جس شیطان سے نفرت کا اظہار کر رہے ہو آج وہ امریکہ کی شکل میں موجود ہے لہٰذا آج کے شیطان بزرگ سے برأت کا اعلان کر کے قرآن مجید کے حکم کی تعمیل کرو، اس موقع پر ان افراد نے اپنے احرام جن پر مرگ برامریکہ لکھا ہوا تھا ہوا میں لہرائے اور صدا بلند کی ''اے خدا گواہ رہنا کہ ہم نے تیرے دین، رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور کتاب اور ان کے پیروکاروں کے دشمنوں کے خلاف اپنی استطاعت کے مطابق اعلان نفرت کر دیا ہے۔'' اس منفرد مظاہرہ کی امریکیوں نے بھی فلمیں تیار کیں۔

۱۰ ذوالحجہ کی شام ایرانی نشریات نے یہ خبر نشر کر دی کہ آج سعودی عرب میں عالمی سامراج کے خلاف مظاہرہ ہوا ہے۔ اس خبر کے نشر ہونے کے بعد سعودی عرب کے محلات میں کھلبلی مچ گئی کہ انھوں نے امریکہ سے جو وعدہ کیا تھا کہ اس کے خلاف وہ کسی مسلمان کو یہاں زبان نہیں کھولنے دیں گے وہ خاک میں مل گیا۔

شہزادوں کی بے چینی کے بعد وہاں کی ایجنسیاں اور پولیس حرکت میں آئی اور انھوں نے لوگوں کو پکڑ کر تفتیش کرنا شروع کر دی اور حجاج کرام کے ٹھکانوں پر چھاپے مارے۔ بہت سے

افراد کی پکڑ دھکڑ کے بعد انھیں اندازہ ہو گیا تھا کہ مظاہرین پاکستانی تھے۔ آخر ایک مرحلہ پر سفیر انقلاب کو جاننے والا ایک ترکی مسلمان ان کی گرفت میں آیا تو اس نے آپ کی نشاندہی کر دی۔ نشاندہی کے بعد تحریک جعفریہ کے نائب صدر علامہ سید فاضل حسین موسوی سفیر انقلاب اور آپ کے بزرگ ساتھی سید اعجاز علی شاہ صاحب گرفتار کر لئے گئے۔ علامہ سید فاضل حسین موسوی صاحب اس وقت قائد ملت اسلامیہ علامہ سید عارف حسین الحسینی کے دست راست تھے جبکہ سید اعجاز علی شاہ صاحب کا شمار قائد اور امام خمینیؒ کے جانثار عقیدت مندوں میں سے تھا۔

پولیس کی تفتیش کے دوران میں صورت حال کئی مراحل پر دلچسپ رہی۔ وہ ڈاکٹر صاحب کو گرفتار کر لینے کے بعد بھی آپ کے احباب سے پوچھتے تھے کہ ''ڈاکٹر محمد علی کون ہے؟'' نہ جانے ان کے ذہنوں میں کس ڈاکٹر محمد علی کا خوف طاری تھا۔ اسیران سے تفتیش کے دوران میں کیے جانے والے سوالات اور جوابات کچھ یوں تھے۔

☆ آپ لوگوں کو یہاں کس نے بھیجا۔۔۔؟

} ہم مسلمان ہیں، ہم حج ادا کرنے خود آئے ہیں۔

☆ ایران سے آپ کا کیا تعلق ہے۔۔۔؟

} ہم ان کے مسلمان بھائی ہیں۔

☆ آپ ان کے ایجنٹ ہیں۔۔۔؟

} ہم کسی کے ایجنٹ نہیں اسلامی انقلاب کے حامی ہیں۔

☆ ایران سے آپ کو کتنی ایڈ ملتی ہے۔۔۔؟

} خدا کے دین اور محمد عربی کی شریعت کی فکر کی ایڈ لیتے ہیں۔

☆ تم نے یہاں امریکہ کے خلاف مظاہرہ کیوں کیا ہے۔۔۔؟

} قرآن مجید کی اطاعت کرتے ہوئے کہ مشرکین سے برأت کریں۔

☆ سید اعجاز علی صاحب سے پوچھا گیا۔ ڈاکٹر محمد علی نقوی تمھارے لیڈر ہیں۔۔۔؟

} جواب ملا۔ پاکستانی سارے لیڈر ہیں۔۔۔

☆ پاکستان میں کون کون لوگ امریکہ اور سعودی عرب کی مخالفت کرتے ہیں۔۔۔؟

} اس سوال کے جواب میں سید اعجاز علی شاہ صاحب نے ان شیعہ رہنماؤں کے نام لکھوائے جو یہاں علامہ سید عارف حسین الحسینی کی تحریک کے مخالف، حکومت کے طرف دار اور بالواسطہ یا بلاواسطہ امریکہ یا سعودی عرب کے حامی تھے۔

سعودی حکومت نے یہ تمام نام حکومت پاکستان کو بھجوائے اور واضح کیا کہ ان کی معلومات کے مطابق یہ لوگ ہمارے اور امریکہ کی مخالفت میں سرگرم ہیں جس کے جواب میں حکومت پاکستان کو وضاحت کرنا پڑی۔

سفیر انقلاب بڑے دل گردہ والے انسان تھے۔ خدا نے انھیں پہاڑوں جتنا حوصلہ عطا کیا تھا اور لوگ ان کے بارے میں اکثر سوچا کرتے تھے کہ اس نحیف جسم میں جگر کس چیز کا موجود ہے۔ وہ علامہ اقبالؒ کی فکر کا مظہر تھے کہ ؎

دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

ڈاکٹر صاحب بہت گہرے شخص تھے۔ ان کی گہرائیوں کے اندازے لگانے کا دعویٰ کوئی نہیں کر سکتا۔ ان کے افکار اور رازوں کو سمندر سے تشبیہ دی جا سکتی ہے تاہم کبھی کبھار معتمد احباب کی محفلوں کی ہواؤں سے ان کی موجیں کناروں سے چھلک جایا کرتی تھیں اور وہ اس عالم میں اختصار کے ساتھ ''سانحہ مکہ'' کے بارے میں اتنا فرمایا کرتے تھے کہ ''سعودی ادارے غیر تربیت یافتہ لگتے تھے۔ انھیں تفتیش کا کوئی ڈھنگ نہیں آتا تھا۔ ان کے ذہنوں پر ایران کے اسلامی انقلاب کا خوف طاری تھا۔ وہ پاکستان کے اسلامی رہنما علامہ سید عارف حسین الحسینی کی قیادت سے لرزاں تھے۔ ان کی نظروں میں ''موت'' کوئی بڑی چیز تھی وہ ہر وقت ہمیں موت سے ڈرانے کی کوشش کرتے تھے۔''

ایک موقع پر آپ نے بتایا کہ ''برادر سید تصور حسین نقوی (سابق مرکزی صدر آئی۔ ایس۔ او پاکستان) کی دو باتیں سعودی عرب میں تفتیش کے دوران میں میرے بہت کام آئیں ایک کم خوری اور دوسرا جس تشدد سے آپ کو کم تکلیف ہوتی ہو اس پر زیادہ تکلیف کا اظہار

کرنا۔آپ کہتے تھے کہ سعوی عرب کی پولیس نے ہمارے احباب پر بے پناہ تشدد کیا۔ان کا ہر ظلم نہایت تکلیف دہ ہوتا تھا البتہ وہ وقتاً فوقتاً ہمیں بجلی کا کرنٹ بھی لگاتے تھے۔جو میرے لئے نسبتاً کم تکلیف دہ ہوتا تھا اس لئے میں اس پر زیادہ چیخ وپکار کرتا اور یوں وہ بدو اکثر مجھے کرنٹ سے ڈراتے رہتے۔آپ ایک واقعہ بڑے دکھ کے ساتھ بیان کرتے تھے کہ وہاں کے تفتیشی افسر عقائد کے حوالہ سے خاصے سخت تھے وہ ہم سے پوچھتے تھے کہ تم یہاں کیا کرنے آتے ہو۔۔۔تو ہم جواب دیتے کہ اللہ کا گھر ہے اور ہمارے نبی پاک کا روضہ ہے تو وہ بڑے کرخت لہجے میں کہتے کہ ہم تو آج تک مدینہ نہیں گئے وہاں کیا پڑا ہے۔۔۔؟

تفتیش کے مراحل ابھی جاری تھے کہ ۷ اگست ۱۹۸۸ کو آپ تک ایک ایسی خبر پہنچی جو آپ کو یتیم کر گئی۔آپ اپنے تمام درد بھول گئے۔آپ پر سکتہ طاری ہو گیا اور دھاڑیں مار کر رونے لگے۔یہ خبر قائد ملت اسلامیہ علام سید عارف حسین الحسینی کی شہادت کی خبر تھی۔

آپ شاید جانتے تھے کہ اب موت آجائے گی۔مگر قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔یہاں پاکستان میں قائد کی شہادت کے بعد جتنے احتجاجی مظاہرے ہوئے ان میں ''اسیران مکہ'' کو رہا کرنے کا شدید مطالبہ کیا گیا۔بلکہ جب سابق صدر ضیاء الحق، علامہ سید عارف حسین الحسینی شہید کے جنازہ پر آئے تو وہاں پر ڈاکٹر صاحب کے ایک عقیدت مند نے ان سے گرجداری آواز میں کہا ''اسیران مکہ'' کو رہا کروائیں۔جس پر ضیاء الحق نے پوچھا ''وہ کون ہیں۔۔۔؟'' پھر انھوں نے نام لے کر واضح کیا۔

ملت جعفریہ کے غم وغصہ کے تیور دیکھ کر حکومت پاکستان نے سعودی حکومت سے رابطہ کیا اور ''اسیران مکہ'' کو رہا کروایا۔پاکستان پہنچنے پر باقی افراد تو رہا کر دیئے گئے مگر سفیر انقلاب کو پھر زیر تفتیش لایا گیا۔آپ اس دوران سہالہ کیمپ اسلام آباد میں رہے تفتیشی مراحل کے اختتام پر آپ کو ۲ ستمبر ۱۹۸۸ کی سہ پہر رہا کیا گیا۔اسی روز شہید قائد کے چہلم کے بارے میں کمیٹی کا اجلاس تھا۔آپ رہائی کے فوراً بعد اسی اجلاس میں پہنچے۔تمام علماء کرام اور زعما قوم کو تعزیت کی اور پھر دوسرے روز لاہور آئے۔گھر جانے سے پہلے تحریک جعفریہ کے صوبائی دفتر واقع ۲۔سماج

روڈ پر حاضری دی وہاں پر موجود افراد کو شہید قائد کا پرسا دیا اور بے حد افسردگی کے عالم میں یہاں دیر تک بیٹھے رہے۔

یہاں جب آپ کی نظر سید اعجاز علی شاہ صاحب پر پڑی تو آپ ان کی طرف بڑھے ان کے قدموں پر ہاتھ رکھ کر روتے ہوئے کہا ''بزرگ شاہ صاحب میں انتہائی معذرت خواہ ہوں کہ آپ لوگوں کو میری وجہ سے مصائب برداشت کرنے پڑے ہیں اپنی سفید ریش کا صدقہ مجھے معاف کرنا۔''

جونہی لاہور میں یہ اطلاع پھیلی کہ ڈاکٹر صاحب تحریک جعفریہ کے دفتر پہنچ چکے ہیں تو لوگ اپنی مصروفیات ترک کر کے دفتر پہنچے۔سینکڑوں افراد نے آپ سے سعودی عرب کے مظالم کے بارے میں سوالات کئے مگر آپ نے واضح کیا کہ اس موقع پر قائد شہید کے پرسا اور ان کے خون سے ایفائے عہد کے متعلق گفتگو کی جائے۔دفتر سے اٹھ کر آپ گھر پہنچے تو وہاں عزیز واقارب کو بھی اپنے قائد کی تعزیت پیش کی۔

آپ ایک روز بعد تنظیمی امور میں پھر سے متحرک ہو گئے اور ۱۶ ستمبر ۱۹۸۸ کو ہونے والے شہید قائد کے چہلم کو کامیاب بنانے کے لئے دورہ جات کا شیڈول تیار کیا اور چند احباب کے ساتھ دورے پر چل نکلے۔

ملتان ڈویژن کے دورہ کے دوران میں آپ کبیر والا پہنچے تو وہاں پر تنظیمی برادران نے آپ کا شایان شان استقبال کیا۔آپ یہ منظر دیکھ کر خاصے ملول ہوئے اور جونہی آپ سے تنظیمی برادران ملے تو آپ نے انتہائی سخت لہجے میں کہا کہ ''شرم آنی چاہیے کہ قائد شہید کی شہادت کے بعد مجھ جیسے بدنصیبوں اور بے وقعت لوگوں کا اس انداز میں استقبال کرتے ہو۔'' آپ کو اس بات کا اتنا رنج ہوا کہ آپ نے یہاں کھانا بھی نہ کھایا بلکہ اس موقع پر احباب کو تاکید کی کہ آئندہ ان کی توانائیاں اور ان کے سرمائے قائد شہید کے افکار کی ترویج کے لئے اور قاتل امریکہ کے مفادات کے خلاف استعمال ہونے چاہئیں۔

آپ کا روز اول سے یہ موقف تھا کہ ان کے قائد کے قتل میں امریکہ براہ راست ملوث

ہے۔ اگر چہ کچھ دوست اس خون کا ذمہ دار حکومت کو قرار دیتے تھے مگر آپ احباب کے موقف سے اتفاق کرتے ہوئے بھی اپنے موقف پر قائم تھے۔ آخر زمانہ نے دیکھا کہ ٹھیک ایک ماہ بعد اجرتی قاتل گرفتار ہوئی اور انھوں نے اعتراف کیا کہ یہ قتل امریکی جوڑے کی سازش کا نتیجہ تھا جسے ضیاء الحق کے اے ڈی سی ماجد گیلانی اور جنرل فضل حق اور اس کے سالہ ہاشم خان نے تکمیل تک پہنچایا تھا۔

امریکی مفادات کو زک پہنچانا اور اسے اپنے پیارے وطن سے دفع کرنا آپ کی دلی حسرت تھی۔ ۱۹۹۰ میں ایک اعلیٰ ایرانی وفد پاکستان آیا۔ جس میں سابق چیف جسٹس آیت اللہ خلخالی بھی شامل تھے۔ جب یہ وفد خانہ فرہنگ لاہور پہنچا تو سفیر انقلاب نوجوانوں کے ایک وفد کے ساتھ انھیں ملنے گئے۔ احباب وہاں پر موجود کرسیوں اور صوفوں پر بیٹھ گئے جبکہ ڈاکٹر صاحب آغا خلخالی کے قدموں کے پاس جا بیٹھے۔ آپ اور آپ کے وفد نے ان سے کچھ سوالات کیے اور انھوں نے بڑی خندہ پیشانی سے مفصل جوابات دیے۔ ایک مرحلہ پر ڈاکٹر صاحب نے امریکہ کے بارے میں ان سے سوال کیا جس کا جواب سننے پر ایک دم نعرہ تکبیر بلند کر کے اٹھے اور احباب کو بتایا کہ ''آغا صاحب فرماتے ہیں کہ ''امریکہ کے مفادات کو جہاں تک ممکن ہو زک پہنچاؤ اس سے بڑی عبادت کیا ہو سکتی ہے۔''

مجھے یاد ہے کہ سفیر انقلاب کے چہرے پر اس فتویٰ کے بعد گلاب کی سی سرخی آ گئی اور آپ کے تاثرات سے یوں لگتا تھا جیسے کسی نے آپ کے دل کی بات کو شرعی حیثیت دے دی ہو۔۔۔

آپ کھلملاتے چہرے اور چمکتی آنکھوں کے ساتھ معزز مہمانوں سے رخصت ہوئے راستہ میں ایک دوست نے آغا خلخالی کے فتویٰ کو دہرایا اور ڈاکٹر صاحب سے سوال کیا کہ ''کیا امریکہ کی دشمنی عبادت کے زمرے میں آتی ہے تو آپ نے قرآن مجید کی سورہ مائدہ کی آیت تلاوت کرتے ہوئے فرمایا۔

ترجمہ: ''اے ایمان والو! یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست مت بناؤ یہ تمھارے کھلے دشمن مگر ایک دوسرے کے کھلے دوست ہیں۔ اگر تم سے کسی نے ان کو اپنا سرپرست بنایا پس وہ بھی انہی لوگوں

میں سے ہو جائے گا۔ بے شک خدا ظالموں کو راہ راست پر نہیں لاتا۔''

مزید فرمایا کہ قرآن مجید میں کئی مقامات پر تذکرہ ہے کہ جو خدا اور اس کے رسولؐ کا دشمن ہے اس کے خلاف جہاد کرو اور جہاد بہت بڑی عبادت ہے۔

امریکہ سے نفرت آپ کے خون کے ہر قطرہ میں شامل تھی۔ چونکہ آپ امام خمینیؒ اور شہید حسینی کے روحانی فرزند تھے۔ اس لئے آپ ان بزرگان کی فکر کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ ''عالم اسلامی کی تمام مصیبتوں کا ذمہ دار امریکہ ہے اور ہم اپنی ہر مصیبت کا بدلہ امریکہ سے چکائیں گے۔''

۱۹۹۰ میں جب کویت پر عراق نے حملہ کیا اور امریکی فوجیں خلیج میں اتریں تو پاکستان میں امریکہ کے خلاف مسلسل مظاہرے ہوئے اس موقع پر تحریک جعفریہ پاکستان کی جانب سے لاہور کی اہم شاہراہ ''مال روڈ'' پر جو مظاہرہ ہوا اس میں ڈاکٹر صاحب نے امریکہ کا جنازہ برآمد کیا اور مسجد شہداء کے سامنے اسی پر جوتے برسائے۔ اس موقع پر آپ نے فرمایا ''آج ملک بھر میں امریکہ کے خلاف جس شد و مد سے نفرت کا اظہار ہوا ہے یہ ہمارے نوجوانوں کی تحریک اور قائد شہید کی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ آپ نے بتایا کہ ایک وقت وہ بھی تھا جب ہم چند نوجوان شاہراہ پر ''مردہ باد امریکہ'' کا نعرہ بلند کرتے ہوئے نکلتے تھے۔ ہمارے سروں پر لاٹھیاں پڑتی تھیں، ہمارے سینوں پر شیل پھینکے جاتے تھے، ہمارے ہاتھوں میں زنجیریں پہنائی جاتیں تھیں اور ہمارے خلاف بغاوت کے مقدمات درج ہوتے تھے۔ مگر آج وہی شاہراہ ہے جس پر ملک کے ہزاروں لوگ مردہ باد امریکہ کا نعرہ بلند کر رہے ہیں جیسے یہ نعرہ ان کی ثقافتی علامت ہو۔ گویا آج ہم نے امریکہ سے اپنے قائد کے خون کا بدلہ لے لیا ہے۔''

آپ فرمایا کرتے تھے کہ ''افراد کے قتل ہونے سے زیادہ نقصان دہ مرحلہ افکار کے قتل کا ہے۔ امریکہ نے ہمارے افراد قتل کرائے ہیں اور ہم نے یہاں اس کے افکار کا خاتمہ کیا ہے۔''

ایک مرتبہ پاکستان میں سامراج کی خدمت کرنے والے عناصر اور ان کے طرز عمل'' پر گفتگو ہوئی۔ تو بات چل نکلی کہ ''ایجنٹ'' کیا ہوتا ہے۔ آپ نے جواباً فرمایا جو کسی کے مفادات کا

تحفظ کرتا ہے وہ ایجنٹ ہوتا ہے اور ایجنٹ بالواسطہ بھی ہوتے ہیں اور بلاواسطہ بھی۔۔۔ جو لوگ یہاں سامراج کے عزائم کی تکمیل کر رہے ہیں ان کے اقدامات سے اسلام یا وطن کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ وہ سامراج کے ایجنٹ ہیں چاہے وہ کسی روپ میں ہی کیوں نہ ہوں۔''

میں نے برجستہ کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب پھر اس کا یہ مطلب ہوا کہ آپ بھی ایرانی ایجنٹ ہیں۔۔۔؟'' آپ نے بلا تامل جواب دیا۔ ''بالکل''

آپ نے تشریح کرتے ہوئے فرمایا ''ایجنٹ معاشرہ میں ایک معیوب لفظ یا گالی بن گیا۔ ایجنٹ کا مقصد سفیر اور پاسبان ہے۔ یعنی وہ پیغام پھیلاتا ہے اور پھر اس کا دفاع کرتا ہے۔ چنانچہ ہم اسلامی انقلاب کے سفیر اور پاسبان ہیں، یہ انقلاب سعودی عرب، افغانستان، کشمیر یا کسی بھی اسلامی خطہ میں برپا ہو ہم اس کا خیر مقدم کریں گے اور بطور ایجنٹ (سفیر و پاسبان) کام کریں گے۔۔۔ لہٰذا مجھے اسلامی انقلاب اسلامی ایران کا ایجنٹ ہونے پر فخر ہے۔'' (آپ کا یہ جملہ ماہنامہ العارف لاہور کو دیئے گئے انٹرویو میں بھی شامل ہے۔)

آپ جس طرح امریکہ و اسرائیل سے متنفر تھے بالکل اسی طرح سے روس سے بھی نفرت کرتے تھے۔ آپ کی امریکہ سے دشمنی اسلامی انقلاب اسلامی ایران کے بعد شروع ہوئی جبکہ روس کی مخالفت ۲۳ سال پرانی تھی۔ آئی۔ ایس۔ او پاکستان کے قیام کے وقت سوشلزم اور کیمونزم کا خاصا چرچا تھا۔ چنانچہ ایک فرزند اسلام ہونے کے ناطے آپ ان ایام میں ان ملحدانہ نظاموں کی پرزور مخالفت کیا کرتے تھے۔

یہ بات بڑی واضح ہے اور سفیر انقلاب خود بھی اس کا اعتراف کیا کرتے تھے کہ انھیں امریکہ کی طرح روس کے خلاف تحریک چلانے کی سمت میسر نہ آئی۔ امریکہ دشمنی دو اہم وجوہات کی بدولت تھی ایک یہ کہ امریکہ ہمارے پیارے وطن کو گرفت میں رکھے ہوئے ہے اور تمام ملکی امور اس کے حکم پر تکمیل کو پہنچتے ہیں۔ دوم یہ کہ دیگر اسلامی ریاستوں میں روا مظالم میں اس کا ہاتھ ہے۔

آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ''ہماری غیرت گوارہ نہیں کرتی کہ وطن عزیز جسے ہمارے بزرگوں اور بھائیوں نے بے پناہ قربانیاں دے کر حاصل کیا ہے اس کے امور سلطنت کی باگیں

یہودیوں کے ہاتھوں میں ہوں اور وہ ہماری قسمت کے فیصلے کریں۔ دوم ہمارا دین ہمیں یہ اجازت نہیں دیتا کہ یہودی ہمارے مسلمان بھائیوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑیں اور ہم خاموش بیٹھے رہیں۔''

آپ بوسنیا، فلسطین، کشمیر و دیگر اسلامی ریاستوں میں مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کا ذکر کر کے انتہائی درد بھرے انداز میں کہا کرتے تھے کہ ''یہ سب کچھ یہودیوں کی بدولت ہے۔ وہ اپنی سازشوں کو کبھی اقوام متحدہ، کبھی عرب شہزادوں اور کبھی دیگر مصلحت پسند مسلمان حکمرانوں کے ذریعہ تکمیل تک پہنچا رہے ہیں۔''

آپ قرآن مجید کی سورہ النساء کی آیت ۷۵ کا حوالہ دے کر فریاد دہرایا کرتے تھے کہ ''اے مسلمانو! تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ تم کمزور، بے کس مردوں، عورتوں اور بچوں کو (کفار کے پنجوں سے چھڑانے) کے لئے خدا کی راہ میں جہاد نہیں کرتے۔''

آپ قرآن مجید کی سورہ توبہ آیت ۴۱ عموماً تلاوت فرما کر جذبہء جہاد پیدا کرتے ہیں۔ ''مسلمانو خواہ تم ہلکے ہو یا بوجھل جب تمھیں حکم دیا جائے اپنے مال اور جان سے خدا کی راہ میں جہاد کرو اگر تم کچھ جانتے ہو تو سمجھ لو یہ تمھارے حق میں بہتر ہے۔''

آپ کا عقیدہ تھا کہ وطن اور اسلام کے دفاع سے بڑی عبادت کوئی نہیں اور اس راستہ میں آنے والی موت سے بڑھ کر کوئی عزت نہیں۔ آپ کا خیال تھا کہ وطن کی سرحدوں کی حفاظت کا صرف یہ مقصد نہیں کہ آپ دشمن کے ٹینکوں کے آگے سو جائیں بلکہ یہ بھی سرحدوں کی محافظت میں آتا ہے کہ آپ دشمن کے افکار نظریات اور سازشوں کو اپنے ملک میں نہ گھسنے دیں۔ آج ہمارے ملک میں امریکی عزائم یہاں تک سرایت کر چکے ہیں کہ ہمارا ملک امریکی سفیر کے رحم و کرم پر چل رہا ہے اور امریکہ اسے اپنی ریاست سمجھتا ہے۔

ایک مرتبہ آپ نے روس اور امریکہ سے اپنی دشمنی کے بارے میں بتایا کہ جب ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں روس نے ہماری سرحدیں پھلانگنے کی کوشش کی تھی تب بھی ہم نے اپنی استطاعت کے مطابق دفاع کیا تھا اور جب امریکہ نے تسلط کی ٹھانی تو ہم نے اس استعمار کا بھی ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے۔

جہاد افغانستان کے دوران میں بھی آپ حالات سے لاتعلق نہیں رہے بلکہ آپ نے لاکھوں روپے کی دوائیاں اور امامیہ ڈاکٹرز کی ٹیمیں بھیجیں۔ آپ اس بات پر خوش تھے کہ افغان مجاہدین کے ہاتھوں روس جیسی سپر طاقت کو پسپائی حاصل ہو رہی ہے البتہ اپنی محافل میں اس دکھ کا بھی اظہار ضرور کرتے کہ امریکہ اس جنگ کی آڑ میں اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کر رہا ہے جبکہ پاکستان کی کچھ مذہبی جماعتیں اپنے نوجوانوں کو مسلح تربیت دلوا رہی ہیں جو مستقبل میں خود پاکستان کے استحکام کے لئے خطرہ ہیں۔

اسرائیل کے لبنانی اور فلسطینی مسلمانوں پر مظالم کے خلاف نہ صرف آپ اپنے وطن میں سراپا احتجاج رہے بلکہ وہاں کی اسلامی تنظیموں سے بھی ان کے روابط تھے۔ آپ کی شہادت پر آپ کے اہل خانہ کو اسرائیل کے خلاف برسرپیکار مجاہدین کے تعزیتی خطوط موصول ہوئے جس میں واضح طور پر تحریر تھا کہ ''ہم پاکستان میں امریکہ اور اسرائیل کے خلاف جہاد کرنے والے ایک مجاہد بھائی سے محروم ہو گئے ہیں۔''

آپ نے اپنی زندگی کا آخری درس آئی۔ایس۔او پاکستان کی طالبات کو ''کشمیر'' کے موضوع پر دیا اور اس درس سے قبل تحریک جعفریہ کے صوبائی دفتر میں احباب کو تاکید کی کہ وہ کشمیر کی آزادی کے لئے مصروف جہاد مجاہدین سے تعاون کریں اور عوام الناس میں حقیقی تصویر اجاگر کر کے انھیں پس منظر اور حقائق سے آگاہ کریں۔ اسلام کی خدمت اور سامراج سے نفرت کے لئے کوئی شخص بھی قدم اٹھاتا تو آپ دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اس کی حوصلہ افزائی فرماتے اور دعا دیتے۔

۱۹۹۲ میں آئی۔ایس۔او پاکستان کے زیر اہتمام اسلام آباد میں بین الاقوامی سطح پر ''کشمیر و فلسطین کانفرنس'' منعقد ہوئی جس میں سامراج کے خلاف گفتگو کرتے ہوئے ''سفیر انقلاب'' نے ایک مسلم بچے کے جذبات کو بھرپور انداز میں سراہتے ہوئے فرمایا کہ انقلاب کے زمانے میں ایک پوسٹر دیکھا تھا جس میں ایک ننھا بچہ جس کے دونوں بازو کٹے ہوئے ہیں اور ان سے خون رس رہا ہے۔۔۔ وہ دشمن کو مخاطب ہو کر کہتا۔

''اے دشمن تو نے میرے دونوں بازو کاٹ دیئے تاکہ میں انقلاب کے لئے کام نہ کر

سکوں نہیں نہیں میرے پاؤں سلامت ہیں میں ان سے چل کر انقلاب کی خدمت کروں گا اے دشمن تجھے یہ ناگوار گزرے گا اور تو میرے پاؤں کاٹ دے گا تاکہ میں انقلاب کے پیغام کو نہ پہنچا سکوں تو میرے منہ میں زبان سلامت ہوگی میں زبان سے انقلاب کے پیغام کو آگے پہنچاؤں گا۔ اے دشمن تو میری زبان کو بھی برداشت نہیں کرے گا اور اسے کاٹ دے گا تو میں آنکھوں کے اشاروں سے انقلاب کا پیغام دیتا رہوں گا۔ اے دشمن تو میری آنکھوں کو بھی نکال دے گا اور سمجھے گا کہ انقلاب کا پیغام رک جائے۔ نہیں نہیں میرے اندر جو سانس جائے گا اور باہر آئے گا تو وہ پیغام بن کر آئے گا۔۔۔ اے دشمن مجھے یقین ہے کہ تجھے یہ سانس بھی گوارا نہیں ہوگی تو سن لے کہ میرے جسم سے خون رسے گا وہ زمین میں جائے گا۔ اس زمین سے فصل تیار ہوگی اس فصل کو لوگ کھائیں گے تو ان کے اندر پیغام پہنچے گا۔''

سفیر انقلاب جب یہ واقعہ سنا رہے تھے تو ان کے لہجے سے واضح طور پر محسوس ہو رہا تھا کہ وہ حوالہ ایک بچے کی داستان کا دے رہے ہیں مگر وہ بذات خود ایسے ہی جذبات میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

آپ کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ آپ اسلام اور وطن کے دفاع کے لئے سامراج کے خلاف ہر طرح سے نبرد آزما رہے۔ آپ نے خون کے آخری قطرہ تک سامراج سے ٹکرانے کا عزم کر رکھا تھا۔ آپ نے نہایت بے جگری سے سامراج کی ہر سازش کا مقابلہ کیا۔

امریکہ نے خلیج میں مداخلت کی، کشمیر کے مسئلے کو اقوام متحدہ میں نظر انداز کرنا، بیت المقدس کی بے حرمتی پر اسرائیل کو اکسایا، اسلامی ریاستوں میں غنڈہ گردی کی یا پاکستان میں فرقہ واریت کو جنم دے کر اس کی پرورش کی۔ سفیر انقلاب نے ہر قدم پر اسے للکارا۔ ہر مرحلہ پر اس کے خلاف احتجاج کیا۔۔۔ گھر گھر اس کے خلاف پیغام پھیلایا اور غیور عوام میں اسے رسوا کیا۔

آپ پر احباب اور خفیہ اداروں سے تعلق رکھنے والے مخلص افراد نے کئی بار واضح کیا کہ امریکہ کے خلاف آپ کی سرگرمیاں حکومت پاکستان کو گراں گزرتی ہیں اور پاکستان میں امریکی مفادات کا تحفظ کرنے والے گروہ آپ کے وجود برداشت کرنے کا حوصلہ ہار چکے ہیں لہٰذا آپ اپنے رویہ میں نرمی پیدا کریں، مگر آپ فرماتے ''اسلام دشمن سامراج کے خلاف نرمی یا مصلحت

میرانہیں حکمرانوں کا شیوہ ہے'' میری زندگی کا ایک وقت مقرر ہے آپ وصیت میں بھی یہ فقرہ لکھتے ہیں کہ ''دوستو! وقت مقرر آ پہنچا اور ہم ایک طویل سفر کی طرف روانہ ہو گئے۔''

آپ نے عمر بھر قبیلہ (ملت) کے افراد کو بقول شاعر یہ درس دیا کہ

زندگی کا سفر کاٹنا ہے اگر آگ پر رقص کرنیکا فن سیکھ لو
جسم چاہے جلے، روح پھولے پھلے، جینا چاہو تو مرنے کا فن سیکھ لو

آپ کی عظمتوں کو سلام کرتے ہوئے یہ بات دعویٰ سے کی جاسکتی ہے کہ آپ شعور کی پہلی سوچ سے خون کے آخری قطرہ تک اسلام اور وطن کی عظمت کے دفاع کی خاطر سامراج اور اس کے ایجنٹوں سے معرکہ آراء رہے اس لئے آپ کے جنازہ پر خطاب کرتے ہوئے شیعہ سنی عمائدین نے آپ کو شہید اسلام اور شہید وطن کا خطاب دیا۔

☆☆☆☆☆

سفیرانقلاب کی ذاتی زندگی

یوں تو جو کچھ کتاب کے دامن میں موجود ہے آپ ہی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا عکس ہے تاہم یہاں ہماری مراد آپ کی بود و باش، رہن سہن، اخلاق کردار کے چند زاویوں کو اجاگر کرنا ہے تاکہ واضح ہو سکے کہ گوشت پوست کا ایک انسان کمالات کی منزل تک کیسے پہنچتا ہے۔۔۔؟

خداوند کریم نے آپ کی فطرت میں سادگی اور خلوص کا عنصر اس قدر نمایاں فرمایا کہ ہر وہ شخص جو آپ سے زندگی میں چند لمحات یا ماہ و سال کے لئے شناسا ہوا آپ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ بعض خوبیاں بنیادی طور پر ہر انسان کی فطرت میں شامل ہوتی ہیں جبکہ بعض اوصاف کو انسان خود سازی کے مراحل میں فطرت کا جزو بنالیتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سفیرانقلاب نے اپنے نفس سے متواتر محاذ آرائی کی اور بہت سی خوبیاں محاذ آرائی کی اور بہت سی خوبیوں کو اپنی فطرت میں شامل کیا۔ آپ نے حضرت علی علیہ السلام کے فرمان ''سب سے بہترین عمل اپنے نفس کو مجبور کرنا ہے'' کے مطابق اپنے اعمال کو اس

قدرانجام دیا کہ آپ کی زندگی دوسروں کے لئے نمونہ عمل بن گئی۔

کم کھانا، کم پہننا اور کم سونا ایسی صفات ہیں جو ''صالحین'' میں پائی جاتی ہیں۔ ایسے بندگان خدا کو اپنی زندگی کی بے ثباتی، دنیا و آخرت کا مکمل ادراک ہوتا ہے اس لئے وہ فرمان معصومؑ کی روشنی میں جتنا دنیا میں رہنا ہے یہاں کے لئے اور جتنا آخرت میں رہنا ہے وہاں کے لئے سامان اکٹھا کرتے ہیں۔

اگر کسی شخص نے محاذ جنگ پر کسی مجاہد کی زندگی کے لمحات کا جائزہ لیا ہو تو وہ بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے کہ وہ کتنا سوتا ہے۔۔۔ کتنا پہنتا ہے اور کتنا کھاتا ہے۔۔۔؟ جن افراد نے ڈاکٹر محمد علی نقوی شہید کو قریب سے دیکھا ہے وہ اس بات کے شاہد ہیں کہ آپ کی تمام عمر ایک ایسے مجاہد کی سی تھی جو اسلام دشمن قوتوں کے خلاف پہلے مورچے میں سربکف لڑتا رہا اور اپنی زندگی کے تمام طور اطوار مجاہدوں کی طرح اپنائے۔

معاشرتی حوالے سے آپ ڈاکٹر اور ملی حوالے سے ملت جعفریہ کے قدآور رہنما تھے مگر آپ کا لباس دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ آپ نے لباس کو صرف بدن ڈھانپنے کے لئے پہنا ہوا ہے۔ انتہائی سادہ مگر صاف شرٹ اور پتلون میں آپ اکثر ملبوس پائے جاتے تھے۔ تین سے زیادہ پتلون شرٹ اور دو سے زیادہ شلوار قمیض آپ کے پاس کسی نے نہ دیکھے۔ آپ بعض اوقات کسی پروگرام میں قیمتی لباس پہن کر آتے تو قریبی احباب تذکرہ ضرور کرتے مگر اب پتہ چلا کہ وہ لباس جو اس وقت زیر بحث آتے تھے وہ آپ کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر عباس علی نقوی کے ہوتے تھے۔

آپ ایک لباس کو اتنا استعمال میں لاتے کہ وہ آپ کا تعارف بن جاتا بسا اوقات کسی مرکزی پروگرام میں جب نئے تنظیمی برادران (جو ڈاکٹر صاحب سے شناسا نہ ہوتے۔) کو ڈویژنز کی جانب سے بھیجا جاتا تو سینئر برادران ڈاکٹر صاحب کا غائبانہ تعارف کراتے کہ ''دوستو جین کی نیلی پتلون، دھاری دار شرٹ اور سفید و سیاہ رنگ کے بوٹوں والے نحیف شخص کی باتیں غور سے سننا اور اسے قریب سے جانچنے کی کوشش ضرور کرنا وہ ڈاکٹر محمد علی نقوی ہوں گے۔''

آپ کے ہم عصر رفیق نے بتایا کہ ایک مرتبہ ان کے لئے ایک دوست ایران سے شرٹ کا تحفہ لایا جو انھیں کسی طور پر بھی پسند نہ آیا۔ انھوں نے بصد شکریہ تحفہ وصول تو کر لیا مگر پہننے سے گریز کیا کہ ایسے میں ڈاکٹر صاحب بھی ان کے گھر پہنچ گئے۔ شرٹ ابھی میز پر پڑی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کے بارے میں دریافت کیا تو آپ کے دوست نے صورت حال واضح کر دی کہ انھیں یہ غیر معیاری شرٹ پسند نہیں آئی۔ دوست کی یہ بات سن کر ڈاکٹر صاحب نے ان سے یہ شرٹ طلب کی اور دو سال تک اسے خوب استعمال کیا۔

بقول آپ کے رفیق کہ وہ جب بڑی بڑی محافل میں ڈاکٹر صاحب جیسی شخصیت کے جسم پر اپنی ناپسندیدہ معمولی سی شرٹ کو دیکھتے تو انھیں ندامت ہوئی کہ انھوں نے جس چیز کو غیر معیاری جان کر ٹھکرایا تھا آج اسے ایک معیاری انسان نے گردوپیش سے بے نیاز ہو کر زیب تن کیا ہوا ہے۔

ایک مرتبہ دو نوجوان آپ کے لئے پتلون شرٹس خریدنے لاہور کے معروف ''پینو راما سنٹر'' جانے لگے تو انھوں نے کپڑوں کے نام لے کر آپ سے آپ کی پسند چاہی۔ آپ نے فرمایا ''دوستو یقین جانیے کہ مجھے کپڑوں کی اقسام کا کوئی علم نہیں مجھے اتنا معلوم ہے کہ کپڑے سے جسم ڈھانپا جاتا ہے'' جب یہ دوست دکان پر پہنچے تو دکان کا مالک بھی آئی۔ ایس۔ او کا سابق عہدیدار نکلا غالباً ڈاکٹر صاحب پہلے بھی اسی دکان سے اپنے کپڑے خریدا کرتے تھے، انھوں نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب نے کبھی بھی لباس کے بارے میں اپنی پسند نہیں بتائی بلکہ اپنی پیمائش بتا کر ہماری پسند پر لباس لے لیتے ہیں۔

شیخ زید اسپتال میں جب آپ کلیدی عہدے پر فائز ہوئے تو بعض احباب کا خیال تھا کہ اب آپ کے لباس میں تبدیلی ضرور آئے گی مگر یہاں بھی فطرت غالب رہی۔ ایک روز میں آپ سے ملنے آپ کے آفس گیا۔ دیکھا کہ آپ نے نہایت معمولی سا لباس پہنا ہوا تھا جبکہ آپ کے جوتے خاصے پرانے تھے۔ میں نے عرض کی ''ڈاکٹر صاحب ہو سکے تو بے چارے بوٹوں کو چھٹی دے دیں''۔۔۔ مسکرائے اور فرمانے لگے کہ ''دیکھو یار اس ماہ کپڑے لئے ہیں۔ اگلے ماہ جوتے کی بھی سوچیں گے ایک وقت میں سب کچھ خریدنا مشکل ہے۔''

میں سمجھتا ہوں کہ دو چار سو روپے کے جوتے خریدنا آپ کے لئے مشکل نہ تھا مگر ایک ساتھ نئے کپڑے اور جوتے پہننا آپ کے لئے مشکل تھا۔ آپ کا معمول تھا کہ آپ نئے کپڑے کو دھلا کر استعمال کرتے تا کہ ان کی چمک باقی نہ رہے جبکہ جوتے ایسے استعمال کرتے جنھیں پالش کرنے کی نوبت تک نہ آتی۔

آپ کی زندگی مسافروں جیسی تھی۔ جس طرح ایک مسافر سفر میں اپنے پاس نہایت کم سامان رکھتا ہے اس طرح آپ نے زندگی کے سفر میں اپنے پاس اتنا کچھ رکھا جو آپ کے کے لئے اشد ضروری تھا۔ آپ دوسرے رہنماؤں کی طرح دو یا تین روزہ پروگرام کے لئے کپڑوں سے بھرا بریف کیس اپنے پاس نہ رکھتے۔ احتیاطاً ایک سوٹ اپنے ساتھ لے لیتے جس کے لئے بریف کیس کا ہونا لازمی نہ ہوتا۔ آغاز میں آپ کے پاس ایک چھوٹا سا تھیلا ہوا کرتا تھا جسے آپ کندھوں پر لٹکائے پروگرام میں پہنچ جاتے۔ بعد میں شاپنگ بیگ کا رواج آیا تو آپ اپنا سوٹ لفافہ میں بھی رکھ لیتے۔

ایک مرتبہ لندن میں ہونے والی ''ورلڈ اہل بیتؑ کانفرنس'' میں شرکت کے لئے جانے لگے تو آپ کی اہلیہ نے آپ کے بریف کیس میں دو تین عدد سوٹ رکھ دیئے۔ چار پانچ روز بعد آپ لندن سے واپس آئے تو آپ کے کپڑے اسی ترتیب سے پڑے ہوئے تھے۔ آپ نے صرف ایک شرٹ نکال کر استعمال کی تھی۔ گھر والوں کے استفسار پر معلوم ہوا کہ آپ نے وہاں کپڑے استعمال ہی نہیں کیے۔ جب انھوں نے شکوہ کیا تو فرمایا ''میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں وہاں کپڑے تبدیل کرتا رہتا۔ وقت مختصر تھا لہٰذا میں نے وہاں بڑی بڑی شخصیات سے مستفید ہونے کو ترجیح دی۔''

آپ کے ایک قریبی رفیق نے ایک دلچسپ واقعہ سنایا کہ ایک دفعہ کسی پروگرام میں شرکت کے لئے چند احباب ڈاکٹر صاحب کے ساتھ گئے۔ پروگرام دو تین روز کا تھا لہٰذا ہر ساتھی نے اپنے بیگ میں ایک آدھ سوٹ رکھا، نشست معززین شہر کے ساتھ تھی چنانچہ احباب نے ڈاکٹر صاحب سے التماس کی وہ رات کو سوتے وقت اپنا لباس تبدیل کرلیا کریں تا کہ پتلون شرٹ سلوٹوں سے محفوظ رہے۔ جتنے احباب آپ کے ہمراہ تھے ان میں سے کسی کا لباس بھی آپ کو فٹ

نہ آتا تھا۔ چنانچہ آپ کو ایک لمبا قمیض اور دھوتی پہننے کے لئے دی گئی۔ آپ نے دھوتی باندھنے سے خاصا گریز کیا تاہم مجبور کے باعث آپ کو ایسا کرنا پڑا۔

چونکہ ڈاکٹر صاحب انتہائی مہذب شخصیت تھے لوگوں کے سامنے قمیض تک اتار کر بیٹھنا آپ کے لئے ناممکن ہوتا تھا۔ اس لئے آپ قمیض اور دھوتی کے ساتھ رات بھر نہ سو سکے۔ صبح احباب کی آنکھ کھلی تو انھوں نے آپ کو جاگتے دیکھا۔ احباب نے گزری شب کے بارے میں پوچھا تو آپ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ''بہت فضول قسم کا لباس ہے'' اس موقع پر برادران نے خاصا مزاح کیا اور زندگی میں کبھی کبھار اس واقعہ کی یاد میں آپ بھی محظوظ ہوتے رہے۔ بقول شاعر۔

پھرا ہوں کوچہ بہ کوچہ متاع درد لئے
اگرچہ خلق میری سادگی پہ ہنستی تھی

آپ اکثر اوقات پتلون شرٹ میں گزارتے ٹائی لگانے یا اضافی کوٹ پہننے سے گریز کرتے۔ کبھی کبھار چھٹی کے روز شلوار قمیض پہن لیتے۔ آپ شیخ زید اسپتال میں تھے کہ وہاں کے چیئرمین نے آپ کو ٹائی لگانے کی تکرار کی مگر آپ اس مسئلہ پر اسے ہر بار ٹال گئے۔ آخر ایک بار وہ امریکہ گئے واپس لوٹے تو انھوں نے آپ کو ٹائی کا تحفہ دیا۔ ان کے اصرار پر آپ نے یہ تحفہ قبول کرلیا مگر پھر بھی استعمال نہ کیا۔ ایک مرحلہ پر چیئرمین نے کہا ''محمد علی ٹائی لگانا کہیں فقہ جعفریہ میں حرام تو نہیں ہے۔۔۔؟'' آپ نے جواباً فرمایا ''جناب! اسلام میں جائز نہیں ہے'' اس جواب کے بعد انھوں نے پھر کبھی اصرار نہ کیا۔

چونکہ آپ اپنے جسم کی زیادہ حفاظت کرتے تھے۔ موٹاپا سے آپ کو از حد نفرت تھی اس لئے آپ عمر بھر سمارٹ اور چاک و چوبند رہے۔ جسم میں تبدیل نہ آنے کے باعث آپ لباس کو برسوں تک استعمال میں لاتے۔ آپ کے پاس ایک عدد کوٹ تھا جو نہ جانے آپ نے کب سلوایا تھا۔ شدید سردیوں کے موسم میں کبھی کبھار یہ کوٹ آپ کے گھر سے باہر نکل آتا۔ ایک مرتبہ ایک میٹنگ میں آپ یہ کوٹ پہن کر آئے تو خاصے خوبصورت لگے۔ اس محفل میں شریک ایک

برادر نے مجھے بتایا کہ ''آج تو ڈاکٹر صاحب نے کوٹ پہنا ہوا تھا اور بہت خوبصورت لگ رہے تھے دعا کریں کہ انھیں نظر نہ لگ جائے۔''

آپ کے پاس سبز رنگ کی ایک ''کمانڈو جیکٹ'' تھی جسے آپ مخصوص انداز میں استعمال کرتے۔ اس کے بازوؤں میں اپنے بازو کم ڈالتے صرف کندھے پر لٹائے رکھتے۔ آپ کا یہ انداز اس قدر مقبول ہوا کہ تنظیم ساتھیوں نے اسے بطور ''اسٹائل'' اپنالیا۔

ان احباب کا خیال تھا کہ شاید آپ بازار جانے اور لباس خریدنے سے پرہیز کرتے تھے لہٰذا وہ آپ کے لئے قیمتی لباس کا تحفہ لاتے مگر آپ یہ اچھے کپڑے اپنے قریبی ساتھیوں میں تقسیم کر دیتے۔

ایک دفعہ آپ کے ایک جانثار نوجوان نے آپ کی استعمال شدہ شرٹ پہنی ہوئی تھی اور وہ احباب کی محفل میں اعزاز سمجھ رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ایسے انسان کے استعمال شدہ لباس کو زیب تن کرنا تو کجا بلکہ ان کے جسم سے مس شدہ لباس کا پہننا بھی سعادت ہے اس نوجوان نے دعا کی کہ خدا کرے کہ اس لباس کے اثرات میرے وجود میں داخل ہوں اور میں بھی راہ خدا میں ڈاکٹر صاحب کی طرح متحرک رہوں۔''

آپ قیمتی لباس سے اس قدر الرجک تھے کہ ایک مرتبہ ''یوم القدس'' کے موقع پر ایک دوست امریکی صدر اور اسرائیلی وزیراعظم کا پتلا بنانے کے لئے انارکلی سے دو پتلون شرٹ لائے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کی قیمت پوچھی تو معلوم ہونے پر مزاحاً کہا ''بدبختوں کے بڑے قیمتی لباس لائے ہو'' یہ سن کر تنظیمی ساتھی نے جواب دیا ''ڈاکٹر صاحب صدر اور وزیراعظم کے پتلے بناتے ہیں خرچ تو ہوگا۔''

ایک مرتبہ کسی پروگرام میں شرکت کے لئے آپ دوست کو بلانے اس کے گھر گئے۔ تو اس نے نہانے، کپڑے استری کرنے اور جوتے پالش کرنے میں خاصی دیر لگا دی، وہ معطر ہو کر گھر سے نکلے۔ گاڑی میں بیٹھے تو آپ نے فرمایا ''عزیز دوست صفائی نصف ایمان ہے مگر کپڑوں اور جوتوں کو اتنی اہمیت نہ دیں کہ وہ آپ کے سر پر سوار رہیں۔ اچھا لباس پہننا بھی اچھی بات ہے مگر

یاد رکھیں کہ لباس انسان کی قیمت نہیں بڑھاتا بلکہ انسان سے لباس اور زمان و مکان کی قیمت میں اضافہ ہوتا ہے۔۔۔

سفیر انقلاب کی اس فکر سے یہی اخذ ہوتا ہے کہ ریشم زیب تن کرنے سے انسان قیمتی نہیں بنتا بلکہ انسان کی وجہ سے کھدر بھی قیمتی بن جاتا ہے۔۔۔ تخت و تاج اور محلات انسان کی قیمت میں اضافہ نہیں کرتے بلکہ انسان کی بدولت بوریا اور جھونپڑی کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں دور حاضر کی بہترین مثال امام خمینیؒ رضوان اللہ علیہ کی ذات گرامی ہے کہ آج شاہ ایران کے محلات کو لوگ نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جبکہ پیر جماران کا بوسیدہ گھر محبتوں کا محور بنا ہوا ہے۔ شاہ ایران کے ہیروں سے مزین تخت و تاج باعث عزت نہیں ہیں جبکہ امام خمینیؒ کا ٹاٹ نما بوسیدہ قالین بوسہ گاہ بنا ہوا ہے۔

سفیر انقلاب کی فکر کا نچوڑ یہ تھا کہ ایک مجاہد کی پسینہ سے شرابور وردی شہنشاہوں کے معطر پیراہن سے زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ اسلام میں شہید کو اس کے خون آلود لباس کے ساتھ دفنانے کی تاکید ہے کیونکہ شہید کا جسم بارگاہ الٰہی میں اتنا باعظمت ہوتا ہے کہ اس پر اس کے اپنے لباس کے علاوہ کوئی اور لباس نہیں جچتا۔

آپ آئی۔ ایس۔ او اور تحریک جعفریہ پاکستان کے صرف رہنما ہی نہیں تھے بلکہ بانی بھی تھے۔ اس کے علاوہ ملت جعفریہ کے کئی فلاحی ادارے آپؒ کی زیر سرپرستی چل رہے تھے۔ آپؒ کا تعارف صرف ملکی حدود تک محدود نہ تھا بلکہ بین الاقوامی سطح پر آپ اسلام کے ایک عظیم فرزند کے حوالے سے جانے جاتے تھا۔ معاشرتی طور پر ایک ڈاکٹر ہونے کے علاوہ لوگ آپؒ کا بے پناہ احترام کرتے تھے۔ آپؒ کی ایک چٹ پر لوگ ہزاروں روپے دے دیتے۔ آپؒ کی لبوں کی ایک جنبش پر لاکھوں روپے آپ کی گود میں ڈال دیے جاتے۔ بات صرف اسی اعتماد تک محدود نہ تھی بلکہ ہزاروں نوجوان اپنی زندگیوں کے بارے میں آپؒ کے اشارے کے منتظر رہتے۔ اتنی بڑی عزت کے باوجود آپؒ نے ایک پل کے لئے بھی تکبر نہ کیا۔

آپؒ کی کوشش ہوتی تھی کہ ہر جلسہ یا میٹنگ میں پہلے پہنچیں تاکہ دیر سے پہنچنے پر لوگوں کو

احتراماً اٹھنا نہ پڑے۔ اگر کبھی میٹنگ یا کسی پروگرام میں تاخیر سے پہنچتے تو جہاں جگہ ملتی جلدی سے بیٹھ جاتے۔ بعض اوقات بڑے پروگراموں میں آپ اتنا پیچھے بیٹھے ہوتے کہ سٹیج سیکرٹری کی نظر آپؒ پر نہ پڑتی اور یوں آپؒ کی اہم مہمانوں میں نشست خالی رہتی۔

قومی اجتماعات میں آپؒ کو ہمیشہ وی۔آئی۔پی کارڈ جاری ہوتا مگر آپؒ یہ کارڈ کبھی استعمال نہ کرتے اور نہ ہی کارڈ کے طفیل (VIP) نشستوں پر بیٹھنے کی خواہش کرتے۔ آپؒ کارکنوں میں کھڑے ہو کر مقررین کا خطاب سنتے یا عمومی نشستوں پر بیٹھ کر مستفید ہوتے۔ بعض اوقات عوام کے ہجوم میں اضافہ ہوتا تو آپ اپنی نشست تک ان کے حوالے کرتے۔ مگر عام طور پر ایک عام انسان کو محسوس نہ ہوتا تھا کہ اسے اپنی نشست پیش کرنے والا کتنا بڑا انسان ہے۔۔۔۔؟

آپؒ جس طرح کسی کی غیبت سننے پر منہ پھیر لیتے اسی طرح اپنی تعریف کے وقت بات کا پہلو بدل دیتے۔ آپؒ چونکہ ہزاروں نوجوانوں کی پسندیدہ شخصیت تھے اس لئے برادران جب بھی آپؒ کے بارے میں تعریفی جملے ادا کرتے تو آپؒ انھیں ایسے کرنے سے منع فرماتے۔

ایک مرتبہ آئی۔ایس۔او پاکستان کی مجلس عاملہ کا اجلاس جعفریہ کالونی لاہور میں منعقد ہوا۔ شام کی نشست ''سابق مرکزی صدور طلباء کے حضور'' کی کمپیرنگ مجھے کرنا تھی۔ نشست کے آغاز سے قبل ڈاکٹر صاحب نے مجھے بلایا اور کہنے لگے کہ ''مجھے سٹیج پر نہیں بلانا آج میری خواہش ہے کہ میں سامعین میں بیٹھ کر نوجوان سابق مرکزی صدور کے خیالات ایک مبصر کی حیثیت سے سنوں'' میں ان کی فکر کی گہرائی تک نہ پہنچ سکا۔ چنانچہ میں نے سب سے پہلے انھیں سٹیج پر تشریف لانے کی دعوت دی۔ آپؒ دعوت پر تشریف لائے اور اپنی مخصوص نشست پر بیٹھ گئے۔ آپ کے بعد باری باری سابق مرکزی صدور تشریف لائے اور انھوں نے بھی اپنی نشستیں سنبھالیں۔ البتہ پروگرام کے اختتام پر آپؒ نے اظہار ناراضگی فرمایا اور کہنے لگے کہ ''خطاب کی دعوت دے دیا کریں آئندہ گھنٹوں تک سٹیج پر نہ بٹھایا کریں۔'' چونکہ آپؒ ہر محفل کی جان ہوا کرتے تھے اور آپؒ کی شخصیت حاوی ہوتی تھی اس لئے آپؒ کی شان وعظمت کے پیش نظر آپؒ کو سٹیج پر پہلے دعوت دی جاتی اور آخر میں خطاب کی گزارش کی جاتی جس کی وجہ سے آپؒ کو حاضرین جلسہ کے

سامنے دیر تک اونچے سٹیج پر بیٹھنا پڑتا جو آپ کو گراں گزرتا۔ آپؒ اپنے امام اول حضرت علی علیہ السلام کے فرمان ''سب سے بڑا فخر یہ ہے کہ فخر نہ کریں'' کے تابع تھے۔''

اس پروگرام میں جب سابق مرکزی صدر برادر سید تصور حسین نقوی سے پسندیدہ شخصیت کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے ڈاکٹر صاحب کا نام لیا جسے سن کر آپؒ نے ''استغفراللہ'' پڑھنا شروع کر دیا۔ ایسے ہی جب کچھ احباب محافل میں آپؒ کو بطور آئیڈل پیش کرتے تو آپؒ انھیں منع فرماتے اور تاکید کرتے کہ ''وہ اپنی پسند کا معیار بلند کریں۔ تنظیمی افراد کی کم از کم پسندیدہ شخصیات آئمہ طاہرینؑ ہونے چاہئیں۔''

ایک دفعہ چند احباب کی محفل میں آپؒ کا ذکر ہونے لگا تو میرے منہ سے میرے دل کی بات چھلک گئی اور میں نے کہا کہ ''ڈاکٹر محمد علی نقویؒ ایک ایسے انسان ہیں جن کا نام بھی باوضو ہو کر لینا چاہیے۔ کسی ایک برادر نے ان تک یہ بات پہنچا دی اور آپ نے پہلی ملاقات میں مجھے سختی سے ڈانٹا۔

شہادت سے تقریباً بیس روز قبل آپؒ سے ملاقات ہوئی برادر ارشاد حسین ناصر کمالیہ اور میں نے آپؒ کے حضور تجویز پیش کی کہ آئی۔ایس۔او کی تاریخ اور سابق مرکزی صدور کے انٹرویوز پر مبنی ایک کتاب منظر عام پر لانی چاہیے تاکہ برادران کے خیالات اور افکار سے نئے ساتھی اپنی سمت کا تعین کریں اور عمل پیرا ہوں۔ آپؒ نے یہ سنتے ہی نفی کی کہ ہم جیسے گناہگاروں اور نکمے لوگوں کی زندگی بھلا کس کے لئے نمونہ عمل بنے گی۔ اگر آپ نے زحمت کرنی بھی ہے تو پھر عقائد کی حقیقت اور آئمہ طاہرینؑ کی زندگی اور اسوہ حسنہ کو اجاگر کریں تاکہ صحیح معنوں میں نوجوانوں کی رہنمائی حاصل ہو۔

عام طور پر محسوس کیا گیا ہے کہ بعض شخصیات کی لفظی کسرنفسی کے پیچھے تکبر کی بو آ رہی ہوتی ہے۔ مگر آپ نہ صرف کسرنفسی سے کام لیتے بلکہ کڑھتے دل کے ساتھ فرماتے کہ ''خدا نے ہمیں اسلام کی خدمت کی توفیق دی مگر ہم اس توفیق سے انصاف نہ کر سکے۔''

زندگی کے آخری ایام میں اپنے قریبی رفیق برادر نثار ترمذی سے کہا ''زندگی کے ۴۳ سال بیت گئے، جذبہ اور جرات کی عمر گزر گئی مگر ہم قوم اور اسلام کی خاطر خواہ خدمت نہ کر سکے'' نثار بھائی

نے کہا ''ڈاکٹر صاحب آپ نے تو قوم اور اسلام کی بے پناہ خدمت کی ہماری زندگی کو دیکھیں جو بالکل ضائع چلی گئی'' یہ سنتے ہی آپؒ نے فرمایا ''جو میں نے قوم کے لئے سوچا تھا وہ نہ کر سکا۔''

نہ جانے آپ نے اپنی مظلوم قوم کے لئے کیا سوچا تھا جو اتنا کچھ کرنے کے باوجود بھی کچھ نہ کرنے کے درد کا اظہار کرتے رہے۔

ایک اور خصوصیت جو آپ میں موجود تھی وہ کم خوری کی علامت تھی آپؒ سفر و حضر، تنظیمی پروگراموں اور پر تکلف دعوتوں پر انتہائی تھوڑا کھاتے۔ ہم نے برسوں کی قربت میں آپ کو کسی کھانے کی فرمائش کرتے نہیں پایا کبھی یہ دیکھنے کی نوبت بھی نہیں آئی کہ آپ نے کسی موقع پر خدا کی کسی نعمت پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہو۔ یہاں تک کہ ہمیں اتنا معلوم نہیں ہو سکا کہ آپؒ کی پسندیدہ یا مرغوب غذا کیا تھی۔۔۔۔؟

حضرت علی علیہ السلام کا فرمان ہے کہ ''پیٹو کبھی ترقی نہیں کرتا اس لئے کہ اس کا پیٹ اس کے ذہن پر سوار ہو جاتا ہے وہ عقل کو مثبت سمت میں استعمال نہیں کر پاتا اس کی تمام سوچ پسندیدہ غذاؤں اور مرغن کھانوں کی جستجو میں مصروف رہتی ہے۔''

شہید مظلوم علامہ عارف حسین الحسینیؒ اپنے ایک درس میں فرماتے ہیں کہ ''جسم کی اکثر بیماریاں خوراک سے پیدا ہو جاتی ہیں اور بسیار خور ہمیشہ بیماریوں میں مبتلا رہتا ہے۔ کھانے کی لذت کا دلدادہ ہونا بھی ایک بیماری ہے جو خدا کی نعمتوں میں تفریق کا باعث بنتی ہے۔

علامہ سید عارف حسین الحسینی شہیدؒ کے بارے میں مستند روایت ملتی ہیں کہ آپ کے عزت واحترام میں مومنین پر تکلف ضیافتوں کا اہتمام کرتے مگر آپ مرغن یا زیادہ لذیذ غذا میں ہمیشہ پانی ڈال دیتے اور کھانے کی لذت ختم کر کے تناول فرماتے۔

آپ خودسازی کے دروس میں اکثر اس بات کا ذکر فرماتے کہ انسان کو اتنا کمزور نہیں ہونا چاہیے کہ اسے کھانے کی ایک پلیٹ مکمل طور پر اپنی طرف مائل کر لے یا اس کا نفس کھانے کی لذت پر مجبور ہو جائے۔

چونکہ سفیر انقلاب آئمہ طاہرینؑ کی سیرت پر حتی المقدور عمل پیرا تھے اور شہید علامہ عارف

حسین الحسینی جیسی ملکوتی شخصیت کے افکار کا عکس تھے اس لئے آپؒ دیگر امور کی پابندی کے علاوہ کم خوری پر کاربند تھے۔

میں گذشتہ چھ سال کے عرصہ سے آپ سے مربوط رہا ہوں جہاں تک میں نے اخذ کیا ہے کہ آپؒ صبح سویرے گھر سے ہلکا پھلکا ناشتہ کر کے ملازمت کے لئے نکلتے۔ ڈیوٹی کے اختتام پر سیدھا تحریک جعفریہ کے دفتر پہنچتے۔ دن بھر کی سرگرمیوں کا جائزہ لیتے ملک بھر کے حالات کی خبر گیری کرتے۔ دو اڑھائی گھنٹے تنظیمی خدمات سرانجام دیتے اور ٹھیک پانچ بجے اپنے کلینک پر پہنچ جاتے۔ بیسیوں دفعہ اسپتال سے تحریک کے دفتر ایک ساتھ پہنچنے کا اتفاق ہوا۔ آپؒ کا معمول تھا کہ دفتر کے ملازم سے روٹی کا پتہ کرتے جو کچھ مل جاتا صبر و شکر کے ساتھ کھا لیتے یا اسے پانچ روپے دے کر تین روپے کی دال سبزی اور دو روپے کی روٹیاں منگوا کر پیٹ بھر لیتے۔

ایک مرتبہ میں آپ کے ساتھ شیخ زید اسپتال سے تحریک جعفریہ کے دفتر مسلم ٹاؤن پہنچا۔ آپؒ حسب معمول کھانا منگوانے لگے تو ملازم کو پانچ روپے سپرد کرتے ہوئے فرمایا ''شاباش کھانا کھلا دو'' اس نے پوچھا ڈاکٹر صاحب دو آدمیوں کے لئے دو روٹیاں کافی ہیں'' تو آپ نے فرمایا ہاں۔۔۔ ہاں ایک روٹی میں اور ایک تسلیم میاں کھا لیں گے'' میں نے یہ سنتے ہوئے عرض کی حضور آپ کا پیٹ نور سے بھرا ہوا ہے ہمارا ایک روٹی پر گزارہ نہیں ہوتا'' مسکرائے اور کہنے لگے پھر میرا بجٹ تو پانچ روپے کا ہے ایک روپیہ تم خود دے دو۔۔۔ باقی دال کی ایک پلیٹ کافی ہے۔۔۔۔''۔

اگر آپ دوپہر کا کھانا کھا لیتے تو شام کے کھانے سے پرہیز کرتے۔ کلینک پر جاتے تو سموسہ اور چائے سے بھوک مٹا لیتے۔ اگر شام کا کھانا کھانا مقصود ہوتا تو دوپہر کو مکئی کے ایک ''سٹہ'' سے پیٹ بھر لیتے۔ آپؒ دیگر رہنماؤں کی طرح اپنے آگے دسترخوان نہ سجاتے نہ تحریک کے دفتر کے ملازمین کو کھانا کھانے تک پابند رکھتے، اخبار میں لپٹی ہوئی روٹیاں اپنے سامنے رکھ لیتے اطمینان سے کھانا کھاتے شکر اُللہ پڑھ کر اپنے کام میں مصروف ہو جاتے۔

آپؒ کا معمول تھا کہ آپؒ گھر بہت دیر سے لوٹتے۔ آٹھ بجے شب تک کلینک میں

مریضوں کی خدمت کرتے اور آٹھ بجے کے بعد شہر میں جاری کیے گئے دروس میں شرکت فرماتے اور رات گئے تک قومی امور نمٹاتے رہتے۔ گھر لوٹتے تو عموماً گھر والے سو چکے ہوتے جو کچھ گھریلو کچن میں میسر آتا کھا کر سو جاتے۔

آپؒ کھانے کے قطعاً رسیانہ تھے۔ بڑے بڑے پروگراموں میں شرکت کرتے اختتام پر مہمانوں کو کھانے کی دعوت دی جاتی تو آپ عام طور پر کھانا کھائے بغیر چلے جاتے۔ کھانے پر ٹوٹ پڑنے والے لوگوں کو دیکھ کر خاصے رنجیدہ ہوتے اگر ایسا کسی تنظیمی ساتھی سے ہوتا دیکھتے تو افسردگی کے ساتھ اس کے نوٹس میں بات لاتے۔

بعض اوقات آپ کی مصروفیات اس قدر زیادہ ہوتیں کہ آپ کو دن بھر کھانا کھانے کا موقع نہ ملتا۔ یوں آپؒ چائے کے ذریعے بھوک ختم کرتے رہتے۔ آپ نے ہفتہ بھر دروس کا اہتمام کیا ہوا تھا اور لاہور کے مختلف علاقوں میں ہر شام دروس میں شرکت کرتے۔ حتیٰ المقدور صاحب خانہ کے گھر کھانا کھانے سے گریز کرتے۔ ایک مرتبہ جعفریہ کالونی لاہور میں شام کے دروس میں شریک ہوئے اسی روز مصروفیت کے باعث آپؒ دن بھر کھانا نہ کھا سکے۔ احباب نے بھی کھانے کا پوچھا تو بھوک کے باوجود ٹال گئے۔ واپسی پر ہمسفر احباب نے تکلف کرنے کا شکوہ کیا تو آپ نے فرمایا درس کا وقت میری بھوک سے زیادہ اہم تھا۔ میں اپنے ذاتی مسئلہ کی وجہ سے دیگر احباب کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ایک مرتبہ آپؒ کے محافظین احباب نے خصوصی کھانا تیار کیا اور آپؒ کو دعوت دی۔ آپؒ ان کے ہاں پہنچے، کھانا کھایا۔ ان کا خیال تھا کہ ڈاکٹر صاحب کھانے کی حوصلہ افزائی فرمائیں گے مگر آپ نے ایسا نہ کیا۔ تھوڑی دیر بعد کسی دوست نے کھانے کے بارے میں تاثرات لئے تو آپؒ نے فرمایا ''میں نے کھانا بھوک ختم کرنے کے لئے کھایا تھا لذت کے لئے نہیں'' یعنی آپؒ خوردن برائے زیست نہ کہ زیست برائے خوردن'' (کھانا زندگی کے لئے ہوتا ہے نہ زندگی کھانے کے لئے) کے مقولہ پر عمل پیرا تھے۔

آپؒ کی کوشش ہوا کرتی تھی کہ ایک دسترخوان پر زیادہ کھانے نہ کھاتے تھے عموماً تھوڑے

چاول، دہی، یا سلاد لیا کرتے تھے اور ایک دن میں دو بار پر تکلف کھانا کھانے سے گریز کرتے۔ اپنی شہادت سے چند روز قبل آپؒ عید کے روز احباب سے عید ملتے ملاتے برادر سید راشد عباس کے قصبہ پہنچے۔ شام کے کھانے کے بارے میں آپؒ نے میزبانوں سے درخواست کی کہ وہ آپ کو ایک روٹی اور ایک کپ چائے دے دیں۔ آپؒ نے واضح کیا کہ اگر اس کے علاوہ تکلف کرنے کی کوشش کی گئی تو آپ ہرگز کھانا نہیں کھائیں گے۔ میزبانوں نے اپنی محبت کے بدولت تکلف کیا۔ کھانا سامنے آیا تو آپؒ نے بصد معذرت واپس لوٹا دیا اور چائے کا ایک کپ پی کر سو گئے۔ میزبانوں نے اصرار کی تو آپؒ برہم ہوئے کہ آپ کی درخواست پر توجہ نہ دی گئی۔

آپؒ بھوکے بھی تھے مگر دوپہر کو اچھا کھانا کھانے کی وجہ سے شام کا پر تکلف کھانا نہیں کھانا چاہتے تھے۔ آپؒ خدا کی نعمتوں کے بارے میں اپنے جد امجد حضرت علی علیہ السلام کا حقیقی پیروکار تھے۔ یہ بات تاریخ کے دامن میں موجود ہے کہ امام اولؑ اپنی زندگی کا آخری روزہ اپنی دختر حضرت ام کلثوم سلام اللہ علیھا کے گھر افطار کرنے لگے تو انھوں نے جو کی روٹی، نمک اور دودھ کا گلاس پیش کیا۔ امامؑ نے اپنی دختر کو بلا کر فرمایا ''بیٹی! علی بیک وقت خدا کی تین نعمتوں سے روزہ افطار کرنے کے قابل نہیں'' دختر نے نمک اٹھانے کی کوشش فرمائی تو حضرتؑ نے ان سے نمک لے لیا اور دودھ کا گلاس واپس کر دیا۔

سفیر انقلاب کا نظریہ یہ تھا کہ انسان کو اس چیز پر توجہ دینی چاہیے جو اس کے کام آ سکے۔ جسم کیڑے مکوڑے کی خوراک بنتا ہے اسے فربہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ مومن کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ زیادہ رونے کی وجہ سے ان کی آنکھیں سفید ہو جاتی ہیں۔ زیادہ روزے رکھنے کی وجہ سے ان کے پیٹ اندر دھنس جاتے ہیں۔ دعا کرتے کرتے ان کے ہونٹ خشک ہو گئے ہیں اور شب بیداری کی وجہ سے ان کا رنگ پیلا پڑ گیا ہے اور ان کے چہروں پر خاشعین کی علامات ہیں۔

سفیر انقلاب جہاں فعل و عمل سے حضرت علی علیہ السلام کے لاریب مومن تھے وہاں جسمانی لحاظ سے بھی امامؑ کے فرمان پر پورے اترتے تھے۔ آپؒ ہی فاقہ کش تھے جس کے

بارے میں حضرت علامہ محمد اقبالؒ نے فرمایا تھا کہ اسلام دشمن قوتیں ایسے لوگوں کی زندگی سے خائف ہوتی ہیں اس لئے وہ منصوبہ بندی کرتی ہیں کہ۔

یہ فاقہ کش جوموت سے ڈرتا نہیں ذرا
روح محمدؐ اس کے بدن سے نکال لو

قرآن مجید میں ارشاد رب العزت ہے:

کہ ''میرے بندے وہ ہیں جو صبر کرتے ہیں، سچے ہیں، قناعت کرتے ہیں، میرے راہ میں خرچ کرتے ہیں اور رات کے پچھلے پہر استغفار کرتے ہیں۔ یعنی خدا کو یاد کرتے ہیں'' اس آیت کریمہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ صبر وقناعت، صداقت، خدا کی راہ میں قربانی اور رات کو خدا کی یاد کے لئے کم سونا خدا کے بندوں کی علامت ہے۔

تفسیر میں ہے کہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے کا مقصد صرف اقربا یا مستحقین میں پیسے یا اناج تقسیم کرنا نہیں بلکہ خدا پاک نے جتنی نعمتیں انسان کو عطا کی ہیں ان کو راہ خدا میں خرچ کرنے کا حکم ہے۔ بولنے، لکھنے اور کام کرنے کی صلاحیت بھی خدا کی نعمتیں ہیں اللہ پر اثر مقرر، مبلغ ،لکھاری، کارکن یا مجاہد کا ان صلاحیتوں کو مثبت بروئے کار لانا خدا کے راستے میں خرچ کرنا ہے۔

سفیرانقلاب کی زندگی کا بغور مطالعہ کیا جائے تو وہ خداوند کریم کے بندہ کامل کی تمام شرائط پر پورے اترتے ہیں۔ آپؒ عقیدہ اور گفتگو کے سچے، صابر وشاکر، قناعت پسند، راہ خدا میں اپنا سب کچھ قربان کرنے والے اور رات کو یاد خدا اور اس کے دین کی خدمت کے لئے بہت کم سونے والے تھے۔

جیسا کہ گذشتہ صفحات میں بیان کیا جاچکا ہے کہ آپؒ صبح سویرے گھر سے نکلتے اور رات گئے گھر واپس لوٹتے۔ آپؒ کا سارا وقت رزق حلال کے حصول اور دین اسلام کی خدمت میں صرف ہوتا۔ دن بھر آپ مسلسل مشین کی طرح متحرک رہتے۔ وقت کے اتنے قدردان تھے کہ ایک پل ضائع نہ ہونے پاتا۔ حضرت علی علیہ السلام کا یہ فرمان کہ ''جو وقت کو برباد کرتا ہے وقت اسے برباد کرتا ہے'' آپؒ کی زندگی کا اصول تھا جس پر آپ تمام عمر کاربند رہے۔

آپؒ وقت کو اتنا استعمال کرتے کہ وقت تھک کر آپ کی گود میں آرام کرتا تھا۔ کھانا کھاتے غسل کرتے، کپڑے بدلتے، احباب سے ملتے، یہاں تک کہ گاڑی چلاتے تو آپ کو ہر پل وقت کا خیال رہتا۔ کپڑے بدل کر شیشے کے سامنے سنورنا یا زلفیں سنوارنا تو آپؒ کے آئین حیات کے منافی تھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ آپؒ گھر میں کپڑے بدلتے بدلتے بیلٹ ہاتھ میں لیتے، بالوں پر ہاتھ مارتے ہوئے گھر سے جلدی نکلتے، بیلٹ اور جوتوں کے تسمے گاڑی میں ٹھیک کرتے۔

ایک مرتبہ بوٹوں کے بارے میں کسی دوست نے کہا کہ جوتے اچھے ہیں، آپ کہنے لگے دوڑنے میں مدد دیتے ہیں مگر خامی یہ ہے کہ تسمے باندھنے میں وقت ضائع ہوتا ہے اسی طرح آپ نے موٹر سائیکل تیز چلائی تو دوست نے وجہ پوچھی فرمایا ''بندہ خدا آہستہ چلنے سے وقت کا ضیاع ہے۔

احباب آپؒ کا مزاح سناتے ہیں کہ آپ کے پاس جب بھی کوئی مریض 'معدے کی خرابی' کی شکایت لے کر آتا تو آپ مزاحاً کہتے ''بندۂ خدا شکر کرو کہ آپ کا وقت ضائع نہیں ہوتا۔''

زندگی کے نظم ونسق اور امور کے بجالانے میں آپ اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ آپؒ کے طرز زندگی کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے انسانی جسم میں کمپیوٹر نصب کر دیا ہے۔ جو پروگراموں کو ترتیب اور انجام دینے میں کامیابی کے ساتھ مصروف کار ہے۔ وقت کی قدردانی اور اسلام کی خدمت کے تسلسل کو دیکھ کر ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے آپ زندگی کے چند روز بھی مشروط لائے ہیں۔

آپؒ فرمایا کرتے تھے کہ ''اگر انسان کی جیب سے اس کی کچھ رقم وغیرہ گر جائے یا کٹ جائے تو وہ بے حد افسردہ ہو جاتا ہے مگر ہر روز ہماری زندگی کے چوبیس گھنٹے ہمارے ہاتھوں سے نکل جاتے ہیں لیکن ہم ان کا احساس ہی نہیں کرتے۔

لاہور سے باہر کا کوئی ساتھی اگر کام کے لئے لاہور آتا تو آپؒ ملاقات میں درجہ آمد دریافت کرتے۔ اگر کام معمولی ہوتا تو آپؒ نہایت افسوس کے ساتھ فرماتے کہ وہ آئندہ ایسے کاموں کے لئے فون پر رابطہ کر لیا کریں یا خط لکھ دیا کریں مگر وقت ضائع نہ کیا کریں۔

آپؒ اپنی قوم کے کسی نوجوان کو بے روزگار دیکھتے تو فرماتے کہ اس کا قیمتی وقت ضائع ہو رہا ہے۔ چنانچہ اس درد اور احساس کی بدولت آپؒ اسے کسی نہ کسی کام میں مصروف رکھنے کی

کوشش کرتے۔

شیخ زید اسپتال میں آپ ایسے عہدے پر فائز تھے جہاں آپ کو صرف فائلوں پر دستخط کرنے پڑتے تھے یوں میری نوکری بھی کچھ ایسی ہی تھی البتہ کام کی نوعیت مختلف تھی۔ ایک روز آپؒ میرے پاس تشریف لائے کام کے بارے میں پوچھا۔ چائے پی اور فرمایا ''اس کا مطلب ہے کہ آپ اور میں وقت ضائع کر رہے ہیں' مجھے یہ بات گہرائی تک سمجھ نہ آئی تو آپؒ نے وضاحت فرمائی کہ یہ کام ''کلرکوں'' والے ہیں۔ یہ کام ان لوگوں کو کرنے چاہئیں جن کے صرف ہاتھ کام کرتے ہوں اور ان کی زندگی کا مقصد صرف کرسی پر بیٹھنا ہو۔ جن لوگوں کے ذہن کام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ان کے لئے یہ وقت کا ضیاع ہے'' اس موقع پر آپ نے اپنی نوکری سے مستعفی ہونے کے ارادہ کا اظہار فرمایا اور میرے لئے ''ہفت روزہ رضا کار لاہور یا ''المصطفی سکولز پروجیکٹ'' کو سنبھالنے کی خواہش کی۔

آپؒ پیشہ وارانہ طور پر انسانیت کے خدمت گار تو تھے ہی مگر اسپتال سے باہر بھی آپ کا یہ جذبہ نمایاں کارفرما تھا۔ ایک مرتبہ گاڑی پر اپنے دوستوں کے ہمراہ لاہور کی مصروف شاہراہ سے گزر رہے تھے دیکھا کہ ایک ضعیف شخص کے سائیکل سے اس کا سامان نیچے گر گیا ہے اور وہ مدد کا خواہاں بزرگ کسی مددگار کا منتظر کھڑا ہے۔ آپؒ کی گاڑی تیزی سے آگے نکلی تو آپ نے گاڑی روکی پیچھے مڑے اور گاڑی سے خود اتر کر بزرگ کی گٹھڑی اٹھائی اور اس کے سائیکل پر لاد دی۔ سامان کو رسی کے ساتھ مضبوطی سے باندھا اور بابا کو روانہ کیا۔۔۔ باباجان چل دیے مگر آپؒ اسے کچھ دیر تک دیکھتے رہے۔ جب آپ کو اطمینان ہوا کہ اب سامان نہیں گرے گا تو فوراً عازم سفر ہو گئے۔

ایک دفعہ آپؒ لاہور کے فیروز پور روڈ سے گزر رہے تھے آپ کا ساتھی گاڑی بڑی تیزی سے چلا رہا تھا کہ ایسے میں دو ٹانگوں سے ایک معذور انسان اچانک آگے آ گیا۔ ڈرائیور نے بریک لگائی اور گاڑی مشکل سے معذور کے قریب جا رُکی۔ آپؒ جلدی سے نیچے اترے معذور سے دست بستہ معافی مانگی اور اسے پکڑ کر سڑک کے دوسرے کنارے چھوڑے آئے۔۔۔ واپس لوٹے تو ڈرائیور ساتھی پر برس پڑے کہ انھوں نے گاڑی روک کر معذور کے گزر جانے کا

انتظار کیوں نہیں کیا۔ آپؒ اس واقعہ پر دن بھر اداس رہے اور اپنے احباب کو ایسے لوگوں کا احساس دلواتے رہے۔

خدمت انسانی کا ایک واقعہ یوں بھی ملتا ہے کہ ایک شب آپ ''مصباح القرآن ٹرسٹ'' کے ہفتہ وار اجلاس میں شرکت کے لئے جا رہے تھے دیکھا کہ ایک بڑھیا گندم کی بوری کے ساتھ کھڑی کسی مزدور کا انتظار کر رہی تھی۔ آپ اماں کے پاس گئے پریشانی کی وجہ پوچھی تو انھوں نے ماجرا سنایا۔۔۔ آپؒ نے اپنے ساتھ والے دوست کو آستین چڑھانے کا اشارہ کیا اور ان کا بازو پکڑ کر مزدوروں کی طرح بوری اٹھائی اور بڑھیا کے گھر (جو عمارت کی بالائی منزل پر تھا) کے کمرہ میں رکھ دی۔

سیرت آئمہ طاہرینؑ کی پیروی آپ کا شعار تھا۔ ایک مرتبہ شیعہ مذہبی نوجوان نے کسی بات پر آپ سے لڑائی کی یہاں تک کہ اس نے آپ کے گریبان میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی جو بہت سے دیکھنے والوں کو ناگوار گزری مگر آپؒ نے اپنے احباب کو اس پر ہاتھ ڈالنے سے روکا اور فرمایا کہ خدا اسے ہدایت کرے۔۔۔ کچھ عرصہ بعد آپؒ کو اطلاع ملی کہ وہ نوجوان بستر علالت پر ہے۔ آپ خبر ملتے ہی سیدھا اس کے گھر گئے۔ اس کی عیادت کی اور ہر ممکنہ تعاون کا یقین دلایا۔۔۔ کسی دوست نے آپ کے رویہ پر اعتراض کیا تو آپ نے فرمایا یہ نوجوان اگر میری ذات کا مخالف ہے تو کیا غم۔۔۔ ''میرے خدا'' رسولؐ اور آئمہ، کا مخالف تو نہیں ہے۔۔۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا معیار دوستی یا دشمنی خدا، رسولؐ اور ائمہ کی ذات تھی۔''

آپ نوجوانوں کی خداداد صلاحیتوں کے متعرف تھے ۔ باصلاحیت نوجوان سے مل کر آپ کو دلی مسرت ہوتی۔ آپ فرماتے کہ خدا کی بے مثال نعمتوں میں سے صلاحیت ایک بہت بڑی نعمت ہے جو شخص خدا کی عطا کردہ صلاحیتوں کو قوم، ملک اور اسلام کی خدمت کے لئے بروئے کار لاتا ہے وہ عدل کرتا ہے اور عدل تو بہت بڑی نیکی ہے۔''

آپؒ ملازم پیشہ نوجوانوں سے اکثر کہا کرتے تھے کہ وہ چوبیس گھنٹوں میں آٹھ گھنٹے راہ خدا میں ضرور استعمال کریں۔ آپؒ فرماتے ہیں کہ ضروری نہیں کہ دو گھنٹے جلسے، جلوس، میٹنگ یا دروس میں

صرف ہوں بلکہ ان دو گھنٹوں میں دین شناسی کے لئے مطالعہ کر لینا بھی وقت کا بہترین مصرف ہے۔

بعض اوقات بعض باصلاحیت نوجوانوں کے بارے میں فرماتے کہ ''فلاں نوجوان ضائع ہو گیا'' حالانکہ وہ بظاہر کسی نہ کسی نیک کام میں مصروف ہوتا تھا۔ آپ کا خیال ہوتا تھا کہ وہ شخص جتنی صلاحیتوں کا مالک ہے اور اس کی صلاحیتوں سے قوم کو جس قدر فائدہ پہنچ سکتا ہے نہیں پہنچ رہا۔ ایسے نوجوانوں سے بالمشافہ ملتے تو علامہ محمد اقبالؒ کی فکر کو اپنے لبوں پر لاتے ۔

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کردے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

یہ بات دعویٰ سے کہی جا سکتی ہے کہ جس شخص نے آپ کے ساتھ زندگی کے لمحات گزارے ہیں وہ شاہد ہے اس نے آپ کو ایک لمحہ بھی وقت ضائع کرتے نہیں پایا۔ آپؒ یا تو قومی امور میں مسلسل متحرک رہتے یا فلاح کے لئے فکرمند۔۔۔؟

آپؒ کا معمول تھا کہ عموماً چھٹی کا روز لاہور سے باہر تنظیمی پروگراموں میں صرف کرتے۔ راتیں بسوں میں بسر کرتے، دن نوجوانوں کے درمیان گزارتے۔ نفس آپ کے تابع تھا۔ طویل سفر کے دوران میں آپ عادتاً بس کی سیٹ یا ٹرین میں اپنی ٹانگیں سمیٹتے اور چند گھنٹوں میں نیند مکمل کر لیتے۔ پروگرام میں شرکت کرتے یا واپسی پر دفتر پہنچتے۔ آپ کے چہرے پر تھکاوٹ کے آثار ہوتے نہ آنکھوں میں نیند کا خمار ہوتا، چمکتی آنکھوں اور خوشگوار طبیعت کے ساتھ آپ مسلسل مصروف کار رہتے۔ جمائیاں یا انگڑائیاں لینا آپ کی تہذیب کے خلاف تھا۔ کئی کئی گھنٹوں کی مسافت اور کئی کئی گھنٹوں کی ریاضت آپ پر تھکاوٹ طاری نہ کرتی۔

آپؒ انسان تھے کبھی کبھار بہت زیادہ تھک جاتے تو سر کے نیچے بازو رکھ کر یا بسا اوقات اپنے پنجہ میں پنجہ ڈال کر دونوں ہاتھ سر کے نیچے ڈال دیتے اور تھوڑی دیر کے لئے آنکھیں بند کر لینے سے آپ کی تھکاوٹ دور ہو جاتی۔

طویل سفر میں آپ کے پاس سفری بستر ہوا کرتا تھا۔ جہاں موقع ملتا اور ضرورت ہوتی آپؒ کبھی ٹرین کے فرش پر اور کبھی پلیٹ فارم پر سکون سے سو جاتے۔ اکثر یہ دیکھا گیا کہ ڈاکٹر

صاحب رات گئے تک تنظیمی اجلاس میں مصروف رہتے مگر صبح کی نماز ان سے قضا نہ ہو پاتی۔ یہ نوبت بہت کم ہی آئی کہ کسی دوسرے شخص کو کبھی تھکے ہارے ڈاکٹر محمد علی نقویؒ کو نماز کے لئے جگانا پڑا ہو۔

انسانی فطرت کے باعث آپؒ رات کو نیند کی آغوش میں سونے کے لئے گھر لوٹتے تو پاکستان بھر سے تنظیمی افراد فون پر آپ سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کر دیتے۔ چونکہ انھیں آپ کے شیڈول کا علم ہوتا تھا کہ آپؒ تقریباً بارہ بجے گھر لوٹتے ہیں اس لئے وہ اہم امور کے بارے میں آپ سے بارہ بجے کے بعد رابطہ کرتے اور آپؒ کو بسا اوقات بار بار نیند سے بیدار ہونا پڑتا۔ احباب کے بقول بعض اوقات آپ کی یہ حال تبھی ہوتی تھی کہ آپ گفتگو تو کر رہے ہوتے مگر تازہ دم انسان کو پتہ چل جاتا تھا کہ آپ بے آرامی کے آخری مراحل میں ہیں۔ یہ آپ کی عظمت تھی کہ ان لمحات میں بھی آپ فون بند کرتے نہ گفتگو کرنے والے سے خلل کا شکوہ لب پر لاتے۔

آپؒ کے تحرک کو دیکھ کر اکثر احباب آرام کرنے کی گزارش کرتے تو آپ فرماتے کہ ''آرام صرف ایک دن کے لئے موت کے روز ملے گا مگر دوسرے روز دفن کے بعد پھر سوال وجواب اور دیگر مرحلے شروع ہو جائیں گے'' شاید آپ کا خیال تھا کہ اگر آپ سو گئے تو پھر جاگے گا کون۔۔۔؟

ممکن ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ سوال انگڑائی لے کہ سفیرانقلاب اپنی مصروفیات کے ہوتے ہوئے اپنی گھریلو ذمہ داریاں کہاں تک پوری کرتے تھے۔۔۔ اہل وعیال کو کتنا وقت دیتے تھے۔۔۔؟ بچوں کی پرورش اور تربیت کے لئے کیا کرتے تھے۔۔۔۔؟ تو جواب بڑا سادہ سا ہے کہ آپ نے اپنی اہلیہ سے اس طرح فکری ہم آہنگی پیدا کر لی تھی کہ جو تربیت سفیرانقلاب ملک بھر میں اپنے روحانی بھائیوں اور بچوں کی کر رہے تھے وہی ذمہ داری آپ کی زوجہ محترمہ گھر کی چار دیواری کے اندر اپنے بچوں کی سرانجام دے رہی تھیں۔ اگرچہ آپ کے اہل وعیال کو ذاتی سطح پر آپ سے زیادہ وقت نہ دینے کا شکوہ بدستور قائم تھا مگر اجتماعی وقومی مفادات کے لئے وہ آپ کی مصروفیات میں قطعاً حائل نہ تھے۔

ایک مرتبہ آپ کی والدہ ماجدہ کی طبیعت خاصی ناساز تھی اور اسی روز فیصل آباد میں ایک

اہم قومی معاملہ پر اجلاس منعقد ہو رہا تھا جس میں آپ کی شرکت انتہائی اہمیت کی حامل تھی۔ چنانچہ آپؒ نے اپنی والدہ سے اجازت طلب کی اور اجلاس کے لئے چلے گئے۔ آپ کے اس فیصلہ کی قریبی رشتہ داروں نے نفی کی مگر آپ نے فرمایا کہ میری والدہ کی حیات خداوند کریم کی رضا پر ہے میرا یہاں ہونا زندگی دلوا سکتا ہے اور نہ کسی حادثہ سے بچا سکتا ہے۔ جب کہ قومی حساس معاملہ میں میری شرکت سے اگر کوئی مثبت لائحہ عمل سامنے آ گیا تو وہ قوم کی حیات میں اضافہ کا باعث بن سکتا ہے۔''

بعض اوقات آپؒ ہفتہ وار تعطیل اپنے گھر گزارتے بچوں اور قرابت داروں کو وقت دیتے مگر اس روز بھی تحریک جعفریہ یا آئی۔ ایس۔ او کے دفتر کا چکر لگاتے اور دفتر وغیرہ کی صفائی اور اس کی ترتیب وآرائش کے لئے خود مصروف ہو جاتے اور وہاں پر موجود تمام نوجوانوں سے بھی کام کرواتے۔

آپؒ کے بچوں اور رشتہ داروں کی خواہش ہوا کرتی تھی کہ آپؒ ان کے درمیان بیٹھیں اور وہ آپ سے مستفید ہوں۔ لہٰذا آپؒ دو ماہ میں عموماً اور مخصوص مذہبی ایام میں خصوصاً اپنے گھر کھانے کا انتظام کرتے جہاں کئی کئی گھنٹوں تک حالات حاضرہ سے انھیں آگاہ کرتے۔ اگر آپ کسی خصوصی پروگرام میں رشتہ داروں کے گھر تشریف لے جاتے تو وہاں وہ آپ کی تصاویر، آڈیو، ویڈیو فلمیں تک بناتے جو آج بھی ریکارڈ میں موجود ہیں۔

جب مجھے اہل خانہ سے آپ کی زندگی کے بارے میں تاثرات نوٹ کرنا پڑے تو آپؒ کے بڑے فرزند سید محمد سلیمان نقوی نے کہا ''ڈیڈی تو آپ لوگوں کے ساتھ زیادہ وقت گزارتے تھے ہم تو بعض اوقات ان کی زیارت بھی نہ کر سکتے تھے۔ وہ جب رات کو لوٹتے تو ہم سوئے ہوئے ہوتے تھے اور جب صبح سویرے گھر سے نکلتے تو تب ہم اسکول کی تیاری وغیرہ میں مصروف ہوتے تھے یا کبھی کبھار ہمارے بیدار ہونے سے پہلے ہی آپ گھر سے روانہ ہو جاتے تھے۔

آپؒ کی اہلیہ نے خواتین کے مختلف تعزیتی وفود کے سامنے دکھ کا اظہار فرمایا کہ ''وہ اس لئے نہیں روتیں کہ ان کے گھر کا سربراہ انتقال کر گیا ہے بلکہ وہ اس لئے روتی ہیں کہ قوم ایک عظیم مجاہد سے محروم ہو گئی ہے اور ہزاروں تنظیمی نوجوان یتیم ہو گئے ہیں۔

آپؒ کی صاحبزادی سیدہ زہراؑ جو اس وقت جامعۃ الزہرا قم میں زیر تعلیم ہیں نے آئی۔ایس۔او شعبہ طالبات کے تعزیتی وفود اور تعزیتی اجلاس میں بار بار یہ جملے دہرائے کہ ''میں تمام دختران اسلام کو ایک عظیم مجاہد کا پرسا پیش کرتی ہوں، شہید نہ صرف میرے والد تھے بلکہ ایک دختر قوم کے حوالے سے وہ میرے عظیم رہنما بھی تھے اس لئے مجھے قوم کا سرمایہ لٹ جانے کا شدید دکھ ہے۔

سفیرانقلاب نے گھر کا ماحول اس قدر مذہبی بنایا کہ آپؒ کے گھر سے چھ سال کی بچی بھی ننگے سر نہیں نکلتی۔ نابالغ بچے باقاعدگی سے نمازیں ادا کرتے ہیں۔۔۔ انھیں قرآن مجید کی تعلیم گھر پر دی جاتی ہے اور چھوٹے چھوٹے بچوں کو فروع دین سے روشناس کرایا جاتا تھا۔

ایک مرتبہ آپؒ کے منجھلے صاحبزادے سید محمد دانش جن کی عمر اس وقت نو سال تھی نے ایک تنظیمی نوجوان سے نماز دیر سے پڑھنے کا شکوہ کیا تو اس نے کہا کہ مصروفیات کی وجہ سے بھول گیا تھا۔ جواب سنتے ہی دانش نقوی نے برجستہ کہا ''انکل آپ کھانا کھانا تو کبھی نہیں بھولتے''

ایک دفعہ آپؒ کے بڑے صاحبزادے سید محمد سلیمان نقوی جو اس وقت آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے ہمارے گھر میں پڑھنے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ گھر میں کوئی معاملہ زیر بحث آیا تو انھوں نے مجھ سے پوچھا'' یہ جو مسئلہ آپ کو درپیش ہے اسلام اس کے بارے میں کیا کہتا ہے۔۔۔؟ میں یہ سن کر حیران رہ گیا کہ ایک کم سن بچہ کو گھریلو معاملات میں اسلام کا کس قدر خیال ہے۔

یہ آپ کی گھریلو تربیت کا اثر تھا کہ آپؒ کی بڑی صاحبزادی اس وقت علوم دین کے حصول کی خاطر قم المقدسہ ایران میں زیر تعلیم ہیں اور وہ جب بھی پاکستان تشریف لاتی ہیں یہاں کی خواہران کو علوم دین سے مستفید کرتی ہیں۔

یہ آپؒ کی تربیت اور خون کی تاثیر ہے آپ کی شہادت پر آپ کے عزیز و اقارب کے چھوٹے چھوٹے بچوں نے مردہ باد امریکہ کے نعرے بلند کیے۔ آپؒ کے مدفن کے تیسرے روز جب چند احباب آپ کے اہل خانہ سے ملنے گئے تو اس وقت یہ معصوم بچے بدستور امریکہ کے

خلاف نعرہ بازی کر رہے تھے۔ جنھیں دیکھ کر احساس ہوا کہ واقعاً ان کو ڈاکٹر کا نعرہ یاد ہے۔ امریکہ مردہ باد ہے۔

یہ منظر دیکھ کر اقرار کرنا پڑا ہے۔

چھری کی دھار سے کٹتی نہیں چراغ کی لو
بدن کی موت سے کردار مر نہیں سکتا

☆☆☆☆

سفیرانقلاب کے آخری ایام زندگی

بزرگ کہتے ہیں کہ بچے کی پنگھوڑے میں حرکات وسکنات سے اس کے جوبن اور بڑی منفرد عادات اور تاثرات دیکھ کر اس کی زندگی کے اختتام کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ اسی کہاوت کا احساس ہمارے بہت سے احباب کو سفیرانقلاب کی شہادت سے ڈیڑھ دو سال قبل ہوگیا تھا اور وہ

اکثر اپنی محافل میں اس خدشہ کا اظہار بھی کرتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب جو ایران کے محاذوں پر رہے، سعودی عرب کے عقوبت خانوں میں ٹھہرے، پاکستان کی آمریت سے زوردار ٹکر لی اور امریکہ کے لئے دردسر بنے۔ انھوں نے مشکل سے مشکل حالات میں بھی کبھی اپنی زندگی کی تارکٹ جانے کا عندیہ نہ دیا مگر ملک میں پھیلی ہوئی فرقہ واریت منظم دہشت گردی اور قتل وغارت کی فضا کے تیور دیکھ کر انھیں کئی معتمد ساتھیوں کے سامنے خطرات کا اظہار کرنا پڑا اور ان حالات میں آپؒ وصیت تحریر کرنے پر مجبور ہو گئے۔

دور آمریت میں آپؒ کے پیچھے خفیہ ایجنسیاں سائے کی طرح چلتی تھیں بعید نہیں تھا کہ آپؒ اس دور میں شہید کر دیے جاتے، حکومتوں کے تغیر وتر جیحات کے تنزل نے حالات کی کروٹیں بدلیں تو آپؒ کو اپنے ملک کی آزاد فضاؤں میں سانس لینے کا مزید موقع میسر آیا۔ سننے میں آیا کہ آپؒ کا نام کئی اداروں کی ہٹ لسٹ ''HIT LIST'' میں آیا یہاں تک کہ بھارت نے جب کشمیر کے مسئلہ کو سبوتاژ کرنے اور پاکستانیوں کی توجہ ہٹانے کا سوچا تو پاکستان کے صوبہ پنجاب میں چند مذہبی رہنماؤں کے قتل کا منصوبہ تیار کیا جن میں ڈاکٹر محمد علی نقویؒ کا نام ہمیشہ سرفہرست رہا۔ اس سازش کا انکشاف فوج کے ہتھے چڑھنے والے ایک بھارتی ایجنٹ نے کیا تھا جس کے بعد اہم فوجی افسران نے اپنے ذرائع سے ان شخصیات کو خطرات سے آگاہ کر دیا تھا۔

جب بھی آپ کو ایسے خدشات سے آگاہ کیا جاتا تو آپ یہ کہہ کر ٹال دیا کرتے تھے کہ ''ہماری ابھی اتنی اہمیت نہیں ہے۔'' آپ پہلی بار ۱۲ فروری ۱۹۹۴ کو دشمن کے ارادوں کی طرف اس وقت متوجہ ہوئے جب ایک رجعت پسند مذہبی تنظیم نے آپ اور ایرانی قونصلیٹ جنرل کے خلاف اپنے دو کارکنان مولوی سمیع اللہ جھنگوی اور شاہین بٹ کے قتل کی ایف آئی آر تھانہ علامہ اقبال ٹاؤن لاہور میں درج کرائی۔ اگرچہ اس مقدمہ کے اندراج پر آپ سمیت آپ کے کئی اہم ساتھیوں کو تشویش لاحق ہوئی کہ آپ تو مسلمانوں کے درمیان نفاق کو بدقسمتی تصور کرتے ہیں۔ بھلا فرقہ پرست تنظیم کے کارکنان کے قتل میں آپ کس طرح ملوث ہو سکتے ہیں۔۔۔؟ مگر ملت کے زیرک اور دوراندیش افراد اس روز سے جان گئے کہ نظریہ اور دلائل سے خالی دشمن جو مذہب حقہ

کے پیروکاروں کو منصوبہ بندی کے ساتھ قتل کر رہا ہے وہ آپ کی زندگی کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ اس لئے وہ آپ کو بھی راستہ سے ہٹانا چاہتا ہے۔

مؤقر ذرائع کا کہنا ہے کہ آپ کو قتل کے مقدمہ میں ملوث کرنے اور دشمن کو آپ کی ذات کی طرف متوجہ کرنے میں ملک کی خفیہ ایجنسیوں کا ہاتھ تھا جو ایک عرصہ سے یہ سمجھتی تھیں کہ تحریک جعفریہ اور آئی۔ایس۔او کی فعالیت کے پیچھے ڈاکٹر محمد علی نقوی کا ذہن کارفرما ہے۔

اگر غور کیا جائے تو حقیقت بھی یہی تھی کہ ڈاکٹر صاحب ملت جعفریہ کا ذہن تصور کیے جاتے تھے اور آپ سے ملکی وغیر ملکی ایجنسیاں خائف رہتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے گھر اور کلینک کے فون نمبر پر عموماً OBSERVATION لگی ہوتی تھی جس سے سرکاری خفیہ ادارے آپ کی نقل وحرکت اور گفتگو سے آگاہی رکھتے تھے۔ یہ معمہ اس وقت کھلا جب آئی۔ایس۔او کے سابق مرکزی صدر برادر سید تصور نقوی کے مقدمہ کے سلسلہ میں آپ سی۔آئی۔اے کے ہیڈ کوارٹر گئے جہاں ایک سینئر پولیس افسر نے آپ کو اشارتاً کہا ''ڈاکٹر صاحب آپ نے گذشتہ رات سرگودھا میں جس شخص کو فون پر ہدایات دی تھیں وہ ہمارے ریکارڈ میں ہیں۔

خفیہ اداروں یا ایجنسیوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ معاشرہ کے افراد کو استعمال کر کے اپنے مقاصد حاصل کرتی ہیں۔ ان کے مقاصد کسی فرد واحد سے بھی حاصل ہو سکتے ہیں اور کسی گروہ یا تنظیم سے بھی۔ البتہ ایک عام شہری ان ہتھکنڈوں سے بے خبر رہتا ہے۔ ہمارے ملک کا المیہ رہا ہے کہ یہاں ۱۹۷۵ سے ایجنسیوں نے مداخلت شروع کی جس کے نتیجہ میں کئی رہنما قتل اور کئی حکومتیں معزول ہوئیں۔

ہمیں تو یہ جان کر بے حد حیرت ہوئی کہ پاکستان کی ایک کٹر مذہبی تنظیم کے ایک مرکزی رہنما کو ایجنسیوں نے یہ ہدایت دی کہ وہ پاکستان میں ''حضرت امام مہدی علیہ السلام'' کے خلاف گستاخانہ زبان دراز کرے۔ سازش یہ تھی کہ ان کے اس گستاخانہ فعل سے ملک بھر میں اشتعال پھیلے گا اور ایران مذہبی بنیادوں پر اسے فرط جذبات میں واجب القتل قرار دے گا۔ جس کے بعد پاکستان کے مسلمان ایران کے خلاف سیخ پا ہو جائیں گے۔ اس سے ایک طرف رشدی

کے خلاف دیئے گئے فتویٰ کی اہمیت ختم ہوجائے گی اور دوم ایران ایک فرقہ وارانہ ملک کی حیثیت سے منظرعام پر آئے گا۔ (یادرہے کہ اس سازش کا انکشاف اس تنظیم سے منحرف ہونے والے ایک صوبائی صدر نے ملکی اخبارات میں برملا کیا تھا)۔

ڈاکٹر صاحب کی زندگی کا یہ پہلا موقع تھا کہ انھیں ایک سنگین مقدمہ میں ملوث کیا گیا اور پولیس کی بھاری نفری انھیں کلینک سے تھانہ علامہ اقبال ٹاؤن میں لے آئی جہاں چند گھنٹوں کے لئے آپ کو یہاں ٹھہرایا گیا۔

چند گھنٹوں کے بعد آپ تھانہ سے تو اٹھ آئے مگر اس کے بعد آپ کو اس بات کا احساس ہوگیا کہ آپ کا دشمن آپ کے تعاقب میں ہے۔ اس سانحہ کے بعد آپ کے قریبی رفقاء نے آپ کو تنہا گھومنے پھرنے سے منع کیا اور ساتھ ہی چند معتمد رفقاء نے خود کو آپ کی حفاظت کے لئے وقف کردیا۔

ڈاکٹر صاحب انتہائی مضبوط اعصاب کے مالک تھے۔ انھوں نے اپنے تاثرات یا گفتار سے کبھی یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ ان کی زندگی کو لاحق خطرات نے سر اٹھا لئے ہیں مگر آپ کی رفاقت میں کام کرنے والوں نے محسوس کیا کہ آپ نے قومی کاموں کو بہت جلد انجام تک پہنچانے اور کچھ مزید کر گزرنے کے لئے بھرپور دوڑ دھوپ شروع کردی۔ بکھرے ہوئے امور سمیٹنے اور رواں معاملات کو احسن طریقہ سے چلانے کے لئے آپ نے افراد سازی کو آخری شکل دی۔ اس دوران میں آپ نے اپنے تربیت یافتہ نوجوان کو کئی ملی امور کی مسئولیت سونپی یہاں تک کہ اپنے کلینک کے لئے تنظیمی ڈاکٹروں کی خدمات حاصل کیں۔

آپ قومی فلاح کے لئے پھیلائے گئے منصوبوں کے بارے میں اظہار فرماتے ہوئے بعض شعبہ جات پر اطمینان ظاہر کرتے کہ وہ باحسن طریقہ سے جاری رہیں گے اور بعض پر مکمل اطمینان نہ فرماتے اور ان کے بارمیں فکرمند بھی رہتے کہ فی الحال انھیں چلانے کے لئے مناسب افراد میسر نہیں آرہے۔

ڈاکٹر صاحب سب سے زیادہ پریشان اپنے بچوں کی تعلیم کے بارے میں تھے اور اکثر

فرمایا کرتے تھے کہ میں اپنے بچوں کی تعلیم میں انصاف نہیں کرسکا۔ آپ کے دونوں بیٹے سید سلمان نقوی اور سید دانش نقوی پہلے لاہور کے معروف ''انگلش میڈیم اسکول'' میں زیرتعلیم تھے مگر قومی فلاح کے لئے قائم ہونے والے ادارہ ''المصطفیٰ ماڈل ہائی سکول'' کے اجرا کے بعد آپ نے اپنے دونوں بچے اس سکول میں داخل کرادیے۔ چونکہ یہ اسکول بہت زیادہ معیاری نہ تھا۔ اس لئے اس سکول کے ٹرسٹی حضرات اپنے بچوں کو یہاں داخل کرنے سے گریز کرتے تھے مگر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ''اگر یہ اسکول ہمارے بچوں کی تعلیم کے لئے مناسب نہیں تو پھر قوم کے بچوں کے لئے کس قدر مناسب ہے جب ہمارے بچے یہاں داخل ہوں گے تو ہم خود اس کے معیار کی بلندی کا درد محسوس کریں گے اور قوم کو دعوت دیتے وقت اپنے پیغام میں سچائی کا ثبوت دے سکیں گے۔''

یہ امر ڈاکٹر صاحب کی نظریہ سے وابستگی اور قول وفعل کی ہم آہنگی کا ثبوت تھا کہ آپ نے اپنے بچوں کو یہاں سے ایک لمحہ نکالنے کی کوشش تک نہ کی۔

آپ کے خاندان میں اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد موجود ہیں۔ یہاں تک کہ ملک کی کلیدی آسامیوں پر کام کرنے والے چنداں افراد کا تعلق آپ کے خاندان یا آپ کے مکتب سے ہے۔ مگر آپ نے کبھی بھی اپنے بچوں کے لئے سفارش نہ کرائی۔ ایک مرتبہ کیڈٹ اسکولز کے داخلے ہونے لگے تو آپ نے اپنے بڑے بیٹے کو مقابلہ کے امتحان میں شریک کیا۔ بعض افراد نے یہ مشورہ دیا کہ آپ فوجی افسروں سے سفارش کرالیں (جو کہ آپ کے لئے کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا) مگر آپ نے فرمایا ''یہ ناانصافی ممکن نہیں ہے۔'' آپ سمجھتے تھے کہ اگر آپ کا بچہ معیار پر پورا نہ اترا اور اسے داخلہ دلوا دیا گیا تو یہ اس کے ساتھ بھی ناانصافی ہے اور دوسرا اس لائق اور مستحق بچے کے ساتھ بھی جسے معیار سے گرا کر اس کی جگہ آپ کے بچے کو رکھا جائے گا۔

آپ ذہن کی لوح پر حضرت علی علیہ السلام کا یہ فرمان ''جس معاشرہ میں عدل طاقتور کا سہارا بن جائے وہ تباہ ہوجاتا ہے'' نقش تھا۔ آپ فرماتے تھے کہ بے انصافیاں ظلم کو جنم دیتی ہیں۔ تاریخ اسلام میں جتنے بھی ظلم ہوئے ہیں ان کی اساس ناانصافی ہی تھی۔''

آپ اپنے تنظیمی عزیزان سے بھی ایک شفیق بزرگ کی طرح سلوک کرتے۔ستمبر ۱۹۹۴ میں جب میں نے شیخ زید اسپتال کی نوکری سے استعفٰی دیا اور مزید تعلیم کے حصول کے لئے لاہور کے ایک پرائیویٹ ادارہ میں داخلہ لینے کے لئے مقابلہ کے امتحان کی تیاری میں مصروف ہوا تو آپ نے جمعہ کے روز مجھے اپنے گھر یاد فرمایا۔ میں عین وقت پر پہنچا تو آپ کہیں جارہے تھے۔ مجھے گاڑی میں بٹھایا اور دو تین گھنٹوں کے سفر میں مسلسل دو اہم تنظیمی برادران اور میرے مستقبل پر گفتگو فرمائی۔آپ نے پر درد پند و نصاح کیں۔کبھی آپ مجھ سے ایک بڑے بھائی کے لہجے میں بولے اور کبھی والد کے درد میں گویا ہوئے۔ میں نے اس روز محسوس کیا کہ یہ عظیم انسان ہمارے لئے کس قدر جذبات رکھتا ہے اور اس کی نظر اپنے کن کن عزیزوں پر ہے۔ پھر جب میری ملازمت ہوئی تو آپ نے پہلے روز ہی مجھے فون کیا۔کلینک پر یاد فرمایا۔ مجھے دیکھتے ہی کرسی سے اٹھے بہت پیار بھرے جذبات میں سینے سے لگایا اور کہنے لگے۔آپ نے میری ایک بڑی مایوسی کو ختم کر دیا ہے۔اس روز کی ملاقات اور گفتگو میں مجھے یہ بات کھٹکنے لگی کہ ڈاکٹر صاحب تو ہمارے بارے میں اس قدر مایوس ہیں جیسے بستر مرگ پر پڑا ہوا ایک گھر کا سربراہ اپنی نظروں کے سامنے گھر کے ہر فرد کو آسودگی بخشنے کا خواہشمند ہوتا ہے۔ یہ آپ کے خلوص کا نتیجہ تھا کہ آپ کی شہادت پر بہت سے احباب نے اس مفہوم کا تاثراتی جملہ رجسٹر میں درج کیا کہ ''اگر یتیمی صرف والد کے انتقال پر موقوف نہیں تو پھر ہم یتیم ہو گئے۔''

زندگی کے آخری سال میں آپ کا معمول بن گیا تھا کہ آپ تنظیمی محافل میں درس نہ دیتے تھے بلکہ درس سننے پر اکتفا کرتے۔اگر کوئی سینئر ساتھی جامع درس دیتا تو آپ اس کی حوصلہ افزائی فرماتے اور انھیں دوسرے حلقوں میں درس دینے کے لئے بھیجتے۔اس طرح سے آپ خود وہ خلا پورے کرنے کی کوشش کرتے رہے جو آپ کی زندگی کے بعد متوقع تھے۔

آخری ایام میں واضح طور پر محسوس کیا گیا کہ آپ اپنے عقائد کے پرچار میں مضطرب اور انتہائی کوشاں تھے۔ ۱۶ فروری ۱۹۹۵ (۱۵ رمضان المبارک) کی ایک افطار پارٹی پر آپ سے ملاقات ہوئی تو میں نے ملت جعفریہ کی تاریخ پر مبنی ایک کتاب لکھنے کا عندیہ دیا۔ مجھے یقین تھا

کہ آپ نہ صرف اس سے اتفاق کریں گے بلکہ حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔مگر آپ نے میرے خیال کو یکسر مسترد کر دیا۔فرمانے لگے'' کیا مذہب حقہ کے عقائد اور حقیقت پر کتاب نہیں لکھی جاسکتی۔۔۔؟ میں نے عرض کی یہ بڑا نزاعی مسئلہ ہے۔اس پر علماء کرام کی خدمات حاصل کی جائیں۔۔۔؟ فرمایا بات تو درست ہے مگر اس سے پہلے عقائد پر جتنی کتب مارکیٹ میں دستیاب ہیں یا تو ان پر مناظرانہ رنگ کا خلبہ ہے یا پھر وہ اس قدر جانبدارانہ لگتی ہیں کہ عام مسلم قاری متاثر نہیں ہوتا۔

آپ نے فرمایا کہ اس وقت جتنی ضرورت اپنے عقائد اور مسلک کی حقیقت کے آشکار کرنے کی ہے۔شاید کبھی ہوا کرتی تھی۔ہمیں اس بات کا دکھ نہیں کہ دشمن ہمارے افراد قتل کر رہا ہے۔ہمیں اس امر کی شدید تکلیف ہے کہ وہ عام مسلمان اور بالخصوص آنے والی نسلوں کو ہمارے مسلک کا نہایت غلیظ اور غلط تعارف کرا رہا ہے۔ ہمارے مذہبی مخالف گروہ اپنے لٹریچر میں ہمارے خلاف ایسا زہر اگل رہے ہیں جو غیر محسوس انداز میں اپنے تاثرات مرتب کر رہا ہے۔اس مہم میں ''اہل حدیث گروہ'' بہت آگے جارہا ہے۔

لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اتحاد بین المسلمین کی جدوجہد اور اپنی دفاعی کوششوں کے ساتھ ساتھ اپنے عقائد کے پرچار پر زور دیا جائے۔اگر ہم صحیح معنوں میں یعنی دیانتداری سے مذہب محمدؐ و آل محمدؐ کا تعارف کرانے میں کامیاب ہو گئے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ محمدؐ کا پیروکار آل محمدؐ کا راستہ اختیار نہ کرے اور اس کے مقابل لائے جانے والے نظریات کو مسترد نہ کرے۔

آپ کی زندگی خطرات میں تو گھری ہوئی ہی تھی مگر ۱۹۹۳ سے ان خطرات میں شدت آتی گئی۔ یہاں تک کہ مخالف مذہبی تنظیم کی مساجد اور رسائل میں آپ پر منافرانہ تنقید شروع ہوگئی۔مؤقر ذرائع کا کہنا ہے کہ لاہور کے چند مراکز نے اپنے مرکز جھنگ کو جن شیعہ رہنماؤں کی زندگی کا مقابلہ نہ کر سکنے کی رپورٹ دی ان میں آپ کا نام سرفہرست تھا۔ جھنگ کی رپورٹ کے مطابق وارڈ نمبر ۵ کی ایک مسجد میں آپ کا نام لے کر للکارا گیا۔دشمن کا خیال تھا کہ ملت جعفریہ کے جسم میں جس شخص کو ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے وہ ڈاکٹر محمد علی نقوی ہے۔

ایک مرتبہ آپ کے کلینک پر ایک شخص بخار کی حالت میں آیا یہ شخص ایک سرکاری ادارے

کا ڈرائیور تھا۔ ڈاکٹر صاحب اس وقت کلینک پر موجود نہ تھے۔ وہ شخص جانے لگا تو آپ کے محافظ رفقاء کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہا ''تمھیں نجف کے والی کا واسطہ ہے ڈاکٹر صاحب کو کسی محفوظ جگہ پہنچادیں ورنہ یہ سرمایہ بھی گنوا بیٹھو گے۔''

دشمن نے جب اپنی چشم بدفر زندا اسلام پر مرکوز کی تو آل رسول کے پروانے آپ کے گرد طواف کرنے لگے۔ آپ کو تنہا سفر کرنے، بے دھڑک گھومنے پھرنے سے روک دیا گیا۔ مگر آپ تھے کہ ہر بار کہتے ''زندگی میں موت جیسی پابندیاں میرے گرد جمع نہ کریں۔ موت کا ایک روز مقرر ہے۔ جب وہ وقت آپہنچے گا۔ تدبیریں دھری کی دھری رہ جائیں گی۔''

آپ کو تحریک جعفریہ کی جانب سے محافظ فراہم کیے گئے مگر آپ نے بصد شکریہ واپس لوٹا دیے۔ کلاشنکوف بردار یا مسلح نوجوانوں کا آپ کے اردگرد چلنا آپ کو بے حد ناگوار تھا۔ آپ کا نظریہ تھا کہ موت جس نے ہر حالت میں آنا ہے سے بچنے کے لئے اگر کوئی شخص ایسے اقدامات کرتا ہے جو اس کے نفس کو تکبر کی وادی میں دھکیل دیتے ہیں تو یہ اس کے لئے جیتے جی موت ہے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کے گرد ایک لمحہ کے لئے بھی کوئی نوجوان اسلحہ لے کر نہ گھوما بلکہ آپ نے یہاں تک بھی گریز کیا کہ آپ کو گاڑی چلانے یا اگلی نشست پر بیٹھنے سے روکا گیا مگر آپ نے فرمایا کہ ''عام طور پر پچھلی نشست پر بیٹھنا بڑے بڑے لوگوں کا شیوہ ہے جو مجھ سے ممکن نہیں میں عام سا کارکن ہوں مجھے کارکن ہی رہنے دیا جائے۔

آخری ایام میں آپ کی گاڑی کا کئی بار تعاقب کیا گیا مگر کبھی حملہ کی نوبت نہ آئی۔ شیخ زید اسپتال میں اکثر پولیس کا ایک سپاہی آپ کو بلانے آیا کرتا تھا اور آپ خاموشی سے اس کے ساتھ چلے جاتے۔ ایک روز میں نے ماجرا پوچھا تو آپ نے فرمایا'' کچھ پولیس افسران ممکنہ خطرات سے آگاہ کرتے ہیں۔'' ایک موقعہ ایسا بھی آیا جب ایک مریض کے ساتھ کچھ مشکوک لوگ اسپتال آئے اور وہ آپ کی گاڑی کا تعاقب کرنے لگے۔ ان حالات میں اسپتال کے چیئرمین نے آپ کو ایک ماہ کی چھٹی لینے کا مشورہ دیا۔ آپ کی چھٹی منظور بھی ہوئی مگر نامعلوم وجوہات کی بنا پر آپ نے پھر سے حاضر ہونا شروع کر دیا۔

قریبی رفقاء نے آپ کو ملازمت چھوڑ دینے اور کچھ عرصہ کے لئے لاہور ترک کرنے کا مشورہ بھی دیا۔ بعض روایات میں ملتا ہے کہ تحریک جعفریہ کے مرکز کو آپ کی خدمات حاصل کرنے کے لئے کہا گیا تا کہ آپ نسبتاً محفوظ رہیں مگر تا حال علم نہیں ہوسکا کہ آخر ایسا کیوں نہ ہوا۔۔۔؟

کراچی سے آپ کے ایک معتمد ساتھی لاہور آئے تو انھوں نے یہاں سے تنظیمی حلقوں کو متنبہ کیا ''لاہور والو!۔۔۔ اس عظیم شخص کے قدر شناس بنو۔ انھیں چھ سات ہزار روپے کی نوکری کے لئے سڑکوں پر آزاد نہ چھوڑو۔۔۔ انھیں زیر زمین لے جاؤ اور ان کے ذہن سے دیر تک ملت کو فائدے پہنچاؤ۔۔۔ اگر خدانخواستہ یہ عظیم انسان مارا گیا تو پھر نسلوں تک کف افسوس ملتے پھرو گے۔۔۔''

بعض افراد نے ڈاکٹر صاحب کو ملک چھوڑ دینے کا مشورہ بھی دیا جسے آپ سن کر مسکرا دیئے اور فرمایا کہ کتنی باعث شرم بات ہے کہ میں عارضی زندگی کے تحفظ کے لئے راہ فرار اختیار کروں۔ خدا کے عظیم انعام ''شہادت'' کا منکر بنوں اور دشمن کو ہنسنے کا موقع دوں کہ میں اس کے خوف سے ملک چھوڑ گیا ہوں۔''

آپ شہادت کے حصول کے لئے ماہی بے آب کی طرح تڑپتے تھے۔ زندگی کے آخری ایام میں اپنے چند معتمد رفقاء کی محفل میں فرمایا ۴۳ برس بیت گئے مگر ابھی تک شہادت نصیب نہیں ہوئی لگتا ہے کہ میرا کوئی عمل خدا کو پسند نہیں آیا۔'' اسی طرح آپ شہادت سے پندرہ روز قبل ایک رفیق کے سوال کے جواب میں کہتے ہیں کہ ''میں نہیں چاہتا کہ ضعیفی میں کھانس کھانس کر مروں خدا میری موت کو میری متحرک زندگی سے متصل کر دے۔''

ایک رات ڈاکٹر صاحب لاہور میں قومی امور پر مبنی ایک اجلاس میں بیٹھے تھے کہ اچانک دو مسلح نوجوان کمرے کے اندر داخل ہوئے اور انھوں نے ایک تنظیم کے دفتر کے بارے میں استفسار کیا۔ بعض لوگوں نے انھیں پکڑنا چاہا مگر ڈاکٹر صاحب نے ایسا کرنے سے انھیں روک دیا۔ اجلاس کے اختتام پر آپ حسب معمول اپنے ایک دو ساتھیوں کے ساتھ پرسکون روانہ ہوئے جبکہ

دفتر میں موجود لوگ آپ کے گھر پہنچنے تک پریشان رہے۔

آپ کی شہادت سے چھ ماہ قبل تحریک جعفریہ کے ذرائع کو یہ رپورٹ مل گئی تھی کہ ڈاکٹر صاحب کے قتل کی سازش کو حتمی شکل دی جا چکی ہے اور ان پر یہ قاتلانہ حملہ ''یتیم خانہ یا سکیم موڑ'' پر کیا جائے گا۔ یہ مفصل رپورٹ تحریک جعفریہ کے مرکز تک بھی پہنچا دی گئی اور ڈاکٹر صاحب کو بھی ممکنہ خدشہ سے آگاہ کر دیا گیا۔

سفیر انقلاب یہ سب کچھ جاننے کے باوجود نہایت مطمئن رہتے تھے ان کے چہرے کی تازگی پر ایک پل مرجھاہٹ کا احساس ہوا نہ ان کے لبوں کے فاتحانہ تبسم میں کبھی کمی آئی۔ موت ایک ایسا لفظ ہے جو زندہ شخص کو ایک لمحہ کے لئے اداس کر دیتا ہے۔ مگر جو لوگ شعور کی موت مرتے ہیں انھیں ابدی زندگی کا ادراک ہوتا ہے وہ سنت علی اکبرؑ پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یوم عاشور جب حضرت علی اکبر علیہ السلام نے اپنے والد گرامی حضرت امام حسین علیہ السلام سے پوچھا تھا۔ اے بابا'' کیا ہم حق پر ہیں۔۔۔؟'' لاریب کا جواب ملا تو آپ نے فرمایا'' جب ہم حق پر ہیں تو پھر ہمیں پروا نہیں کہ موت ہم پر آ پڑے یا ہم موت پر جا پڑیں۔''

قرآن مجید میں ارشاد رب العزت ہے کہ ''موت کی تمنا رکھ تا کہ تمھارا شمار صادقین میں سے ہو'' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو لوگ موت سے محبت رکھتے ہیں وہی سچے ہوتے ہیں۔ قرآن مجید کے فرمان کی تفسیر حضرت علی علیہ السلام کا فرمان ہے کہ ''ہم موت سے اس قدر مانوس ہیں جس قدر بچہ اپنے ماں کے پستانوں سے مانوس ہوتا ہے۔''

موت کے چار سو پھیلے ہوئے بادلوں کے نیچے ڈاکٹر صاحب کی مسکراہٹ کا مفہوم بہت کم لوگوں پر واضح تھا۔ ذاتی طور پر مجھے آپ کی شہادت کے بعد ایک انٹرویو پر مبنی ویڈیو کیسٹ دیکھنے اور سننے کا موقع ملا جس میں آپ حضرت امام خمینیؒ اور حضرت سید عارف حسین الحسینی کی ذات مقدسات پر بحث کر رہے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ شہید حسینیؒ جس صف میں کھڑے ہیں ہم اس کو صحیح درک نہیں کر سکے۔ اگر واقعی تھوڑی بہت سمجھ اور ادراک ہو تو امام خمینیؒ ایک محفل کا نام ہے جس میں دس پندرہ ستارے ہیں۔ جن میں شہید راغب لبنانی، مہدی الحکیم جیسے ستاروں کی محفل تھی جس کا

شہید حسینیؒ بھی ایک حصہ تھے وہ ہمارے معاشرے کا حصہ نہیں تھے چونکہ ڈاکٹر صاحب علامہ سید عارف حسین الحسینی کے بے حد محبوب رفیق تھے اس لئے آپ بھی امام زمانہؑ کی محفل میں جانے کے لئے بے قرار تھے۔ یہ روحانی عقیدت کا اعجاز ہے کہ شہید حسینیؒ اور شہید ڈاکٹر نقوی دونوں ہم عمر شہید ہیں۔

سفیر انقلاب لبنان کے شہید عباس موسوی سے بے حد مانوس تھے اور شہید موسوی بھی ڈاکٹر صاحب سے قلبی لگاؤ رکھتے تھے۔ تحریک جعفریہ کی جانب سے اسلام آباد میں منعقد ہونے والی بین الاقوامی کشمیر کانفرنس کے موقعے پر شہید عباس موسوی پاکستان تشریف لائے تو انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو خصوصی وقت دیا اور یہ دونوں عاشقان امام بہت دیر تک بین الاقوامی صورتحال پر بحث کرتے رہے۔ شہید موسوی جب لبنان روانہ ہونے لگے تو انھوں نے فرط جذبات سے ڈاکٹر صاحب کی پیشانی کا دوبارہ بوسہ لیا اور محفل امام زمانہ علیہ السلام میں دوبارہ ملاقات کرنے کا وعدہ فرمایا۔

۱۶ فروری ۱۹۹۲ کو جب سفیر انقلاب کو شہید قدس سید عباس موسوی کی شہادت کی خبر موصول ہوئی تو آپ نے فرمایا ''عبد خدا بازی لے گیا ہے۔'' ایک اور موقعے پر شہید عباس موسوی کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ '' وہ شہادت کے معیار پر اس قدر پورے اترے کہ انھوں نے اپنی فانی زندگی کے ساتھ ''۴'' کا ہندسہ نہیں لگنے دیا جبکہ میری زندگی کے ساتھ ''۴'' کا ہندسہ لگ گیا یعنی ۴۰ برس کا ہو چکا ہوں۔''

ایک دفعہ ایک مخلص رفیق نے ایک عمل بتایا کہ نماز صبح اور نماز عشاء کے بعد اسے پڑھ لینے سے انسان دائرہ تحفظ میں آ جاتا ہے اور تمام حادثات و بلات سے محفوظ رہتا ہے۔ آپ یہ سن کر مسکرائے اور کہنے لگے ''عزیز دوست کوئی ایسا عمل بتاؤ جو دائرہ توحید میں لے جائے'' تو انھوں نے جواباً کہا پھر وہ تو شہادت ہے'' آپ نے برجستہ فرمایا ''خدا آپ کا بھلا کرے۔'' آپ احباب کو اس سلسلہ میں جو کہتے اسے بزرگ شاعر مرحوم رئیس امروہوی نے یوں بیان کیا ہے۔

صبح دم کتنی کلیاں شگفتہ ہوئیں
شام تک پھول سارے بکھر جائیں گے
موت کوئی، نیا حادثہ تو نہیں

تم بھی مرجاؤ گے ہم بھی مرجائیں گے

☆☆☆☆☆

جب دشمن کے مکروہ منصوبہ کا علم ہو چکا تو بہت سے احباب نے مسلح محافظین رکھنے پر اصرار کیا۔ یہاں تک کہ آپ کی نظریاتی فوج کے برسرروزگار نوجوانوں نے محافظین کے اخراجات برداشت کرنے کا وعدہ کیا مگر آپ نے ہر بار اس قسم کی تجویز کو رد کیا۔

آپ کا ذاتی پستول ایک چھوٹے سے تھیلہ میں بند پڑا ہوتا تھا۔ جب بھی کوئی دوست سوال کرتا کہ ڈاکٹر صاحب کیا مشکل وقت میں آپ اپنا پستول نکال کر استعمال کر لیں گے تو آپ فرماتے ''یہ استعمال کرنے کے لئے کہاں پڑا یہ تو احباب کے اصرار پر رکھا ہوا ہے۔'' بہرطور آپ خطرہ سے مکمل آگاہ تھے یہی وجہ تھی کہ گاڑی خود چلاتے تو اگلی سیٹ پر کسی دوست کو نہ بیٹھنے دیتے اگر کوئی اصرار کرتا تو فرماتے ''آپ اپنی ذمہ داری پر بیٹھیں۔''

بڑھتے ہوئے خطرات کے پیش نظر آپ کو گاڑی تبدیل کرنے کا مشورہ دیا گیا۔ آپ کے پاس سوزوکی کار تھی۔ جو حفاظتی حوالہ سے غیر مناسب تھی۔ احباب کا خیال تھا کہ اسے تو ٹکر مار کر بھی اندر والے لوگوں کو کچلا جا سکتا ہے۔ آخر آپ کے ایک نہایت قریبی رفیق نے اپنی پیجارو جیپ آپ کے حوالہ کر دی تا کہ آپ دو تین ساتھیوں سمیت آرام اور ہوشیاری سے بیٹھ سکیں۔ ایک دو ماہ تک آپ یہ گاڑی نہ لینے پر بضد رہے مگر چنداں وجوہات کی بنا پر رضامند ہو گئے۔ آپ نے یہ گاڑی تین چار ماہ استعمال کی اور پھر اس گاڑی میں شہید ہو گئے۔

آپ روزانہ جس روڈ سے گزرتے مجھے بھی ملازمت پر جانے کے لئے یہاں کھڑا ہونا پڑتا تھا۔ تقریباً روزانہ آپ سے ملاقات ہوتی آپ جونہی آگے بڑھتے میرے منہ سے بے اختیار ''فی امان اللہ اور سپرد خدا'' کے دعائیہ جملے جھلک جاتے۔ مجھے حالات کی وجہ سے آپ کی منزل مقصود پہنچنے کا یقین نہ ہوتا تھا۔ مگر ان حالات میں بھی آپ ہمارے لئے پریشان رہتے تھے۔ اگر میں متواتر دو دن تک آپ کو روڈ پر نظر نہ آتا تو آپ اپنے ساتھیوں کو تاکید کرتے کہ وہ میرا پتہ کریں۔ کبھی کبھار آپ گھر بیٹھے ہوتے اور آپ کی شفقت انگڑائی لیتی تو گاڑی نہ ہونے کے باعث بھی

آپ موٹر سائیکل پر سوار ہو کر ہمارے پاس تشریف لاتے اور گھر کی خیریت دریافت فرماتے ہم نے کئی بار اصرار کیا کہ آپ اس قدر آزاد بے خطر نہ چلا کریں مگر آپ اس سلسلہ میں ماننے والے کہاں تھے۔۔۔؟

☆☆☆☆☆

زندگی کا آخری سفر

۳ مارچ ۱۹۹۵ء بروز جمعہ آپ نے عیدالفطر کی نماز چھپڑ سٹاپ ملتان روڈ پر واقع ''جعفریہ

مسجد‘‘ میں ادا کی۔ آپ کو مومنین کے درمیان پا کر وہاں کے خطیب مولانا صادق صاحب نے حاضرین سے کہا’’ آج میں آپ کو دو مبارکبادیں پیش کرتا ہوں ایک عیدالفطر کے چاند کی اور دوسری قوم کے چاند ڈاکٹر محمد علی نقوی کے نظر آنے کی کہ آپ ایک طویل عرصہ بعد ہمارے درمیان نظر آئے ہیں۔‘‘

نماز کی ادائیگی کا وقت آیا تو ڈاکٹر صاحب نے حسب معمول تکبیر بلند کی الصلوٰۃ ۔۔۔۔۔الصلوٰۃ۔۔۔۔الصلوٰۃ۔۔۔۔۔فرزند اسلام کی آخری تکبیر کی بلند صدا مسجد کے در و دیوار سے ٹکرائی اور سکوت طاری ہو گیا۔ نماز ادا ہوئی تو آپ طے شدہ پروگرام کے تحت اپنے چند رفقا کے ساتھ بھوانہ جھنگ کی جانب رواں ہوئے۔۔۔ آپ لاہور چھوڑنے سے پہلے سیدھا کربلا گامے شاہ گئے۔ جہاں تحریک نفاذ فقہ جعفریہ کے بانی اور قائد علامہ مفتی جعفر حسین مرحوم کی مرقد پر فاتحہ خوانی کی اور وہاں پر موجود احباب سے فرمایا’’ یہ بات کس قدر باعث دکھ ہے کہ ہمارے عظیم قائد کی مرقد غربت کے عالم میں ہے کہ یہاں فاتحہ پڑھنے کوئی نہیں آیا‘‘ یہاں آپ نے دیگر قبور پر فاتحہ پڑھی اور لاہور سے باہر کے دوستوں کو عید ملنے روانہ ہو گئے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ پہلا موقع تھا کہ ڈاکٹر شہید خلاف عادت اپنے والدین اور بزرگوں کی قبروں پر فاتحہ پڑھے بغیر ہی چلے گئے تھے۔

آپ ظہرین کے وقت’’ بھوانہ‘‘ پہنچے۔ نماز ظہرین یہاں ادا کی، کھانا کھایا کچھ دیر تک یہاں کے بزرگان اور تنظیمی ساتھیوں سے ملے اور پھر’’ سرگودھا‘‘ چل پڑے رات کا وقت اپنے دیرینہ رفیق سردار سجاد حسین خان میکن کے ہاں کیا۔ صبح سویرے اٹھے۔ احباب کے ساتھ نماز صبح ادا کی اور ناشتہ سے قبل چھ سات ہمسفر رفقاء سے قرآن مجید کی قرآت سننا شروع کر دی۔ بعض احباب کی غلطیاں نوٹ کیں اور انھیں اچھے قاری سے قرآن مجید کی تصحیح کی تاکید فرمائی۔ اس موقع پر آپ نے بھی بلند آواز میں تلاوت فرمائی۔ چند مفاہیم بھی زیر بحث لائے اور تمام رفقاء سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ باقاعدگی سے قرآن کریم کی تلاوت بمعہ ترجمہ کریں اور خدا کی اس عظیم کتاب سے ہدایت حاصل کریں۔‘‘

ناشتہ کے بعد آپ اپنے قافلہ کے ہمراہ’’ جوہر آباد‘‘ کی جانب بڑھے نماز ظہرین تک وہیں پر رہے۔ یہاں بھی تنظیمی برادران سے ملاقاتیں کیں۔ بلکہ’’ خوشاب‘‘ کے چند احباب کو اپنی گاڑی بھیج کر بلوایا اور ان کے حالات سے آگاہی حاصل کی۔ یہاں آپ کے رفقاء نے آپ کی تصاویر لیں اور بعد میں ویڈیو بنانی چاہی تو ڈاکٹر صاحب نے سختی سے منع کر دیا کہ وہ اپنے لیے ایسے کاموں کو پسند نہ کرتے تھے۔

نماز ظہرین کی ادائیگی کے بعد آپ کا یہ کارواں نہایت خوشگوار موڈ میں برادر سید راشد عباس نقوی سے عید ملنے’’ ان کے گاؤں کی جانب چلا۔ سفر میں خوب ہنسی مزاح ہوا۔ تقریباً ۱۰ بجے شب یہ قافلہ ضلع اٹک پہنچا مگر راشد بھائی کو یہاں نہ پا کر انھیں تھکاوٹ کا احساس ہوا۔‘‘

۵ مارچ صبح نماز و ناشتہ سے فارغ ہو کر آپ کا قافلہ’’ اسلام آباد پہنچا‘‘ جہاں برادر ثاقب نقوی و برادر سید امتیاز رضوی سے ملاقات کی۔ آپ جب ان برادران سے ملنے’’ اخوت اکیڈمی‘‘ کے دفتر پہنچے تو انھیں دفتر کی صفائی میں مصروف پایا۔ چنانچہ علیک سلیک کے بعد آپ بھی اپنے رفقاء کے ساتھ صفائی میں مصروف ہو گئے آپ نے کمروں میں جھاڑو دیا، فرش دھوئے اور چیزوں کو ترتیب سے رکھا۔

چائے وغیرہ پی کر روانہ ہوئے آپ اسلام آباد کے مصروف’’ زیرو پوائنٹ‘‘ پر پہنچے تو دوپہر کے پونے بارہ بجے تھے۔ آپ نے اپنے ساتھی سے کہا’’ ہمیں ہر حال میں چار بجے لاہور پہنچنا ہے مجھے وہاں کچھ ضروری کام سرانجام دینے ہیں۔۔۔ لہٰذا گاڑی دوڑائیں‘‘ ساتھی نے گاڑی کو بے حد تیز چلایا راستہ میں تیسرے دوست نے کہا’’ احتیاط کریں کہیں حادثہ نہ ہو جائے‘‘ تو آپ نے جواب دیا’’ ہم نے گاڑی کے حادثہ کی موت نہیں مرنا بے فکر رہیں‘‘

آپ ٹھیک ساڑھے چار بجے لاہور پہنچ گئے۔ نہائے، کپڑے بدلے اور سیدھا کلینک چلے گئے۔ اچانک بیٹھے ہی تھے کہ ایک غریب ضعیف عورت کا بچہ آ گیا اس نے اپنی والدہ کی صحت کے بارے میں آگاہ کیا۔ چند روز پہلے آپ نے ضعیفہ کا آپریشن کیا تھا۔ آپ نے فوراً اپنی گاڑی کے ذریعہ بوڑھی اماں کو بلایا۔ چیک اپ کیا اور پھر انھیں چھوڑنے کا بندوبست بھی کیا۔

جب آپ کا رفیق مریضہ کو گھر چھوڑ آیا تو انھوں نے مزاحاً کہا’’ ڈاکٹر صاحب یہ مریضہ تو

فائدہ میں ہے کہ آپ نے آپریشن مفت کیا، دوائی دی اور پھر آمدورفت کا بھی اہتمام کیا۔۔۔''
آپ نے فرمایا ''ایسے مریض خدا کی طرف سے ہمارے اوپر قرض ہوتے ہیں۔ان کی تیمارداری اورتعاون ہم پرفرض ہوتا ہے۔وگرنہ روز قیامت ایسے لوگوں کے بارے میں ہم سے پوچھا جائے گا کہ انسانیت کوتڑپتا دیکھ کرآپ نے کوتاہ نظری کیوں کی۔۔۔۔؟''

کلینک سے ٹھیک آٹھ بجے شب فارغ ہوکرآپ اپنے بچوں کے ہمراہ سید ذوالفقارنقوی کے گھر چلے گئے۔جواس وقت تحریک جعفریہ کے رہنما کی حیثیت سے سرکاری سطح پر کی جانے والی گرفتاریوں کی بدولت جیل میں تھے۔آپ نے شام کا کھانا بھی ان کے گھر کھایا۔ان کے بچوں کوتسلی دی اورصورتحال سے آگاہ کیا۔

۶ مارچ کو معمول کے مطابق اسپتال،تحریک کے دفتر،فلاحی دفتر اورکلینک پر گئے۔رات کو گھر واپس لوٹے تو وہاں پرموجودایک محافظ سے کلینک جانے کو کہا مگروہ بضد تھا کہ وہ صبح آپ کے ساتھ ہی جائے گا۔آپ نے اسے ایک بار رخصت کیا مگروہ تھوڑی دیر بعد واپس آکر دیگر محافظین کے ساتھ بیٹھ گیا۔نہ جانے ڈاکٹر صاحب کو کیا خیال آیا کہ آپ رات کو اٹھ کر محافظ رفقاء کے کمرہ میں آئے اوراس دوست کوموجود پا کر برہم ہوئے۔یادرہے کہ محافظ رفقاء کودیگر رفقاء کی جانب سے سختی سے ہدایات تھیں کہ وہ ڈاکٹر صاحب کوتنہا نہ چھوڑیں۔اس لئے وہ ساتھی فرائض کی بجا آوری اورسختی سے کاربند تھااوروہ آپ کوچھوڑ کرکلینک نہیں جانا چاہتا تھا۔تاہم آپ نے سختی سے صبح سویرے اسے کلینک بھیج دیا۔

یہ کس کا لہو ہے کون مرا۔۔۔؟

بتایا جاتا ہے کہ جب آپ ۷ مارچ ۱۹۹۵ کی صبح حسب معمول اپنے گھر سے نکلے تو آپ کے ساتھ صرف ایک رفیق تقی حیدر ہمسفر ہوا جبکہ ایک پہلے سے کلینک پہنچ چکا تھا۔آپ گھر سے روانہ ہوئے ہی تھے کہ تاڑ میں کھڑے ہوئے ایک شخص کے فائر نے ہوامیں پرواز کی جوتاک میں بیٹھے ہوئے قاتلوں کے لئے ''گرین سگنل'' تھا جس پر یتیم خانہ چوک اورساہیوال اڈا کے عین درمیان میں ایک گلی کے کونہ پرنصب بجلی کے دوکھمبوں کی اوٹ میں بیٹھے کلاشنکوف برادر دوافراد نے پوزیشن سنبھالیں۔آپ کی گاڑی جونہی اس گلی کے سامنے آئی ایسے میں آگے جاتی ہوئی ویگن نے بریک لگائی جس کی وجہ سے آپ کوگاڑی آہستہ کرنا پڑی۔بس آپ رکے ہی تھے کہ آپ کی بائیں سامنے کی جانب سے فائرنگ شروع ہوگئی۔سامنے والے حملہ آور نے آپ کو جبکہ بائیں جانب والے نے آپ کے رفیق تقی حیدرکو برسٹ کا نشانہ بنایا۔

حملہ آوروں کا وار اتنا کاری تھا کہ آپ اورآپ کا رفیق سنبھل ہی نہ سکے جبکہ فائرنگ اتنی شدید تھی کہ موقع پرموجود ہزاروں لوگ دیواروں سے لگ گئے۔اس موقع پر کئی راہگیر بھی زخمی ہوئے جبکہ ایک معصوم بچہ سبطین رضا جواسکول جارہا تھا۔گولی لگنے سے شہید ہوگیا۔آپ جس سڑک پرستم کا نشانہ بنے وہ لاہور کا ''ملتان روڈ'' ہےاورجس چوک پرآپ کا ناحق خون بہاوہ لاہور کا پرہجوم چوک تصورکیا جاتا ہے جہاں چوبیس گھنٹے ٹریفک کی بہتات اورلوگوں کا انبوہ رہتا ہے۔ جبکہ آپ کی مقتل گاہ آپ کی رہائش گاہ سے بمشکل دوفرلانگ کے فاصلہ پر ہے۔

قاتل اطمینان کے ساتھ قتل کرنے کے بعد فاتحانہ انداز میں کلاشنکوفیں لہراتے ہوئے دو مزیدافراد کے ساتھ موٹرسائیکلوں پرروانہ ہوئے اورآرام سے اپنے ٹھکانے پر جا پہنچے۔

جب خوف کی فضاختم ہوئی تو لوگ ایک دم آپ کی گاڑی کی طرف لپکے اور ہرفرد کی زبان پرایک سوال تڑپا۔

یہ کس کا لہو ہے کون مرا۔۔۔؟

اس وقت کسی کو علم نہ تھا کہ

☆ یہ ایک معاشرے کا اعلیٰ تعلیم یافتہ ڈاکٹر تھا۔۔۔جومعاشرے کے جہلا اجرتی قاتلوں کے

ہاتھوں مارا گیا۔

☆ یہ ایک دکھی انسانیت کی خدمت کے لئے اسپتال جا رہا تھا۔۔۔ جو انسانیت کے قاتلوں کے ستم کا نشانہ بن گیا۔

☆ یہ فرزند مصطفیٰؐ تھا۔۔۔ جو مصطفیٰؐ کے بظاہر کلمہ گو لوگوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔

☆ یہ فرزند اسلام تھا۔۔۔ جو دشمنان اسلام کے غضب کی بھینٹ چڑھ گیا۔

☆ یہ پاک دھرتی کا بے لوث محافظ تھا۔۔۔ جو وطن عزیز کے بدخواہوں کی سازش کا نشانہ بن گیا۔

☆ یہ اتحاد بین المسلمین کا داعی تھا۔۔۔ جو نفاق بین المسلمین کے علمبرداروں کی کارروائی کا نتیجہ ٹھہرا۔

آپؒ اور آپ کے جانثار رفیق کو فوراً میو اسپتال لاہور لے جایا گیا، جہاں ڈاکٹروں نے موت کی تصدیق کر دی۔ دونوں شہدا کے جنازے پوسٹ مارٹم کے لئے بھیجے گئے۔ جہاں آپؒ کے جسم پر بیس اور تقی حیدرؒ کے جسم پر چالیس کے قریب گولیوں کے نشان واضح ہوئے؟ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زیادہ نشانہ آپؒ کے رفیق کو محافظ سمجھ کر بنایا گیا جو آپ کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھے ہوئے تھے۔

آپؒ کی شہادت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح ملک بھر میں پھیلی اور ہواؤں کے دوش پر سوار ہو کر ملکی حدود عبور کر گئی۔ بین الاقوامی نشریات نے آپؒ کی شہادت کی خبر کو خاصی اہمیت کے ساتھ نشر کیا۔ آپؒ کی جدائی کی اطلاع لبنان اور ایران کے شہدا کے مزاروں اور غازیوں کے کانوں سے ٹکرائی جن کے ساتھ آپؒ نظریاتی محاذوں پر مصروف جہاد رہے۔۔۔ فلسطین و کشمیر کے مجاہدین تک پہنچی جن کی نظریاتی کمک کا مورچہ خالی ہوا۔۔۔ ملت کے علماء کرام و زعماء عظام نے بھی اپنے ہمکار مجاہد کی جدائی کا نوحہ سنا۔۔۔ تحریک جعفریہ کی کمر ٹوٹی اور آئی۔ایس۔او پاکستان نے یتیمی کی دستار باندھی۔۔۔ ہر طرف نوحہ و ماتم کی صدائیں اٹھیں۔

تم تھے تو اتنی تیز نہیں تھی غموں کی دھوپ
تم تھے تو درد حد سے زیادہ بڑھا نہ تھا
تم تھے تو آنکھ واقف گریہ ہوئی نہ تھی

تم تھے تو زندگی پہ بھروسہ بلا کا تھا

تقریباً بارہ گھنٹے بعد آپؒ کا جسد خاکی آپؒ کی رہائش گاہ ۱۴۶ بھلہ سٹاپ ملتان روڈ لایا گیا جہاں تمام شہدا کو غسل و کفن ملا۔ بارہ تیرہ گھنٹے کے دورانیہ میں لاہور کے گردونواح اور مختلف شہروں کے نوجوان اور تحریک جعفریہ کے تمام مرکزی قائدین لاہور پہنچ گئے۔ آہ و بکا، نوحہ و ماتم کے لامتناہی سلسلہ کے دوران اپنوں کی زبان پر یہ سوال تڑپتا رہا کہ قاتل کون تھے۔۔۔؟

چونکہ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے زاویے مختلف تھے اور ان کا اثر دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اس لئے ہر زاویہ حیات سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے تاثرات بھی مختلف تھے۔

اکثریت کا خیال تھا کہ یہ کارروائی ملت جعفریہ کی مخالف تنظیم کی ہے کیونکہ یہ لوگ ایک عرصہ سے آپؒ کے تعاقب میں تھے۔ انھوں نے آپؒ کے خلاف اپنے کارکنان کے قتل کا مقدمہ درج کرایا تھا اور ان کے رہنماؤں نے کئی بار سٹیج پر آپ کا نام لے کر تنقید کی تھی۔

تحریک جعفریہ کے صوبائی دفتر کی رپورٹ کے مطابق کہ اپنی شہادت سے ایک روز قبل ڈاکٹر صاحبؒ نے دفتر فون کر کے انھیں متنبہ کیا کہ مخالف تنظیم کے دفتر واقع لٹن روڈ لاہور میں دو تین روز سے مسلسل کوئی خفیہ میٹنگ ہو رہی ہے اور مختلف چہروں کی نقل و حرکت مشکوک ہے لہٰذا اردو بازار لاہور کی شیعہ تاجر برادری کو ممکنہ خطرات سے بچنے کے لئے آگاہ کر دیں۔ یاد رہے کہ چند روز پہلے اردو بازار میں ایک مذہبی تاجر کا قتل ہوا تھا جن کی ذمہ داری اہل تشیع کی ایک جماعت پر ڈالی گئی تھی اور انھوں نے شیعہ تاجروں سے انتقام لینے کا اعلان کیا تھا اور پھر وہ شیعہ تاجر برادران پر حملہ ہوا جس کے نتیجہ میں ایک شہید ہو گیا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایک مذہبی تنظیم کو ڈاکٹر صاحب جیسے انسان سے کیا دشمنی تھی کیونکہ نہ آپ تحریک جعفریہ کے عہدیدار تھے نہ جلسوں اور اخبارات کی زینت بنتے تھے اور نہ کبھی ان کا مخالف تنظیم سے آمنا سامنا ہوا تھا۔۔۔

اس ضمن میں جواب بڑا سادہ سا ہے کہ دشمن دو حوالوں سے آپؒ کو جانتا تھا اس کا خیال تھا کہ ڈاکٹر نقویؒ ملت جعفریہ کی ریڑھ کی ہڈی، تحریک جعفریہ کا ذہن اور آئی۔ایس۔او پاکستان کا

سرپرست ہے۔لہٰذا اس کا قتل اہل تشیع کی کمر توڑنے کے مترادف ہے اور دوم اسے یہ گمان بھی تھا کہ اس کے خلاف ہونے والی تمام کارروائیوں اور اس کے تمام منصوبوں کی ناکامی کے پیچھے ڈاکٹر نقویؒ کا ہاتھ ہے۔لہٰذا وہ ڈاکٹر صاحب کی زندگی کا مقابلہ کرنے کی جنگ ہار بیٹھا اور اس نے اپنے روایتی انداز کو اپنایا۔

ایک حلقہ یہ رائے بھی رکھتا تھا کہ مخالف تنظیم کے ایک رہنما نے بارہویں امام حضرت امام مہدی علیہ السلام کے خلاف جو زبان دراز کی ہوئی تھی اور پورے مسلمان اس کی گستاخانہ حرکت پر مشتعل تھے اسے خدشہ تھا کہ دو آدمی اس کی جان کے لئے بڑا خطرہ ہیں۔ایک جھنگ کے بریلوی اور سیاسی مخالف شیخ محمد اقبال جن پر اس تنظیم کے دو بڑے رہنماؤں کے قتل کے الزامات اور ثبوت پہلے سے موجود تھے اور دوسرا اہل تشیع سے ڈاکٹر محمد علی نقویؒ جن کا نام مخالف حلقہ کے لئے ایک خوف کی علامت بنا ہوا تھا۔لہٰذا ایک منصوبہ بندی کے تحت ۵ مارچ کو شیخ محمد اقبال اور ۷ مارچ کو ڈاکٹر محمد علی نقویؒ قتل کر دیے گئے۔

ایک اطلاع کے مطابق اسی تنظیم کے ایک گرفتار ملزم سے ڈائری برآمد ہوئی جس پر پانچ مارچ جھنگ، چھ مارچ ملتان اور سات مارچ لاہور لکھا ہوا تھا۔

تحریک جعفریہ کا معتمد حلقہ بھی ڈاکٹر صاحب کے قتل کا ذمہ دار ہی مخالف تنظیم کو ٹھہرا رہا تھا کیونکہ چھ ماہ قبل موصول ہونے والی رپورٹ کے مطابق کہ ''ڈاکٹر صاحب پر قاتلانہ حملہ چوک یتیم خانہ یا سکیم موڑ ملتان پر ہوگا'' بھی اس تنظیم کی نشاندہی کرتا تھا۔

تحریک جعفریہ کے ایک معتبر حلقہ کا یہ خیال تھا کہ ڈاکٹر صاحب چونکہ رجعت پسندانہ یا فرقہ وارانہ سرگرمیوں میں کبھی دلچسپی نہیں لیتے تھے بلکہ ان کا معیار دشمنی بھی خاصا وزنی تھا وہ امریکہ کو اسلام اور پاکستان کا دشمن قرار دیتے تھے اور انھوں نے پاکستان میں پہلی بار امریکہ مردہ باد کا نعرہ متعارف کرایا تھا اور انھوں نے امریکی اور اسرائیلی رہنماؤں کے پتلے نذر آتش کرنے کی رسم ڈالی تھی اور ان سے یہاں کے امریکی سفارتکار خوفزدہ رہتے تھے۔لہٰذا یہ کارروائی امریکی یا اسرائیلی ایجنٹوں کی سازش کا نتیجہ ہے۔

ایک غیر جانبدار حلقہ یہ تجزیہ بھی کرتا تھا کہ سندھ کراچی کے حالات کی خرابی کے بعد بھارت نے پنجاب کے حالات خراب کرنے کے لئے ایک بڑے رہنما قتل کرایا ہے تاکہ فرقہ واریت کو شدت ملے اور پاکستان کا استحکام کمزور ہو۔

ایک محدود حلقہ اس حادثہ کا ذمہ دار ایک معروف طلبہ تنظیم کو ٹھہراتا تھا جس کے ساتھ آئی۔ایس۔او لاہور کی شدید چپقلش چل رہی تھی اور اس سے قبل کئی بار نازک معاملات پر ڈاکٹر صاحب کا بھی اس سے آمنا سامنا ہو چکا تھا۔

تحریک جعفریہ کا ایک دوراندیش حلقہ اس سانحہ کے پیچھے ملکی ایجنسیوں اور بالخصوص پنجاب حکومت (وٹو حکومت کا ہاتھ تصور کرتا تھا۔کیونکہ اس حلقہ کا خیال تھا کہ ملکی ایجنسیوں کے کاغذات میں ڈاکٹر صاحب تحریک جعفریہ کے سب سے بڑے رہنما اور ذہن ہیں دوم اس وقت کی پنجاب حکومت مخالف تنظیم کے دو ایم۔پی۔اے اور مذہبی دباؤ کی بدولت گھٹنے ٹیک چکی تھی اور اس نے شیعت کے لئے ضیاء الحق کی یاد تازہ کر رکھی تھی۔

اس ضمن میں سیاسی حلقہ یہ تاثر بھی دیتا رہا ہے کہ منظور وٹو حکومت اہل تشیع پر ظلم کا بازار اس لئے گرم کیے ہوئے ہے کہ شیعہ ووٹر پیپلز پارٹی کے دو اقتدار سے مایوس ہوں اور اس طرح پی۔پی کی قوت کا شیرازہ بکھر جائے۔

دوراندیش حلقوں کے دلائل کے مطابق کہ پنجاب حکومت نے جعلی پولیس مقابلے شروع کر کے ڈاکوؤں، قاتلوں، مفروروں کے قتل کی آڑ میں چند مذہبی رہنماؤں کے قتل کے منصوبے تیار کر رکھے تھے۔اس حلقہ کی اطلاع کے مطابق جب ڈاکٹر صاحب ۲۴ فروری ۱۹۹۵ کو اپنی زندگی کے آخری جلوس ''یوم القدس'' میں شریک تھے تو پولیس کے حلقوں میں سے کچھ سادہ لباس میں ملبوس لوگ ان پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ایسے لوگوں کی حرکت سے ڈاکٹر صاحب کو بھی آگاہ کیا گیا اور انھوں نے اس بات کا نفوس بھی لیا۔

آپؒ کی حفاظت پر مامور نوجوانوں نے بتایا کہ ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب تحریک جعفریہ کے صوبائی دفتر واقع مسلم ٹاؤن لاہور میں بیٹھے ہوئے تھے کہ آپؒ کو کلینک سے فون کے ذریعے آگاہ

کیا گیا کہ ''ییلو کیب ٹیکسی'' پر کچھ مشکوک لوگ کلینک کے گرد چکر لگا رہے ہیں جن کے ہاتھوں میں ''موبائل فون'' ہیں۔ یہ اطلاع ملتے ہی یہ دونوں نوجوان جائزہ لینے کے لئے موٹر سائیکل پر سوار ہوئے۔ مغرب کا وقت تھا ابھی یہ کلینک کے پاس پہنچے ہی تھے کے مشکوک ٹیکسی کلینک کی گلی سے برآمد ہوئی اور ٹھوکر نیاز بیگ کی طرف روانہ ہوگئی۔ ان دونوں نوجوانوں نے اس کا غیر محسوس انداز میں تعاقب کیا اور ملتان روڈ پر واقع پولیس چوکی پر موجود انسپکٹر کو اس بات سے آگاہ کر دیا۔

یہ گاڑی کچھ فاصلے پر جا کر ایک مسجد کے سامنے ٹھہری تو اتنے میں پولیس انسپکٹر بھی وہیں پر پہنچ گئے۔ ان نوجوانوں کا خیال تھا کہ مشکوک افراد ہتھے چڑھ گئے ہیں مگر جونہی ایک شخص گاڑی سے باہر نکلا تو وہ مسکرایا اور انسپکٹر نے اسے گلے لگا لیا۔

ابھی تک یہ عقدہ حل نہ ہوسکا کہ وہ کون لوگ تھے اور کس مقصد کے لئے آئے تھے۔۔۔؟

اپنے ایک نہایت معتمد ساتھی کے سامنے اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ ایک مرتبہ پولیس کے اعلیٰ افسر نے آپ پر واضح کیا تھا کہ ''ڈاکٹر صاحب آپ ہمیں بڑے عرصے سے مطلوب ہیں مگر کوئی موقع نہیں مل رہا'' ایسے ہی چند اور واقعات کی روشنی میں آپؒ نے فرمایا کہ ''بہتر ہے ایک مرتبہ میں پولیس مراحل سے گزر جاؤں یہ روز کے ڈراوے، دھمکاوے مجھے تنگ کر چکے ہیں۔''

۲۴ فروری کی شب ملک بھر میں فرقہ وارانہ سرگرمیاں روکنے کے لئے مذہبی رہنماؤں کی گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوا تو ایجنسیوں سے مربوط ایک شخص نے ڈاکٹر صاحب سے کہا اگرچہ آپ کا نام گرفتار کیے جانے والوں میں نہیں ہے تاہم آپ کے لئے مناسب ہے کہ آپ ایک ماہ کی چھٹی لے کر یہاں سے باہر چلے جائیں۔ آئی۔ جی پولیس نے اعتراف کیا کہ گرفتار ہونے والے رہنماؤں میں ڈاکٹر صاحب کا نام تھا مگر انھوں نے یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب شریف النفس انسان ہیں کا نام خود کاٹ دیا۔

بعض باشعور افراد کا خیال تھا کہ پولیس کا ڈاکٹر صاحب کو گرفتار نہ کرنا اور انھیں کھلا چھوڑ دینا اس خدشے کا پیش خیمہ تھا کہ ایجنسیاں اندرونی یا بیرونی اشارے پر ڈاکٹر صاحب کو مکمل طور پر ختم

کرنا چاہتی تھیں۔

ایف۔آئی۔آر میں درج پانچ ملزمان گرفتار کر لئے گئے مگر ان سے غیر جانبدارانہ تفتیش نہ ہوسکی اور تھوڑے عرصہ بعد تین ملزمان رہا کر دیئے گئے۔ ڈاکٹر صاحب انتہائی دور اندیش اور زیرک انسان تھے۔ اس لئے انھوں نے اپنی وصیت میں تحریر فرمایا تھا کہ ''میرا پوسٹمارٹم نہ کرایا جائے اور نہ میری تجہیز پر تنظیمی اجتماع منعقد کیا جائے۔

بعض افراد ان تمام حقائق کی روشنی میں چلتے چلتے آخر وہی پہنچتے تھے کہ یہ قتل مخالف تنظیم کی کارروائی ہے البتہ وہ ملکی وغیر ملکی ایجنسیوں کے ہاتھوں حسب معمول استعمال ہوئے ہیں۔

جتنے منہ اتنی باتیں ہوئیں بہرحال ہر شخص کا یہ موقف تھا کہ

پھولوں کا بکھرنا تو مقدر میں تھا لیکن
کچھ اس میں ہواؤں کی سیاست بھی بڑی تھی

ایف آئی آر درج کرنے کا وقت آیا تو تھانہ نواں کوٹ میں مخالف تنظیم کے مرکزی رہنما اور کارکنان کے نام شواہد کے ساتھ درج کیے گئے۔ اس دوران میں ایک حلقہ اس بات پر بھی مصر رہا کہ ایف۔آئی۔آر میں منظور وٹو وزیر اعلیٰ پنجاب کا نام دیا جائے مگر نامعلوم وجوہات کی بنا پر ایسا نہ ہوسکا۔

''میرا پوسٹمارٹم نہ کرایا جائے'' یہ جملہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب اپنی شہادت کے بارے میں سو فیصد واضح تھے۔ انھوں نے یہ نہیں لکھا کہ اگر میں قتل ہو جاؤں۔۔۔ اگر مگر کے لفظ تحریر نہ کر کے انھوں نے ثابت کیا کہ وہ اپنی سرخ موت پر یقین کامل رکھتے تھے اور اسے اپنا حق سمجھتے تھے۔

دوم آپ اپنے خون کو عدالتوں میں لے جانے پر ہرگز رضامند نہ تھے اس لئے کہ آپ کو یہاں کسی سے انصاف کی توقع نہ تھی آپ سمجھتے تھے کہ ؎

یہاں تو قاتل بھی ہے منصف تو عدالت میں نہ جا
چور تو چور کو ہی اذن رہائی دے گا۔۔۔۔۔

آپؒ اپنے عظیم قائد علامہ سید عارف حسین الحسینیؒ کے مقدمہ قتل کا نتیجہ دیکھ چکے تھے جب پانچ قاتلوں نے عدالت کے روبرو کئی بار اعتراف جرم کیا اور ۵۶ گواہان نے قاتلوں کے خلاف گواہی دی۔ قاتل بار بار کہتے رہے کہ ہم سے وقت کا پیغمبر قتل ہوا مگر عدالت نے ہر بار کہا آپ قاتل نہیں ہیں اور آخر بیرونی سگنل پر انھیں رہا کر دیا گیا۔

ڈاکٹر صاحب کو پاکستان کی عدالتوں سے بال برابر انصاف کی توقع نہ تھی وہ غیور تھے اور قطعاً برداشت نہیں کرتے تھے کہ ان کا خون عدالتوں میں بظاہر ہار جائے۔

☆☆☆☆☆

گزر تو جائے گی تیرے بغیر بھی لیکن۔۔۔؟

۸ مارچ ۱۹۹۵ کی صبح نو بجے ڈاکٹر صاحب کے گھر کے سامنے آپؒ کے پرستاروں، ماتمداروں اور غمگساروں کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر دکھائی دینے لگا۔ ملک بھر سے ہزاروں افراد آپ کی نماز جنازہ ادا کرنے کے لئے لاہور پہنچے۔ تقریباً گیارہ بجے کے قریب شہدا کے جنازے شیخ زید اسپتال لاہور کے سرد خانہ سے لائے گئے تو استقبالی کہرام سے زمین پر بھونچال آ گیا۔ آپؒ کے تابوت کے چاروں اطراف تحریک جعفریہ اور آئی۔ایس۔او کے پرچم سرنگوں تھے جبکہ آپ کے جسم پر بھی یہ پرچم بطور کفن لپیٹے ہوئے تھے۔

پروگرام کے مطابق آپؒ کی نماز جنازہ ناصر باغ لاہور میں طے تھی۔ چنانچہ آپؒ ہزاروں افراد کے درمیان، ناصر باغ کی جانب ماتمیوں کے دوش پر سوار ہو کر چلے۔

اک جنازہ اٹھا مقتل سے عجب شان کے ساتھ
جیسے سج کر کسی فاتح کی سواری نکلے

ملت جعفریہ کا یہ پہلا بڑا اجتماع تھا جو آپؒ کی قیادت یا نگرانی کے بغیر رواں تھا مگر پھر بھی آپ کے بغیر نہ تھا۔۔۔ آپؒ کے جنازے میں ملک بھر کے علما کرام اور اہل سنت برادران نے بھرپور شرکت فرمائی جبکہ نماز جنازہ علامہ سید ساجد علی نقوی کی اقتداء میں ادا کی گئی۔ نماز جنازہ کی ادائیگی سے قبل اتحاد بین المسلمین کے علمبردار اور اسلام و وطن کے عظیم فرزند کو سنی، شیعہ مسلمانوں نے خراج عقیدت پیش کیا۔ ایک مرحلہ پر جب آپ کے بڑے صاحبزادے سید محمد سلمان نقوی کو اظہار خیال کی دعوت دی گئی تو شرکاء جنازہ پر سکوت طاری ہو گیا۔ آپؒ کے پندرہ سالہ فرزند نے نہایت حوصلہ تحمل سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔۔۔۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔۔۔۔۔ انا للہ و انا الہ راجعون

انسانی عقل و فہم سے بلند و بالا ہے خدا کی ذات جو ایک پل میں ہنستے مسکراتے چمن کو ویران کر دیتی ہے۔ یہ کل صبح کی بات ہے کہ جب میرے شہید والد نے گھر سے نکلتے وقت ہمیں عجیب درد بھرے انداز میں خدا حافظ کہا۔ ان کے الوداعی جملے میں اتنا درد تھا کہ ہمارا پورا گھر غمناک ہو گیا۔ چند لمحوں بعد کل کے سورج اور چشم فلک نے دیکھا کہ میرے بے جرم و بے

خطا والد کو شہر کے پر ہجوم چوک میں اسلام اور وطن دشمن قوتوں کے ایجنٹوں نے انتہائی بے دردی سے شہید کر دیا۔ کل جب ہم شہید سے بے موسم روٹھ جانے کا شکوہ کرنے لگے تو ان کے نحیف جسم سے لہو کے ٹپکتے قطروں نے کہا بیٹا!

زندگی اتنی غنیمت تو نہیں جس کے لئے
عہد کم ظرف کی ہر بات گوارہ کرلیں

زمانہ جانتا ہے کہ میرے والد کا جرم کیا تھا؟ یہی۔۔۔ کہ انھوں نے اسلامی اقدار اور وطن کی سرحدوں کی حفاظت کی، یہی۔۔۔ کہ انھوں نے ملک میں پہلی بار مردہ باد امریکہ کا نعرہ لگایا، یہی۔۔۔ کہ انھوں نے اتحاد بین المسلمین کی صدا بلند کی۔۔ یہی۔۔۔ کہ انھوں نے حضرت امام خمینیؒ کے افکار کو ملک کے در و دیوار تک پہنچایا۔ ہاں، ہاں یہی ان کے جرم تھے جن کی پاداش میں اسلام دشمنوں نے انھیں ہم سے جدا کر دیا۔ میں آج امام زمانہ کے روبرو اپنے محبوب قائد کی موجودگی میں اعلان کرتا ہوں کہ میں اپنے روحانی بھائیوں کے ساتھ اپنے مظلوم اور شہید والد کے مشن کو تکمیل تک پہنچاؤں گا اور ان کے اس دعویٰ کو زندہ رکھوں گا کہ

ہمارے بعد بھی رونق رہے گی مقتل میں
ہم اہل دل کو بڑے حوصلے میں چھوڑ آئے ہیں

البتہ اے میرے مظلوم بابا!

گزر تو جائے گی تیرے بغیر بھی لیکن
بہت اداس بڑی بے قرار گزرے گی

سفیر انقلاب کی شہادت کے بعد ملت جعفریہ کے خیر خواہ نوجوانوں کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ آپؒ نے ملت کے لئے جو بیسیوں منصوبے چلائے ہوئے تھے، تعلیم، جہیز، صحت اور روزگار کے لئے جو کوششیں کی ہوئی تھیں اب انھیں کون جاری رکھے گا، طلباء کے ہاتھوں سے کتاب کو کون گرنے نہ دے گا، ملت کی بچیوں کے ہاتھ پیلے کرنے کی ذمہ داری کون لے گا، بستر علالت پر تڑپنے والے افراد کی مسیحائی کون کرے گا، ضعیف والدین کے نوجوان سہاروں کو روزگار فراہم

کرنے کا بیڑا کون اٹھائے گا، تنظیمی نوجوانوں کو روحانی غذا کون مہیا کرے گا، ظالم دشمن کا مقابلہ کون کرے گا، اپنی قوم کو احساس تحفظ کون بخشے گا، تنظیموں میں دینداری کو زندہ کون رکھے گا، خالصتاً خلوص کی بنیادوں پر اپنے قائد کے ہاتھ کون مضبوط کرے گا، اسلام کی خدمت کا مستقل جہاد کون جاری رکھے گا اور دنیا بھر کے مظلوم مسلمانوں سے رشتہ اخوت کون استوار کرے گا۔۔۔؟ تھرتھراتے ہونٹوں پر صرف ایک سوال تھا ؎

جہاں نہ تو نہ تیری یاد کے قدم ہوں گے
ڈرا رہے ہیں وہی فاصلے سفر کے ہمیں

یہ وہ فکر تھی جو اہل درد کے دل و دماغ پر حاوی تھی مگر آپ کی شہادت کے دوسرے روز آپ کے تربیت یافتہ نوجوانوں کا اجتماع ہوا جس میں ملک بھر سے آئے ہوئے نوجوانوں نے شرکت کی۔ اس موقع پر آپؒ کے معتمد رفقاء جن کا آپ نے وصیت میں بھی ذکر فرمایا ہے اور آپ کے نظریاتی جانشین ہیں نے مرجھائے ہوئے چہروں اور بجھے دلوں کو ڈھارس دی اور ڈاکٹر صاحب کے جاری منصوبوں کو برقرار اور توانا رکھنے کا عہد کرنے کے ساتھ آپ کی وصیت کا مفہوم پیش کیا کہ ؎

ہمیں خبر ہے کہ ہم ہیں چراغِ آخر شب
ہمارے بعد اندھیرا نہیں اجالا ہے

الحمدللہ کہ یہ فرزندان اسلام اپنے سینکڑوں قابل اعتماد برادران کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کی راہ پر گامزن ہیں اور سفیر انقلاب بن کر اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ خدا ان برادران کی توفیقات میں اضافہ فرمائے اور انھیں نظریاتی سطح پر ڈاکٹر صاحب کا حقیقی پیرو بنائے۔

مجھے یقین ہے کہ جب تک یہ برادران ڈاکٹر صاحب کی فکر کے تابع رہیں گے ملک بھر کے ہزاروں نوجوان شہید نقویؒ کی طرح انھیں اپنے دلوں کی سلطنت کا شہنشاہ بنا دیں گے۔

آخر میں اپنی قوم پر واضح کرتا چلوں کہ جب تک اجالے اور اندھیرے کا سلسلہ جاری ہے حق و باطل کے درمیان رن پڑتا رہے گا۔ بقول شاعر کہ ؎

ان دونوں میں رن پڑتا ہے
نت بستی بستی نگر نگر
ہر بستے گھر کے سینے میں
ہر چلتی راہ کے ماتھے پر
وہ آگ لگاتے پھرتے ہیں
ہم آگ بجھاتے پھرتے ہیں
وہ کالک بھرتے پھرتے ہیں
ہم جوت جگاتے پھرتے ہیں

ہمارے لئے ظلم نئے ہیں نہ قربانیاں نئی۔۔۔زمانہ کو آگاہ رہنا چاہیے کہ ؎

ہم صلیبوں پہ چڑھے، زندہ گڑے، آگے بڑھے
رسم جو ہم سے چلی باعث تقلید بنی
شب کے سفاک خداؤں کو خبر ہو کہ نہ ہو
جو کرن قتل ہوئی شعلۂ خورشید بنی

ہمیں اپنی قربانیوں کا قطعاً رنج نہیں بلکہ شہادتیں تو ہمارا افتخار ہیں۔ان کی وجہ سے ہماری تاریخ زندہ ہے اور ہمیشہ انہی حادثوں نے ہمیں توانائی بخشی ہے۔ہمیں افسوس اس بات کا ہے کہ ہمارا دشمن تاریخ سے نابلد ہے وہ بنوامیہ اور بنوعباسیہ کی تقلید پر تواتر آیا ہے مگر اس نے ایک لحظہ کے لئے بھی ہماری تاریخ کا مطالعہ نہیں کیا کہ ہم اس دور میں کیسے زندہ رہے جب عزاداری سیدالشہداء کی ایک مجلس برپا کرنے کے لئے جوان بیٹا ذبح کرانا پڑتا تھا۔۔۔حضرت زینب سلام اللہ علیہا کے خطبہ زندہ رکھنے کی پاداش میں ہمیں دیواروں میں چنوایا جاتا تھا۔۔۔فاتح کربلا اور اسیر شام کی مظلومیت کا نوحہ سنانے کے جرم میں پس زندان دھکیلا جاتا تھا۔۔۔کلمہ حق کہنے پر زبانیں نکلوائی جاتی تھیں۔۔۔ماتم حسین علیہ السلام کی صدائیں بلند ہونے کے عوض میں ہمارے گھر جلائے جاتے تھے۔۔حق اور باطل کی تمیز کرانے پر علماء کرام کا قتل عام ہوتا تھا اور محمدؐ و آل محمدؐ

کے مشن کو زندہ رکھنے والے مورخین کے ہاتھ قلم کیے جاتے تھے۔۔۔اور حسینیتؑ زندہ باد اور یزیدیت مردہ باد کا پرچار کرنے والے کربلا کے سفیروں کے سروں سے مقتل سجائے جاتے تھے۔

ہم اس دور میں بھی زندہ رہے جب کئی کئی میلوں تک ہمیں کوئی اپنا دکھائی نہ دیتا تھا۔۔۔ ان حالات میں بھی ہم نے غم حسینؑ کی آہوں اور سسکیوں کے ذریعہ اپنا پیغام پہنچایا اور ایک ریاست سے دوسری ریاست تک خون کی لکیر کھینچ کر گھروں کو امام بارگاہوں سے متصل کیا۔۔۔یہ حق کی طاقت اور ہماری قربانیوں کا نتیجہ ہے کہ آج ہر ملک پر حسینؑ کی حکمرانی ہے۔۔۔۔کوئی بازاروں میں نکل کر ماتم کرتا ہے اور کوئی گھر کی چار دیواری میں اپنے پیغمبرؐ کے نواسہ کا غم مناتا ہے۔۔۔کوئی خون بہاتا ہے اور کوئی اشک۔۔۔غرضیکہ ہر وہ آنکھ آل محمدؐ کے غم میں اشک بار رہتی ہے جس میں اپنے نبیؐ کی تعظیم کی حیا باقی ہے اور ہر وہ دل خون روتا ہے جس پر ''لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ'' کا اثر موجود ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ ہمارا دشمن فطرت کے ہاتھوں مجبور ہے۔۔۔''محمدؐ'' کو روایتی انداز میں مان کر ''آلِ محمدؐ'' کا قتل اس کی سرشت میں شامل ہے۔وہ بطخ کے بچے کی طرح ہے جو انڈے سے نکل کر فوراً پانی کا رخ کرتا ہے۔۔۔ہمارا دشمن بھی بظاہر مسلمانوں کے گھر میں جنم لیتا ہے مگر وہ فطرت کے طفیل ''آل محمدؐ'' کی مخالفت کی راہ اختیار کرتا ہے۔

ہمارے سینے ظلم کے آگے بطور دیوار کام آتے ہیں ہم خنجر یا گولی سے ڈرنے والے نہیں مگر تاریخ سے بھٹکے ہوئے نادان دشمن سے اتنا کہتے ہیں کہ وہ ہمارے سینے چاک کرنے سے پہلے تاریخ کا دامن کھولے، تعصب کی عینک اتارے اور ہمارا تعارف پڑھے ہم کون ہیں۔۔۔کن کے سفیر ہیں۔۔۔تاریخ کو ہم نے کیسے زندہ رکھا اور کتنے جغرافیے بدلے۔ہم نہ نسب سے شرمندہ ہیں اور نہ تاریخ سے۔۔۔۔ہمارے قبیلے کے ششماہے بچے کا تبسم ہزاروں کی فوج پر غالب آیا ہے۔۔۔شام غریباں کے جلے ہوئے خیموں کی راکھ کی پرواز سے محلات لرزے ہیں۔۔۔ ہمارے پس گردن بندھے ہوئے ہاتھوں سے بادشاہوں کے تخت کانپے ہیں اور ہماری صدائے

حق سے مقتل اور زندان سہے ہیں۔۔۔ ہمیں اپنے بزرگوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ ہم نے ہر دور میں اسلام کا دفاع کیا ہے کیونکہ اس کی بقا پر ہمارے قبیلہ سے زیادہ خرچ کسی کا نہیں ہوا اور ہر حالت میں اپنے وطن کا استحکام پیش نظر رکھا ہے اور اس کے چپہ چپہ کے تحفظ کو اولین فریضہ جانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے قیام پاکستان سے لے کر استحکام پاکستان تک اپنا سب کچھ قربان کیا ہے۔ ہم نے اپنے خون سے اس کی تاریخ لکھی ہے اور دنیا کے نقشہ پر فتح کی لکیریں کھینچی ہیں۔ مجھے یہ لکھنے میں باک نہیں کہ وطن عزیز کا قیام ''محمد علی جناحؒ'' اور استحکام ڈاکٹر محمد علی نقوی کے خون کا مرہون منت رہے گا۔

ہر وہ چہرہ جو اسلام میں انتشار پھیلانے کا مرتکب ہوگا یا وطن عزیز کے استحکام کو کمزور کرنے کی سازش کرے گا چاہے وہ سیاسی عدم استحکام کے حوالہ سے ہو یا سیاسی و مذہبی فرقہ واریت کی شکل میں، ہم سینہ سپر ہو کر اس کا پامردی سے مقابلہ کریں گے اور اپنے شہدا کی تاریخ کو زندہ رکھیں گے کہ

ے

جب ساز سلاسل بجتے تھے ہم اپنے لہو سے سجتے تھے
وہ رسم ابھی تک باقی ہے یہ رسم ابھی تک جاری ہے
جب پرچم جاں لے کر نکلے ہم خاک نشیں مقتل مقتل
اس وقت سے لے کر آج تلک جلاد پہ ہیبت طاری ہے
زخموں سے بدن گلزار سہی پر ان کے شکستہ تیر گنو
خود ترکش والے کہہ دیں گے یہ بازی کس نے ہاری ہے
ہم سہل انگار سہی لیکن کیوں اہل ہوس یہ بھول گئے
یہ خاک وطن ہے جاں اپنی اور جان تو سب کو پیاری ہے

سلام تجھ پر! کہ تو نے وفا کی لاج رکھی

قارئین! اگر سفیر انقلاب کی مجاہدانہ زندگی اور فاتحانہ موت پر مفصل تذکرہ کے بعد، شہید وفا آغا تقی حیدر کا ذکر نہ ہوا تو یہ نہ صرف کتاب کے عنوان کی تشنگی کا باعث بنے گا بلکہ وفا سے بھی نا انصافی ہوگی۔

شہادت گواہی کے مفہوم میں آتی ہے اور گواہی وفا کے بغیر مکمل نہ ہوتی۔ اس بات کا ثبوت ۷ مارچ ۱۹۹۵ کو وفا کے پیکر آغا تقی حیدر نے اپنے بازو کٹوا کر دیا۔ آغا تقی حیدر سفیر انقلاب سے پہلے شہید ہوئے اور اپنے جسم میں اپنے محبوب رہنما سے زیادہ گولیاں جذب کیں۔

شہید وفا تقی حیدر ۱۶ جولائی ۱۹۷۳ کو امامیہ کالونی لاہور میں پیدا ہوئے۔ آپ نے میٹرک اپنے علاقہ کے ہائی سکول سے کیا بعد ازاں ایف۔اے کے لیے کالج میں داخلہ لے لیا اور مذہب سے قلبی لگاؤ کی بدولت قومیات میں متحرک ہو گئے۔ آپ کے بڑے بھائیوں نے چمڑے کا کارخانہ لگایا تو انھیں آپ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ گھر والوں کے اصرار پر آپ کو تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا مگر اپنے کارخانہ میں کام کرنے کی بجائے آپ کا رجحان قومی خدمت کی طرف مائل رہا۔

ملکی حالات کی تلخیوں کے پیش نظر آپ نے امامیہ کالونی میں اپنی ملت کے دفاع اور اتحاد بین المسلمین کے پرچار کے لئے ''پاسبان'' میں شمولیت اختیار کی تو تھوڑے عرصہ بعد آپ کو خلوص اور شجاعت کی بنا پر تحصیل کی سطح پر مسئولیت سونپی گئی اسی دوران میں آپ کی والدہ کی طبیعت ناساز ہوئی تو آپ انھیں ڈاکٹر محمد علی نقوی کے کلینک پر لے آئے۔ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ چند لمحے گزارنے کے بعد تقی حیدر بظاہر بچھڑ گئے مگر دل سے جدا نہ ہو سکے۔ اس کے بعد ایک دو مرتبہ عقیدتاً ڈاکٹر صاحب سے ملنے آئے اور یوں ان کی ذات میں ضم ہوتے چلے گئے۔

سفیر انقلاب کے سر پر خطرات کے سائے منڈلانے لگے تو آپ کے قریبی رفقاء نے آپ

کے محافظین کے بارے میں سنجیدگی سے غور کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس سے اتفاق نہ کیا اور بددستور کہتے رہے کہ ''موت کا ایک روز اٹل ہے اور تدبیریں، تقدیر کی راہ میں حائل نہیں ہوسکتیں۔'' مگر احباب کا اصرار رہا کہ ''ڈاکٹر صاحب آپ اپنے لئے نہیں قوم کے لئے جی لیں۔''

بالاخر سفیر انقلاب محافظین رکھنے پر آمادہ ہوگئے مگر انھوں نے محافظین کے انتخاب کو اپنے تک محدود رکھا۔ اس سلسلہ میں تقریباً دس پندرہ معتمد نوجوان مختلف علاقوں سے آئے مگر ڈاکٹر صاحب کی دوراندیش نظروں میں کوئی نہ جچا۔ ڈاکٹر صاحب کو خدا نے اس صلاحیت سے نوازا تھا کہ آنکھوں کے دروازوں سے دل میں اترتے تھے اور دل کی کتاب کا مطالعہ چہرے کے تاثرات سے کرتے تھے۔ چونکہ آپ کا سلسلہ نسب کربلا سے ملتا تھا اور منزل آپ کے سامنے تھی اس لئے آپ بھی اس حقیقت کے قائل تھے کہ

بجھے چراغ پہ ہم دوستی پرکھتے ہیں
یہ رسم! اپنے قبیلے میں ابتداء سے ہے

ایک شام اپنے محبوب کا محافظ بننے کی غرض سے آغا تقی حیدر بھی آئے۔ چند لمحے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ بیٹھے اور یوں ایک دوسرے کے ہوگئے۔ سفیر انقلاب نے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ سجا کر تقی حیدر کو ساتھ رکھنے کی آمادگی کا اظہار کیا اور تقی حیدر نے فرزند اسلام کی حفاظت کرنے کو افتخار جان کر عزم وفا کرلیا۔

آغا تقی حیدر گھر گئے اور الوداع کر کے راہی شہادت ہوگئے۔ جن احباب نے آپ کو قریب سے دیکھا وہ اس حقیقت کے گواہ ہیں کہ تقی حیدر اپنے محبوب کے گرد ہمیشہ دیوانہ وار گھومتے رہے۔ آپ کا معمول تھا کہ اسپتال، دفتر، کلینک یا گھر کے گرد عقابی نظروں کے ساتھ گشت کرتے اور ڈاکٹر صاحب کو جس راہ سے گزرنا ہوتا تھا اس کا جائزہ لیتے۔ چونکہ ڈاکٹر صاحب عام طور پر ۱۸ گھنٹے مسلسل کام کرنے کے عادی تھے اس لئے تقی حیدر کو ۱۸ گھنٹے سے زیادہ جاگنا اور متحرک رہنا پڑتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے پرائیویٹ دفتر کے باورچی نے بتایا کہ تقی حیدر بعض اوقات بے حد تھکے ہوتے تھے۔ جونہی ڈاکٹر صاحب اپنے دفتر میں دیگر احباب کے ساتھ بیٹھ جاتے تو تقی حیدر

غیر محسوس انداز میں کچن میں ایک چادر بچھا کر چند لمحوں کے لئے سو جاتے تھے البتہ باورچی کو تاکید کرتے کہ ڈاکٹر صاحب کے دفتر سے نکلنے سے قبل انھیں جگا دیا کریں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ شہید وفا ابھی سوئے ہی ہوتے کہ ڈاکٹر صاحب دفتر سے باہر جانے کا ارادہ کر لیتے یوں آپ کو جگایا جاتا تو آپ تڑپ کر اٹھتے اور فوراً منہ دھو کر سفیر انقلاب سے آگے گیٹ پر نکل آتے اور اپنی تھکاوٹ محسوس نہ ہونے دیتے۔

ایک مرتبہ آپ اسپتال کے گیٹ پر کھڑے تھے میں نے کہا ''تقی بھائی خیال کرنا قوم کی امانت آپ کے پاس ہے'' یہ سنتے ہی کہنے لگے ''زندگی کی آخری سانس تک قوم کو ڈاکٹر صاحب کی حفاظت کی ضمانت دیتا ہوں۔'' چند روز بعد ڈاکٹر صاحب اور راقم کو اسلام آباد جانا پڑا تو تقی حیدر اپنے محبوب کو اسٹیشن پر چھوڑنے آئے اور روانگی سے قبل مجھے علیحدگی میں کہا ''آج ہماری امانت آپ کے پاس ہے خیال رکھنا'' تقی حیدر کے یہ جملے میرے دل میں اترے اور لفظ ''امانت'' لاہور واپسی تک میرے ذہن میں گھومتا رہا۔

آپ کے گھر والوں نے بتایا کہ آپ والدہ سے ملنے چند لمحوں کے لئے آتے اور فوراً ڈاکٹر صاحب کے پاس واپس چلے جاتے۔ کئی بار گھر والوں نے ایک دو روز گھر گزارنے کی خواہش کا اظہار کیا مگر آپ نے کہا ''ڈاکٹر صاحب اکیلے ہو جائیں گے۔'' عید کے موقع پر ڈاکٹر صاحب نے آپ کو تین چار روز گھر گزارنے کی تاکید کی مگر آپ ایک روز کے بعد واپس آگئے اور کہنے لگے ''مجھے آپ کے بغیر قرار نہیں آتا۔''

ایک مرتبہ آپ گھر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ کسی نے فون پر اطلاع دی کہ ڈاکٹر صاحب قتل ہوگئے ہیں یہ سنتے ہی آپ نے اطمینان سے کہا ''یہ ممکن نہیں ہے کہ میں زندہ ہوں اور ڈاکٹر صاحب کو کوئی قتل کردے۔''

آپ کے بھائیوں نے ایک مرحلہ پر آپ سے درخواست کی کہ ڈاکٹر صاحب سے دو چار ماہ کی چھٹی لے کر گھر آجائیں اور اپنے کارخانہ کو منظم اور رواں کریں مگر آپ نے جواباً کہا ''ذاتی کارخانہ کی بجائے قومی کارخانہ کی حفاظت زیادہ ضروری ہے۔''

شہادت کے روز آپ سفیر انقلاب کے ساتھ گاڑی کی اگلی نشست پر بیٹھے ہوئے تھے کہ دہشت گردوں نے سب سے پہلے آپ کو نشانہ بنایا اور کلاشنکوف کے کئی برسٹ مار کر آپ کو چھلنی کیا چشم دید گواہوں کا کہنا ہے کہ جب ڈاکٹر صاحب کی گاڑی بے پناہ رش اور گاڑیوں میں پھنسی تو موٹر سائیکل پر سوار ایک شخص نے پیچھے سے پستول کا فائر کیا جونہی تقی حیدر پیچھے کی سمت متوجہ ہوئے تو دو کلاشنکوف برادر سامنے آئے اور انھوں نے سب سے پہلے تقی حیدر اور پھر ڈاکٹر صاحب کو دہشت گردی کا نشانہ بنایا۔

جائے حادثہ پر موجود ایک خاتون نے روایت کی کہ نوجوان (تقی حیدر) فائرنگ کے دوران کبھی ہاتھ اٹھا کر گولیاں روکتا تھا اور کبھی اپنے دائیں بیٹھے ہوئے شخص پر گرتا تھا۔ آپ کو غسل دیتے وقت یہ حقیقت سامنے آئی کہ آپ کے بازو کٹے ہوئے تھے اور آپ کے جسم پر کم وبیش چالیس کے قریب گولیوں کے زخم تھے۔ جس سے یہ تاثر ملتا تھا کہ آپ اپنے محبوب کو بچانے کے لئے ان پر بار بار گرتے رہے۔

بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ ڈاکٹر صاحب پہلے حملہ سے بچ گئے تھے قاتلوں نے جاتے جاتے محسوس کیا کہ ان کا اصل نشانہ ابھی زندہ ہے تو وہ واپس لوٹے اور انھوں نے پھر سے برسٹ مار کر ڈاکٹر صاحب کو شہید کیا۔

شہید وفا کی اس وفا کو دیکھ کر ان کے وہ جملے یاد آئے کہ زندگی کی آخری سانس تک قوم کو ڈاکٹر صاحب کی زندگی کی ضمانت دیتا ہوں ۔ یا یہ ممکن نہیں کہ میرے ہوتے ہوئے کوئی ڈاکٹر صاحب کو قتل کردے۔

آغا تقی حیدر نہ صرف اپنے رب اور قوم کے روبرو سرخرو ہوئے بلکہ انھوں نے حضرت ابو طالب علیہ السلام سے شروع ہونے والی پاک وفاؤں کی لاج رکھی۔ شہید پرور قوم تقی حیدر کی وفاؤں کو تا زیست سلام کرتی رہے گی اور ان کے والدین کی عظمتوں کو تاریخ اپنے دامن میں محفوظ رکھے گی جو اپنے بیس سالہ خوبصورت جوان بیٹے کی میت پر رونے کی بجائے قوم کو ڈاکٹر صاحب کا پرسہ دیتے رہے۔ ماں نے چار دیواری کے اندر تقی حیدر کا آخری بوسہ لیتے ہوئے فرمایا ''تم

نے کربلا کے شہید وفا کی یاد تازہ کر کے میرے دودھ کی لاج رکھ لی ہے اب میں روز محشر حضرت عباس علمدار علیہ السلام کی ماں کے روبرو سرخرو رہوں گی کہ میرے بیٹے نے فرزند رسول کو بچانے کے لئے اپنے بازو کٹوائے تھے۔'' اور بوڑھے باپ نے ناصر باغ لاہور میں ہزاروں ماتمیوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا'' میں معذرت خواہ اور شرمسار ہوں کہ میرا بیٹا ڈاکٹر صاحب کو نہیں بچا سکا۔''

اے شہید وفا! تمھیں تمھارے بھائی سلام کہتے ہیں کہ تو نے شہادت کی داستان مکمل کی ہے۔ جب تک سفیر انقلاب کا نام زندہ رہے گا تمھارا نام بھی اسی طرح زندہ وتابندہ رہے گا اور کہیں بھی سفیر انقلاب کا ذکر شہید وفا کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوگا۔

جب ذکر وفاؤں کا گلستاں میں چھڑے گا
برسوں تجھے گلشن کی فضا روتی رہے گی

اے تقی حیدر! آپ نے اپنے ساتھیوں پر نہیں بلکہ قاتل پر وفا کے اثرات مرتب کیے ہیں آپ نے قاتل پر واضح کیا کہ تم جس قوم کے فرزند ہو وہ شہادت کو اپنی میراث سمجھتی ہے اور عارضی زندگی کو سرخ موت پر ترجیح نہیں دیتی۔ تمھاری وفا نے زمانہ پر ثابت کیا کہ واقعاً۔۔۔؟

تم پرچم عباسؑ کے سایہ میں پلے تھے

☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شہادت کیا ہے اور شہید کا رتبہ کیا ہے۔۔۔؟

عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ ہم ''شہادت'' اور ''عام موت'' کے درمیان فرق محسوس نہیں کرتے بلکہ ''شہادت'' کو جان کا ضیاع سمجھتے ہیں جس پر نوحہ و ماتم کے علاوہ طویل عرصہ تک افسوس کرتے رہتے ہیں اور طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی شہادت کے بعد بھی حسب معمول بظاہر باشعور چنداں افراد سے یہ سننے کا موقع بھی ملا کہ ''ڈاکٹر صاحب تحریک جعفریہ میں فعالیت اور آئی۔ایس۔او کی سرپرستی کی بدولت مارے گئے۔۔۔وہ ڈاکٹر بنے مگر اپنی زندگی کو آسودہ نہ کر سکے۔۔۔اپنے بچوں کو پروان نہ چڑھا سکے۔۔۔اہل وعیال کو تنگدست چھوڑ گئے۔۔۔ بے چارے یہ ہوئے بے چارے وہ ہوئے وغیرہ وغیرہ۔

اگرچہ یہ ہمدرد لوگ اپنی گفتگو کو ان کی شہادت پر منتج کرتے تھے تاہم ان کے چہرے پر طاری اداسی اور لہجے کی مایوسی یہ ظاہر کرتی تھی کہ ان کے خیال میں ایک بے مقصد اور بے سود کام ہو گیا اور ایک قیمتی جان ضائع چلی گئی ہے۔

ان حضرات کے مقابلے میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنھیں ڈاکٹر صاحب کی جدائی کا غم نڈھال کیے جا رہا تھا مگر وہ آپؒ کی شہادت پر رشک کر رہے تھے کہ ان کا ایک ساتھی خدا کے بہت قریب چلا گیا ہے اور اس نے اپنی منزل پالی ہے۔

چونکہ ہمارے معاشرہ بالخصوص پاکستان میں ''شہید'' کی منزلت کا ادراک کم ہے اوشہادتوں کا رواج نہ ہونے کے برابر ہے اس لئے لوگ ''شہید'' کے لفظ سے جی کو تو مطمئن

کر لیتے ہیں جبکہ اس کے برعکس وہ شہید کی موت پر بے حد افسردہ اور مایوس ہوتے ہیں۔

فروری ۱۹۷۹ میں ہمارے پڑوسی اور اسلامی ملک ایران میں اسلامی انقلاب کا جو سرخرو سورج طلوع ہوا اس کی سرخی ہزاروں شہدا کی مرہون منت تھی۔ایران کے عوام کے جذبہ شہادت کا واقعہ ایک دوست نے نقل کیا کہ جب عراق کی جارحیت کے خلاف ایرانی نوجوان محاذ کی طرف رواں دواں تھے اس وقت ہر نوجوان کی کوشش تھی کہ اسے کسی لشکر میں شامل ہونے کی اجازت مل جائے۔وہ فرماتے ہیں کہ ہم پاکستانی دوست حضرت امام رضا علیہ السلام کے روضہ کے قریب بیٹھے تھے کہ ایرانی نوجوانوں کا ایک گروہ دوڑتا ہوا آیا اور ہجوم کا سینہ چیر کر امامؑ کی مرقد سے لپٹ کر ''شہادت'' کی دعائیں مانگنے لگا۔یہ نوجوان لشکر امام مہدیؑ کے سپاہی تھے جو جذبہ شہادت سے سرشار محاذ جنگ کی جانب جھومتے جا رہے تھے۔

جب یہ لشکر دعا و مناجات کے بعد روضہ امامؑ سے رخصت ہونے لگا تو لوگوں نے قطاروں میں کھڑے ہو کر ان پر بے پناہ گل پاشی کی۔۔۔ان پر عطر کے چھڑکاؤ کیے۔۔۔ان کے راستے میں دنبے ذبح کیے اور ان کے لئے فتح اور شہادت کی دعا کی۔

جب یہ کاروان اسٹیشن پر پہنچا تو ان کو رخصت کرنے کے لئے دور دراز کے رشتہ دار آئے ہوئے تھے۔لگتا تھا کہ محاذ پر جانے والوں نے اپنے تمام عزیز و اقارب کو چند روز پہلے مطلع کیا تھا اس لئے ان کے رشتہ دار ان کے لئے سرخ پھولوں کے ہار اور تحائف لائے تھے۔کسی چہرے پر نام تک کی اداسی کا گمان نہ تھا۔۔۔مجاہدین اور لواحقین کے چہرے سرخ پھولوں کے درمیان چاند کی چاندنی کی طرح چمک رہے تھے۔

دوست نے مزید بتایا کہ چونکہ ہمارا مزاج پاکستانی تھا اس لئے یہ منظر دیکھ کر ہماری آنکھیں چھلک پڑیں اور ہم مجاہدین کے لواحقین کے ایسے جھرمٹ میں چلے گئے جہاں دو چار خواتین اور ایک معذور ضعیف شخص کھڑے تھے۔ہم نے ماجرا پوچھا تو معذور ضعیف گویا ہوئے کہ ''آج لشکر امام مہدی علیہ السلام کی روانگی ہے ہمارے گھرانے کی خوش قسمتی ہے کہ آج ہمارے آخری بیٹے کو اس لشکر میں شامل ہونے کا موقع نصیب ہوا ہے۔اس سے پہلے میرے دو بڑے

بیٹے محاذ پر شہید ہو چکے ہیں جبکہ ایک محاذ پر میری ٹانگ بھی کٹ چکی ہے'' ضعیف عمر اور بظاہر بے سہارا والد بار بار دعا کے لئے ہاتھ اٹھا رہا تھا۔۔۔اسی طرح اس کی ضعیف والدہ اپنا دامن پھیلا کر خدا سے دعا مانگتی تھی کہ ''اے خدا بصدقہ امام مہدیؑ و بصدقہ زہرا سلام اللہ علیہا ہمیں اس کربلا میں سرخرو فرمانا۔''

شہید پرور والدین کے چہرے پر موبرابر ملال نہ تھا بلکہ معذور والد بار بار اپنی بدقسمتی کا تذکرہ بھی کرتا تھا کہ وہ محاذ پر شہید نہیں ہوسکا اور یوں وہ قربت خداوندی کے حصول میں ناکام رہا ہے۔

پاکستانی دوست وہاں کے شہدا کے گھروں تک بھی پہنچے تا کہ شہدا کی آمد پر لواحقین کا رویہ جانچ سکیں۔ان کا کہنا ہے کہ جب گھر والوں کو شہید فاؤنڈیشن یا دیگر اداروں سے شہید کی خبر موصول ہوتی تو تمام گھر والے نماز شکرانہ ادا کرتے اور پھر شہید کے استقبال کے لئے اپنے گھر کی گلیاں سجانے لگتے۔ دور دور تک بجلی کے قمقمے لگاتے۔۔۔ پھولوں کی ٹوکریاں لٹکاتے۔۔۔ استقبالی ترانے گاتے۔۔۔خوش آمدید کے بینرز آویزاں کرتے اور امام خمینیؒ کی تصویر گھروں کے دروازوں پر سجا دیتے۔

محلہ داروں کی یہ صورتحال تھی کہ وہ شہید کے والدین سے گلے ملتے درود پڑھتے اور خوشی سے ان کی پیشانی کو بوسہ دے کر مبارک دیتے جب کہ شہید کے لواحقین شہید پرور گھرانے کا اعزاز ملنے پر بے حد نازاں ہوتے۔

یہ حقیقت جان کر ہمیں تجسس ہوتا ہے کہ ہاں یہ سب کچھ کس لئے تھا تو اس ضمن میں واضح رہے کہ ایران کے عوام اسلام کی بقاء کے نظریہ سے بڑے واضح تھے اور وہ قرآن مجید، احادیث اور فرمودات آئمہ طاہرینؑ کی روشنی میں شہادت کا ادراک رکھتے تھے۔ وہ اس حقیقت سے بھی آگاہ تھے کہ ''شہید کا براہ راست خدا سے تعلق ہوتا ہے اور اس کے خون کی وجہ سے اس کے لواحقین تک بخشے جاتے ہیں۔

وہ اس بات کا شعور رکھتے تھے کہ خدا کی راہ میں جہاد اس کے دین کی ترویج اور بقا اور وطن کی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہوئے مارے جانے یا مرجانے کا نام ''شہادت'' ہے۔

قرآن مجید کی سورۃ آل عمران کی آیت ۱۵۷ میں ارشاد باری ہے کہ ''اگر تم خدا کی راہ میں مارے جاؤ تو ان لوگوں سے بدرجہا بہتر ہو جو دنیا میں مال ومتاع جمع کرتے ہیں۔''

''شہادت'' بلاشبہ موت کی قسم ہے جس سے انسان اسی دنیا سے ناطہ توڑ کر ہمیشہ کے لئے چلا جاتا ہے۔مگر ''عام موت'' سے مختلف بھی ہے کہ شہید سفر کے اگلے مرحلہ میں داخل ہو جاتا ہے یہاں وہ زندہ لوگوں کی طرح اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔۔۔خدا سے اس کا براہ راست رشتہ ہوتا ہے اور اسے خدا سے روزی ملتی ہے البتہ اس کے لئے شعور بہت ضروری ہے۔

صدر اسلام میں جب لوگ رسول خداؐ کے ساتھ جہاد کی طرف جاتے اور شہید ہو جاتے تو ان کے عزیز واقارب (کفار)، طرح طرح کی باتیں بناتے قرآن مجید فرماتا ہے ''اے رسول'' جن لوگوں نے خدا کی راہ میں قربانیاں دیں ان کے بھائی کہتے ہیں کہ اگر یہ ہمارا کہا مانتے تو قتل نہ ہوتے۔۔۔ان سے کہہ دو کہ اگر تم سچے ہو تو پھر اپنے اوپر سے موت کو ٹال دینا۔۔۔جو لوگ خدا کی راہ میں مارے گئے انھیں مردہ نہ سمجھنا وہ زندہ ہیں اور خدا سے روزی پاتے ہیں۔۔۔جو کچھ خدا نے انھیں انعام (شہادت) عطا کیا ہے وہ اس پر بے حد خوش ہیں (سورۃ آل عمران ۱۷۰۔۱۶۷)

> ''شہادت'' خدا کا ایک منفرد انعام ہے جو خدا کے محبوب لوگوں کو عطا ہوتا ہے جن کے بارے میں خدا خود فرماتا ہے کہ'' خدا مومنوں کا اجر ضائع نہیں کرتا'' (سورۃ آل عمران ۱۷۰)

قرآن مجید کی روشنی میں جب واضح ہوتا ہے کہ ''شہادت'' خدا کا انعام ہے اور ہمیشہ انعام اسے دیا جاتا ہے جس کی کارکردگی بہتر ہو اور انعام دینے والا اس سے راضی ہو۔۔۔شاید یہی وجہ تھی کہ امام اول حضرت علی علیہ السلام نے بوقت ضربت بلند آواز میں یقین سے فرمایا ''فزت برب الکعبہ'' (رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا۔) حالانکہ آپؑ نے بڑے بڑے معرکے سر کئے۔ جنگ خندق میں عمر بن عبدود پر آپؑ کی ضرب ثقلین کی عبادت سے افضل ٹھہری۔۔۔آپؑ

کے گھرانہ پر درود نازل ہوا مگر آپؐ نے کہیں بھی اپنی کامیابی کا نعرہ بلند نہ کیا مگر جیسے ہی شہادت کا انعام حاصل ہوا ''فزت برب الکعبہ'' کا نعرہ بے اختیار لبوں سے چھلک گیا۔

شہید کا رتبہ:

حدیث نبوی ہے کہ ''شہید'' کی سات صفات ہیں اس کی پہلی صفت یہ ہے (۱) جب اس کے خون کا پہلا قطرہ زمین پر گرتا ہے خدا اس کے بدلے اس کے تمام گناہ معاف کر دیتا ہے۔ (۲) شہید کا سر زمین پر نہیں لگتا بلکہ وہ حوروں کی گود میں گرتا ہے۔ (۳) اسے فوراً جنت کی پوشاک پہنا دی جاتی ہے۔ (۴) اسے جنت میں مخصوص (رہائش گاہ) دکھا دی جاتی ہے۔ (۵) اس کی نظروں کے سامنے جنت کے تمام پھول لائے جاتے ہیں جنھیں وہ پسند کرتا ہے اس کی رہائش گاہ پر لا دیئے جاتے ہیں۔ (۶) اس کی روح کو جنت میں گھومنے پھرنے کی عام اجازت ہوتی ہے۔ (۷) شہید کا خدا سے براہ راست تعلق ہوتا ہے۔

فرمان معصومؑ ہے کہ شہید پر جب تلوار، تیر یا خنجر چلتا ہے تو اس کے گرد خدا کے نور کی چادر پھیل جاتی ہے اور اس نور میں اس قدر مخمور ہو جاتا ہے کہ اسے اپنے جسم کے کٹنے کا احساس تک نہیں ہوتا۔

اس کی بہترین مثال حضرت یوسف علیہ السلام کے نور کا واقعہ ہے کہ ان کے نور میں مدہوش ہو کر خواتین اپنی انگلیاں کاٹ بیٹھی تھیں مگر انھیں احساس تک نہ ہوا تھا۔

ذیل میں شہید مرتضیٰ مطہری کے ''فلسفہ شہادت'' سے اقتباسات پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں کیونکہ ان سے بہتر کوئی شخص اس موضوع پر بحث نہیں کر سکتا۔

شہید کی خدا سے قربت:

فرمان معصومؑ ہے ''شہید کی روح کو فرشتے جنت کے پہلے مرحلہ میں لے جاتے ہیں تو اسے قرار نہیں آتا۔۔۔ پھر فرشتے اسے دوسرے مرحلہ میں لے جاتے ہیں وہاں بھی اس کی روح بے قرار رہتی ہے یہاں تک کہ جنت کے آخری درجہ میں بھی روح کو تسکین نہیں پہنچتی۔۔۔ آخر کار

فرشتے اسے جنت کے مدارج کے خاتمہ کے بعد اس سے آگے ''لقاء اللہ'' (خدا سے ملاقات کا دائرہ) میں لے جاتے ہیں جہاں اس کی بے قراری کو قرار آجاتا ہے۔ شہید مطہری فرماتے ہیں'' چونکہ شہید نے جنت کے لئے جان نہیں دی ہوتی بلکہ خدا کے لئے جان قربان کی ہوتی ہے اس لئے اسے جنت میں نہیں بلکہ ''لقاء اللہ'' میں قرار نصیب ہوتا ہے۔

شہید کا تقدس:

کسی شخص کا محض قتل ہونا تقدس کی بنیاد نہیں بن سکتا بلکہ بعض اوقات موت افتخار کے بجائے ذلت کا موجب بن جاتی ہے۔ جیسے خودکشی یا جرم کے نتیجہ کی سزا ہے مگر شہید اس لئے مقدس ہوتا ہے کہ وہ مقدس مقصد کے حصول کی خاطر یا قرآنی الفاظ میں ''فی سبیل اللہ'' اپنی جان داؤ پر لگا لیتا ہے۔

شہید کے تقدس کے دو پہلو ہوتے ہیں اول یہ کہ وہ اللہ کی راہ میں جان قربان کرتا ہے دوم یہ کہ اس کی قربانی پورے شعور کے ساتھ برضا و رغبت ہوتی ہے۔

شہید بحیثیت فاتح:

فتح ایک بہت بڑا انعام، سرخروی اور اعزاز ہے۔ محض کسی ریاست یا مال و زر کو فتح کرنا اعزاز نہیں بلکہ حقیقی فتح نظریہ کی کامیابی ہوتی ہے۔ فاتح اس لئے فاتح ہوتا ہے کہ دشمن اس کے نظریات کے مقابلہ کا حوصلہ نہیں رکھتا اور پھر اس کے نظریات کی فتح کو گوارہ بھی نہیں کرتا جس کے باعث وہ اسے قتل کرتا ہے۔ مگر شہید کا خون اس کی زندگی سے زیادہ طاقتور بن کر ابھرتا ہے اور ہر شخص قاتل کو مجرم، سفاک اور درندہ سمجھتا ہے۔ مقتول کی شہادت قابل تحسین عمل بن جاتی ہے جو اسے فاتح بنا دیتی ہے۔ اس کی بہترین مثال حضرت امام حسین علیہ السلام کی قربانی اور شہادت ہے کہ چودہ سو سال گزرنے کے باوجود بھی حسینؑ زندہ باد اور یزید مردہ باد ہے۔

شہید کا اعزاز:

شہید کو یہ اعزاز حاصل ہوتا ہے کہ قبر میں اس کی آزمائش نہیں ہوتی یعنی اسے قبر و برزخ کے سوال و جواب کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ حدیث نبویؐ ہے کہ ''شہید کے سر پر تلوار کی چمک سے اس کی آزمائش ہو چکی ہوتی ہے اور وہ پہلے ہی سوالوں کا جواب دے چکا ہوتا ہے۔''

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شہید عملی طور پر اپنے ایمان کی صداقت ثابت کر چکا ہوتا ہے اس لئے عالم برزخ میں اس سے مزید سوال پوچھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

علاوہ ازیں شہادت ایک ایسا اعزاز ہے کہ اسلام میں جب کسی قابل تعریف مرتبے یا فعل کو سراہا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ فلاں شخص کو شہید کا رتبہ حاصل ہے یا کہ فلاں فعل اس قابل ہے کہ اسے شہادت کا اجر دیا جائے۔ مثال کے طور پر ایک طالب علم حق کی تلاش میں نکلتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ اگر وہ اسی دوران میں مر گیا تو ''شہید'' کی موت مرے گا یا حدیث میں ہے کہ ''جو شخص محمدؐ و آل محمدؐ کی محبت پر فوت ہوا ہو وہ ''شہید'' مرا۔ ایک جگہ ارشاد نبویؐ ہے کہ جو شخص اپنا اور اپنے اہل خاندان کا پیٹ پالنے کے لئے محنت کرتا ہے اور زحمات اٹھاتا ہے تو وہ ایک ایسے شخص کی مانند ہے جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہے۔

شہید کے لفظ کے گرد تقدس کا جو ہالہ بنا ہوا ہے وہ کسی اور لفظ کے گرد نہیں ملتا۔ یعنی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک ہیرو سے بڑھ کر ایک ہیرو ہے مگر شہید لفظ کا کوئی نعم البدل نہیں۔

حضرت علی علیہ السلام کا قول ہے کہ ''اللہ تعالیٰ قیامت کے روز شہدا کو اس شان و شوکت اور عظمت و نورانیت کے ساتھ سامنے لائے گا کہ انبیاء کرام اگر سوار ہوں تو ان کی تعظیم کی خاطر اپنی سواریوں سے نیچے اتر پڑیں گے''

شہید کا خون:

حدیث پاک میں ہے کہ ''اللہ کسی قطرے کو اتنا پسند نہیں کرتا جتنا کہ اس خون کے قطرہ کو جو اس کی راہ میں بہتا ہے۔''

شہید کا خون کبھی رائیگاں نہیں جاتا بلکہ اس کے خون کے قطرے دریا کا روپ دھار کر قوم

کے ابدان میں منتقل ہو جاتے ہیں گویا ''شہادت'' ایک معاشرے کے بدن میں خون کا انتقال ہے اس لئے کہا جاتا ہے کہ ؎

شہید کی جو موت ہے
وہ قوم کی حیات ہے

شہید کا خون اس قدر خدا کو پسند ہے کہ اس کے بارے میں احکامات ہیں کہ ''شہید'' کو بغیر غسل و کفن دفنا دیا جائے کیونکہ شہید کا بدن ''متروح'' ہوتا ہے یعنی اس پر روح کے احکام جاری ہوتے ہیں۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جب کوئی کھلاڑی یا ہیرو اپنا انعام وصول کرتا ہے تو اپنے لباس میں ہوتا ہے جو اس کی پہچان ہوتا ہے لہٰذا ''شہید'' بھی خدا سے جب ملاقات کرتا ہے تو وہ سرخرو چہرے اور رنگین لباس کے ساتھ حاضر ہوتا ہے۔

شہید کی ولولہ انگیزی:

''شہید'' کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قوم میں ہمت اور ولولہ پیدا کرتا ہے۔ جن قوموں میں جوش بالخصوص الٰہی جذبہ کی روح مرجاتی ''شہید'' ان کے اندر دوبارہ دلاوری، صبر، ہمت اور جوش پیدا کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ اسلام کو ہمیشہ شہدا کی ضرورت رہی ہے۔ مشہور فلسفی اور مورخ ویل ڈیورینٹ (WILL DURANT) اپنی کتاب ''تاریخ تمدن'' میں رقمطراز ہے کہ ''اپنی قوم کو زندہ رکھنے اور انھیں طاقت بخشنے کے لئے جتنا زور اسلام نے اپنے پیروؤں پر دیا ہے اتنا کسی اور مذہب نے نہیں دیا۔''

شہید کا جاودانی ہونا:

جس طرح ایک عالم اپنے علم، موجد اپنی ایجاد، شاعر اپنے اشعار اور معلم اپنے اخلاق کی بدولت معاشرے میں پیوست ہو جاتا ہے اور ان کی انفرادیت انھیں زندہ و جاوید بنا دیتی ہے

اوروہ سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا رہتا ہے۔ اسی طرح ''شہید'' بھی اپنے خون کے ذریعہ معاشرہ میں لافانی زندگی حاصل کرتا ہے اوروہ معاشرہ میں ہمیشہ باقی رہنے والا خون پیدا کرتا ہے۔

مذکورہ بالا قسم کے لوگ دراصل اپنے اثاثہ کے ایک حصہ کو جاودانی بناتے ہیں جبکہ شہید اپنے پورے اثاثہ کو لافانی بنا دیتا ہے اس لئے رسول پاکؐ کا فرمان ہے کہ ''ہر نیکوکار سے بڑھ کر ایک اور نیکوکار ہے مگر شہید سے بڑھ کر کوئی اور نیکوکار نہیں۔''

شہید کی شفاعت:

ایک حدیث کے مطابق تین اقسام کے لوگ یعنی انبیاء کرامؑ علما اور شہداء قیامت کے روز اللہ تعالیٰ سے دوسروں کی شفاعت کریں گے (علما سے مراد علما ربانی ہیں جن میں سب سے پہلے آئمہ اطہارؑ شامل ہیں اور پھر وہ علما جو ان کی پیروی کرتے ہیں)

شہدا کو لوگوں کی شفاعت کا حق اس لئے حاصل ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی مظلوموں، محروموں اور بے کسوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے قربان کی اور ہمیشہ ان کی مدد پر کمر بستہ رہے اس لئے انھیں اگلی دنیا میں لوگوں کی شفاعت کی اجازت دی جائے گی۔

جیسا کہ حدیث نبویؐ میں ہے کہ خداوند کریم شہید کے پہلے خون کے قطرے کے گرنے پر اس کے تمام گناہ معاف کرتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شہید کا باقی خون نسلوں کی بخشش کا باعث بنتا ہے۔

شہید کا ماتم:

صدر اسلام میں جو لوگ رسول پاکؐ کے دور میں شہید ہوئے ان میں آنحضرتؐ کے چچا حضرت حمزہ بن عبدالمطلب کا نام سرفہرست ہے۔ انھوں نے جنگ احد میں شہادت پائی اور ''سید الشہدا'' کا لقب پایا۔

جب حضرت حمزہ نے مکہ سے مدینہ ہجرت کی تو اس وقت تنہا تھے اور کوئی شخص ان کے

ساتھ ان کے گھر میں نہیں تھا۔ جب رسول اکرمؐ احد سے واپس مدینہ تشریف لائے تو دیکھا کہ حضرت حمزہؓ کے گھر کے سوا تمام شہداء کے گھروں میں گریہ وماتم ہو رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر آپؐ نے حسرت بھرا جملہ ادا فرمایا:

''امام حمزة فلابواکر له''

''کیا حمزہ کو رونے والا کوئی نہیں ہے۔''

صحابہ کرام یہ جملہ سن کر اپنے گھروں کو گئے اور اپنے بچوں اور عورتوں کو حضرت حمزہؓ کے گھر لے آئے اور انھوں نے رسول پاکؐ کی خواہش کا احترام کر کے آپؐ کے چچا پر ماتم کیا۔ اس کے بعد یہ رسم بن گئی جو گھرانہ بھی اپنے شہید کا گریہ وماتم کرنا چاہتا وہ پہلے سید الشہداء حضرت حمزہؓ کے گھر جا کر ان کا ماتم کرتا۔

امام حسین علیہ السلام کی قربانی کے بعد جب یہ ثابت ہو گیا کہ امامؑ کی قربانی ''لا الہ الا اللہ'' کی بنا ٹھہری ہے اور اس خون سے خدا کا دین محفوظ ہو گیا تو پھر ''سید الشہدا'' کا لقب حضرت امام حسین علیہ السلام کو حاصل ہو گیا اور سید الشہدا کے ماتم وگریہ کو ابھی تک وہی حیثیت حاصل ہے۔

شہداء پرور قومیں کربلا کی یاد کو نہ صرف زندہ رکھے ہوئے ہیں بلکہ ان کی عطا کردہ راہ پر جان وارنے کو اپنا افتخار سمجھتی ہیں۔

☆☆☆☆☆

وصیت نامہ

ڈاکٹر محمد علی نقوی

بسم رب الشہداء

موت کی جانب سفر تیزی سے ہو رہا ہے کئی ایک ایسے مواقع دیکھنے میں نصیب ہوئے ہیں جو انسان کے لئے عبرت کا کام دیتے ہیں۔ مگر افسوس کہ وہ سبق حاصل نہ کر سکا جو دوسروں کو کہتا رہا ۔ بالآخر وہ وقت آن پہنچا۔ کاش موت سے نہ بھاگے ہوتے، کاش لشکر خمینیؒ میں شمولیت اختیار کی ہوتی تو شاید ان پاک و پاکیزہ نوجوانوں کے صدقے ہم بھی بخشش کا کوئی سامان لے جاتے۔ بہر حال یہ سب باتیں اب رہ گئیں اور ہم ایک لمبے سفر پر روانہ ہو گئے۔ التماس دعا میں وصیت کرتا ہوں۔

مجھے اپنے آبائی قبرستان علی رضا آباد میں دفن کیا جائے۔ جنازہ میں تاخیر نہ کی جائے۔ پوسٹ مارٹم نہ کروایا جائے اور اس موقع پر کسی قسم کا تنظیمی اجتماع نہ کیا جائے۔

میری ملکیت ظاہری میں اگر کوئی شخص یا تنظیم دعویدار ہو تو اسے ضرور پہلے اس کا حق دیا جائے۔

آخری گزارش! خوش بختی ہے ان لوگوں کی جو باصلاحیت اور باشعور لوگوں کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں اور ہلاکت ہے ان کے لئے جو اپنے سے کمتر کے ماحول میں پروان چڑھتے ہیں۔ اپنی اہلیہ محترمہ کا شکر گزار اور بچوں سے پر امید۔ تمام دوستوں سے ان کی توقعات پر پورا نہ اترنے کی وجہ سے شرمسار ہوں۔

والسلام

محمد علی نقوی، یکم اپریل ۱۹۹۲ء

ابدی حیات کی خوشبو

فرمان خداوندی ہے کہ ''شہید'' زندہ ہوتا ہے وہ اپنے رب سے روزی پاتا ہے اور اس کی روح آزاد ہوتی ہے مگر اس کے لئے شعور بہت ضروری ہے۔ ذیل میں چند واقعات نقل کیے جا رہے ہیں جس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ''شہید'' کی ابدی حیات کیسی ہوتی ہے۔

سفیر انقلاب ۷ مارچ ۱۹۹۵ کو شہید ہوئے تو ان کے چند اہم ترین امور تشنہ رہ گئے اور بعض قومی معاملات اس قدر مخفی تھے کہ آپ کی ذات کے علاوہ کسی اور کو خبر تک نہ تھی۔ ایسے میں شہید ڈاکٹر نقوی اپنے معتمد رفقاء سے خوابوں میں ملے اور ان پر تمام صورتحال آشکار کر دی۔ مثال کے طور پر کچھ مخیر حضرات نے قومی امور کی تکمیل کے لئے کثیر مالی تعاون کرنا تھا تو ڈاکٹر صاحب نے احباب کو تمام افراد اور اعداد و شمار تک سمجھائے اور اس طرح سے آپ کے تشنہ امور رواں ہوئے۔

☆☆☆☆☆

آخری چند سالوں سے آپ کا معمول تھا کہ آپ رائے ونڈ کے تبلیغی اجتماع میں شرکت کرتے تھے۔ اسی دوران میں آپ کی آشنائی سیکرٹریٹ میں کام کرنے والے ایک تبلیغی سے ہو گئی۔ جو راسخ العقیدہ مسلمان ہیں۔ یہی تبلیغی صاحب آپ کی شہادت کے دو ماہ بعد حج بیت اللہ ادا کرنے گئے واپس لوٹے تو انھوں نے ڈاکٹر صاحب کے ایک ساتھی سے تذکرہ کیا کہ انھوں نے

ڈاکٹر صاحب کو حج ادا کرتے دیکھا ہے۔بعض احباب نے استفسار کیا کہ کہیں شکل کا مغالطہ تو نہیں ہوا،تو کہنے لگے کہ ایسا قطعاً نہیں ہوسکتا۔ڈاکٹر صاحب اپنے معمول کے لباس پینٹ،شرٹ میں ملبوس تھے اور اس سے دس پندرہ قدم آگے مناسک (خانہ کعبہ کا طواف) ادا کرتے رہے اور تھوڑی دیر بعد غائب ہوگئے۔

☆☆☆☆☆

آپ کی شہادت کے ایک ماہ بعد موسمی بارشیں ہوئیں تو آپ کی مرقد مبارک کے سرہانے چند گز کے فاصلے پر زمین میں سوراخ ہوا جس سے پانی داخل ہوکر آپ کے جسد تک جا پہنچا۔آپ نے اپنے ایک عزیز کو خواب میں بتایا کہ ''پانی میری آرام گاہ میں داخل ہو چکا ہے،آپ اس کا راستہ بند کریں۔'' انھوں نے تساہل کیا تو دوسری شب آپ نے پھر بشارت دی،قدرے ناراض ہوئے اور ساتھ ہی پانی کے داخلہ کی جگہ بھی مشخص کردی۔جب آپ کے عزیز آپ کے مزار پر پہنچے تو اس جگہ سے پانی آہستہ آہستہ زمین میں داخل ہو رہا تھا۔جس کی آپ نے نشاندہی کی تھی۔

☆☆☆☆☆

آپ کے چھوٹے فرزند شدید بیمار ہوئے تو آپ کے گھر والے سخت پریشان ہوئے۔ایسے میں ڈاکٹر صاحب اپنے گھر والوں سے ملے اور انھیں تمام ادویات اور طریقہ کار تفصیلاً بتایا۔دوسری صبح آپ کی بتائی ہوئی ادویات لے کر علاج کیا گیا تو ننھے موسیٰ رضا رو بہ صحت ہوگئے۔

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر صاحب سے مربوط ،قومی امور میں انتہائی معاون ایک شخصیت علیل ہوئیں تو آپ نے اپنے ایک قریبی رفیق سے خواب میں ملاقات کی اور انھیں بیمار قومی شخصیت کی عیادت کی تاکید کی۔جب آپ کے رفیق اس شخصیت کے گھر پہنچے تو انھیں بستر علالت پر پایا اور وہ بار بار ڈاکٹر صاحب کو یاد کررہے تھے۔

☆☆☆☆☆

آپ کی دختر نیک اختر قم یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہیں۔آپ کی شہادت کے بعد انھیں چنداں

مرتبہ رہنمائی کی ضرورت پڑی تو آپ نے اسی طرح سے انھیں گائیڈ کیا جیسے زندگی میں کرتے تھے۔

☆☆☆☆☆

لاہور میں ایک ضعیف سیدہ دل کے مرض میں عرصہ سے مبتلا ہیں جو ہر ہفتہ یا عشرہ میں ڈاکٹر صاحب سے چیک اپ کراتی تھیں اور آپ کی دواؤں کے مسلسل استعمال سے انھیں افاقہ تھا۔آپ کی شہادت کے بعد انھیں دل کا عارضہ ہوا تو انھوں نے آپ کو یاد کیا۔آپ انھیں خواب میں ملے۔ایک لیڈی ڈاکٹر کا نام لے کر انھیں ان سے دوائی لینے کی درخواست کی اور ساتھ دعا فرمائی کہ آئندہ انھیں یہ مرض نہیں ہوگا۔انھوں نے مبینہ ڈاکٹر صاحبہ سے رابطہ کیا۔دوائی لی تو نہ صرف تندرست ہوگئیں بلکہ گذشتہ ایک سال سے انھیں پھر کبھی تکلیف نہیں ہوئی۔

☆☆☆☆☆

ایک گزارش۔۔۔۔۔ایک اپیل

قارئین! زندگی ایک فانی شے ہے اوراس کا سفر پانی کے سینے پر تیرنے والے بلبلے کی طرح ہے جسے ہر حال میں فنا ہونا ہے۔قرآن مجید کی سورۃ آل عمران کی آیت ۱۴۵ میں ارشاد رب العزت ہے کہ کسی شخص میں طاقت نہیں کہ وہ خدا کے حکم کے بغیر مرجائے اس نے موت کا وقت مقرر کر رکھا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام کا فرمان ہے کہ ''اگر اللہ نے موت کا وقت مقرر نہ کیا ہوتا تو لوگوں کی روحیں ثواب کے شوق اور سزا کے خوف کی بنا پر ایک لحظہ کے لئے بھی ان کے ابدان میں نہ رہتیں۔''

یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ ہر جسم نے موت کا مزہ چکھنا ہے اوراسی فرمان خداوندی کی روشنی میں حضرت امام حسین علیہ السلام نے فرمایا تھا ''جب جسم فنا ہونے کے لئے ہی ہے تو پھر راہ خدا میں فنا ہونا ہی بہترین عمل ہے۔''

جب موت کا تقرر اور زندگی کا فنا ہونا لاریب ہے تو پھر انسان کو چاہیے کہ وہ سورۃ جمعہ کی آیت ۶ کا مصداق بنے کہ ''موت کی تمنا کرو تا کہ تم اپنے دعویٰ میں سچے ثابت ہوسکو'' البتہ کوشش کرنی چاہیے کہ عارضی زندگی سعادت کے طور پر بسر ہو اور ابدی سفر شہادت کے دوش پر طے ہو کیونکہ شہادت خدا کا بہت بڑا انعام ہے۔

حضرت امام حسین علیہ السلام نے فرمایا کہ ''میرے جد بزرگوار نے مجھ سے فرمایا کہ تمھیں بارگاہ خداوندی میں ایک عظیم رتبہ ملنے والا ہے لیکن وہ رتبہ شہادت کے بغیر ممکن نہیں۔''

حضرت علی علیہ السلام جب مسجد کوفہ میں عبدالرحمن ابن ملجم کی تلوار سے زخمی ہوئے اور گھر لائے گئے تو آپؑ نے فرمایا ''خدا کی قسم کوئی غیر متوقع یا ناپسندیدہ بات نہیں ہوئی بلکہ وہی ہوا ہے جس کی مجھے ایک عرصہ سے خواہش تھی اور جس کے لئے میں خدا سے دعائیں مانگا کرتا تھا۔ میں نے شہادت کا سفر اختیار کیا ہے جس کا مجھے بے حد اشتیاق تھا۔ میری مثال اس شخص کی ہے جو اندھیری رات میں پانی کی تلاش میں ہو اور اچانک اسے کنواں یا چشمہ مل جائے۔۔۔۔ میں اس شخص کی مانند ہوں جو کوئی چیز پانے کی سر توڑ کوشش کرتا ہے اور اسے پالے۔''

بھائیو، بہنوں اور بزرگو! شہید مظلوم حضرت علامہ سید عارف حسین الحسینیؒ نے فرمایا تھا کہ ''شہادت ہماری میراث ہے جو ہماری ماؤں نے ہمیں اپنے دودھ میں بخشی ہے'' لہٰذا ہماری میراث ہمیں تک منتقل ہونی چاہیے اوراس کا سفر جاری رہنا چاہیے۔ ہمارے لبوں پر رمضان المبارک میں پڑھی جانے والی دعاؤں کا یہ ورد رواں رہنا چاہیے۔ **''اللھم برحمتک فی الصالحین فادخلنا و فی علیین فارفعنا و قتلا فی سبیلک مع ولیک فوفق لنا''**

''اے پروردگار! ہمیں توفیق دے کہ ہم تیری راہ میں اور تیرے ولی (امام) کے ہمراہ قتل ہوجائیں اور شہادت کی سعادت سے ہمکنار ہوں۔''

یاد رہے کہ دعا کے ساتھ حصول کے راستوں کا سفر بھی بے حد ضروری ہے لہٰذا اس سفر میں جہاں آپ اپنے لئے ''شہادت'' کی تمنا کریں وہاں مجھ ناچیز کے لئے بھی خدا سے دعاؤں کے ذریعہ اس کے انعام (شہادت) کی سفارش ضرور فرمائیں تا کہ ہم جلد از جلد امام زمانہ حضرت امام مہدی علیہ السلام کی محفل میں جا پہنچیں جہاں صدر اسلام کے شہدا سے لے کر ڈاکٹر محمد علی نقویؒ تک کے تمام شہداء اکٹھے ہیں اور خدا سے ملاقاتوں کی لذت حاصل کرتے ہیں۔

شہادت ہمارا افتخار ہے ہم حسینی ہیں اور ہمارا نظریہ ہے کہ ؎

جو حسینی بھی ہے اور موت سے بھی ڈرتا ہے
ہاں! وہ توہین حسینؑ ابن علیؑ کرتا ہے

تمام قارئین سے شہدا اسلام کی ارواح مقدسات کے لئے سورہ فاتحہ کی اپیل ہے۔